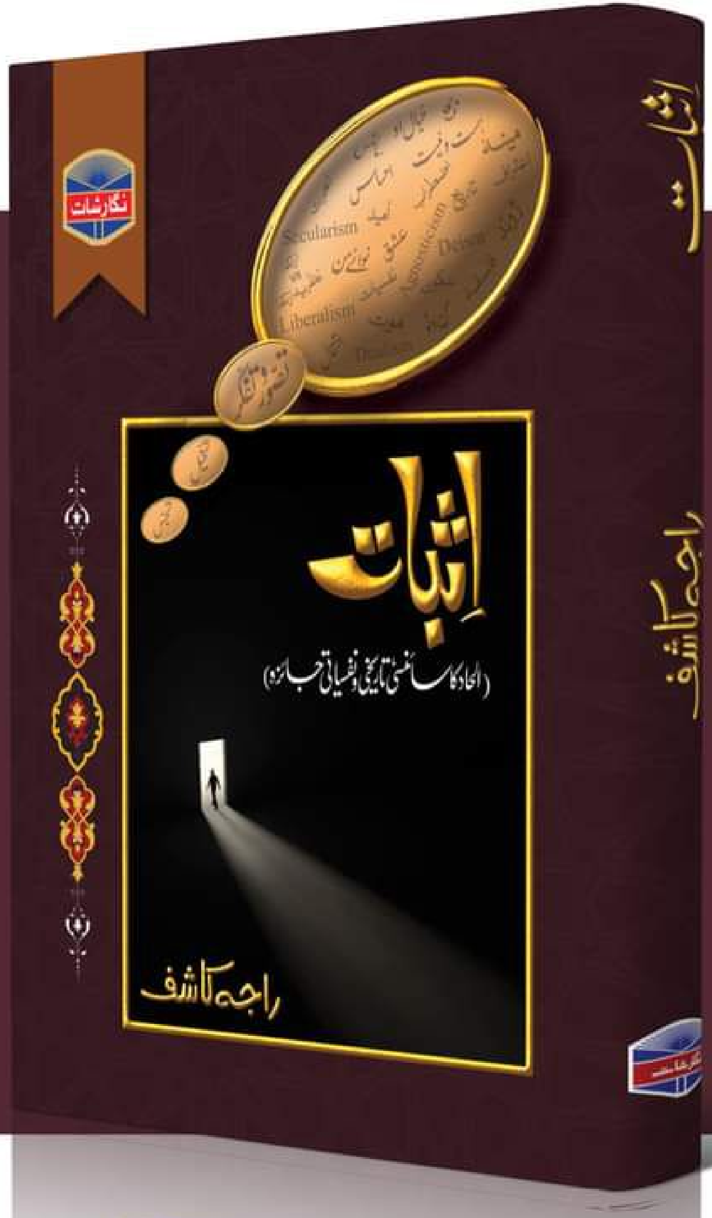

صوبہ خیبر پختونخواہ کے ضلع لکی مروت گاؤں مسلم باغ سے تعلق رکھنے والے، قلم و کتاب کی دُنیا کے باسی راجہ کاشف حیات آباد پشاور میں رہائش رکھتے ہیں اور بہت سے علمی اور ادبی مجالس میں دُر پاشی کرتے رہتے ہیں۔

راجہ کاشف بنیادی طور پر سِول انجینئر ہیں اور حال ہی میں نیشنل یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی (NUST) اسلام آباد سے سٹرکچرل انجینئرنگ میں ایم فل کی ڈگری حاصل کی ہے۔ اصلاً سائنس کے طالب علم ہیں لیکن مذہب، فلسفہ، ادب اور نفسیات کا گہرا ادراک رکھتے ہیں۔ وہ حق اور سچ کے ایک انتھک، سنجیدہ اور مخلص طالب علم ہیں، جیسا کہ ان کے ناول "اثبات" کے مطالعہ سے قارئین کو معلوم ہو جائیگا۔ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی حقیقت، علمی موضوع اور ادب پارے کی تلاش یا جانچ پرکھ میں غلطاں وکوشاں رہتے ہیں اور حتی الوسع ہر قسم کے مذہبی، لسانی، نسلی اور علمی تعصب اور تفاخر سے دامن کشاں رہتے ہیں۔ اس سے پہلے پشتو میں "احساس" کے نام سے اس کا شعری مجموعہ چھپ چکا ہے۔ "اثبات" اس کی طبع زاد نثری کاوش ہے۔

Order Now
0304-2224000

اِثبات

الحاد کا سائنسی، تاریخی اور نفسیاتی جائزہ

راجہ کاشف

نگارشات

All rights reserved. No part of this book may be reproduced in any form or by any means, electronic or mechanical, including photocopying, recording or by any information storage retrieval system, without prior permission of the publisher.

جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب : اثبات

مصنف : راجہ کاشف

ناشر : آصف جاوید(0321-9414442)

برائے :نگارشات پبلشرز،میاں چیمبر3-ٹمپل روڈ،لاہور

فون:92-42-36303438

پروف ریڈنگ : عبدالقاہر ناصر

کمپوزر : مراد علی(سرائے نورنگ)

ٹائٹل ڈیزائن : اظہر محمود

مطبع : حاجی منیر پرنٹر،لاہور

سال اشاعت : 2022ء

قیمت : 800 روپے

اِنتساب

1۔ ڈاکٹر محمد فاروق خان شہیدؒ

2۔ اے دَ چا عشقه نور دے خنکه ډاډګيرنه وکۀ
دَ زړۀ کتاب له انتساب مې ستا پۀ نوم کړے دے

فہرستِ ابواب

●	اِسلام اور الحاد	7
●	اس کتاب نے مجھے پھر سے جوان کیا	9
●	اِک نظر "اِثبات" پر	11
●	اثباتِ حق —— اِک سفر، اِک داستان	13
●	گفتارِ من	16
1	اِضطراب	17
2	مذہب بیزاری	20
3	مُحبتِ مخفی	23
4	مُبادلۂ افکار	26
5	لِبرل اِزم	31
6	اِظہارِ تشویش	37
7	ارسالِ اِرتسام	46
8	میرے غم۔۔۔۔میرا غم	54
9	نُدرتِ تخیّل	59

10	تجدید واحیائے تفکر	62
11	دَربارِ دُربار	72
12	اَدبیات	86
13	تعارف و تاریخِ الحاد	91
14	انتقال یا موت	108
15	سائنسی دلائل و نظریۂ تخلیق	116
16	نوائے مَن زِ تاثیرِ دمِ تُست	133
17	نظریۂ ارتقاء کا سائنسی و تاریخی رَدّ	140
18	بے مِثل خالق و عظیم مُدبّر	177
19	سائنسدانوں کے مشاہدات و تجزیات	195
20	دوستی و خیر اندیشی	215
21	انفَسی دلائل	225
22	تاریخی دلائل و حدِّ علم کا عقدہ	250
23	پیغمبرِ الٰہی و کلامِ الٰہی کی صداقت و قطعیت	272
24	اعتراف	285
25	حُسن و محبت	308
26	سر تسلیم خم و دُعا	315
27	وصالِ خویش کہ وصالِ اُو	318

اِسلام اور الحاد

دور جدید سے قبل دونقطہ ہائے نظر انسانیت کے غالب افکار تھے۔ ایک توحید جس میں خدائے واحد انسان کے فکر و عمل کا محور تھا۔ دوسرا شرک جس میں غیر اللہ کی ہستی انسانی محبتوں اور عقیدوں کا محورومرکز تھی۔ پوری انسانی تاریخ انہی دو غالب افکار کے بیچ میں گھومتی رہی تھی۔

دورِ جدید میں یہی حیثیت الحاد یا انکارِ خدا و مذہب نے اختیار کرلی ہے۔ مگر شرک کی طرح الحاد کا المیہ بھی یہی ہے کہ اس کے پاس پیش کرنے کے لیے کوئی اپنا کوئی مقدمہ ہے ہی نہیں۔ الحادی فکر کا آغاز کلیسائی جبر کے رد عمل کے طور پر ہوا تھا اور آج تک اس کی اصل طاقت اہل مذہب کی فکری اور عملی غلطیاں ہیں جنھیں دیکھ کر بہت سے لوگ الحاد کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ الحادی فکر کی اس کمزوری کا ادراک خود ملحدین کو بھی تھا کہ ان کے پاس اپنے نقطہ نظر کے حق میں پیش کرنے کے لیے کچھ نہیں۔ چنانچہ جب ڈارون کا نظریہ ارتقاء سامنے آیا تو انہیں لگا کہ ان کے دل کی مراد سامنے آگئی ہے۔ مگر نظریہ ارتقاء کو خدا کا نعم البدل سمجھنا اُس وقت بھی حماقت تھی اور آج بھی ہے۔ بالفرض اگر نظریہ ارتقاء کو کلی طور پر درست مان بھی لیا جائے تو اس کی حیثیت بس اتنی ہے کہ دیگر طبعی قوانین کی طرح جو یہ بتاتے ہیں کہ یہ کائنات کس طرح چل رہی ہے، نظریہ ارتقاء اس زمین پر زندگی کے وجود اور تنوع کی ایک ممکنہ توجیہہ پیش کرتا ہے۔نہ طبعی قوانین کی دریافت خدا کی ضرورت کو ختم کر سکے ہیں نہ نظریہ ارتقاء کبھی یہ کام کر سکتا ہے۔ اس لیے کہ ان قوانین کا ہونا یہ تقاضا کرتا ہے کہ بتایا جائے کہ یہ قوانین کس نے بنائے ہیں اور کون انہیں روبہ عمل کیے ہوئے ہے۔ہاں اطلاقی پہلوؤں سے نظریہ ارتقاء نے اہل مذہب کے بعض مقدمات کو

ختم کر دیا ہے، مگر یہ مقدمات زیادہ تر مسیحی علم الکلام اور معتقدات کے تصورات تھے ۔نظریہ ارتقاء قرآن مجید کے ایک بیان کو بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکا۔ الحاد کے برعکس اسلام کا مقدمہ بالکل محکم بنیادوں پر قائم ہے۔اس کی کئی اساسات میں سے ایک اساس یہ ہے کہ صرف خدا کی ہستی ہے جو اندھے بہرے مادے اور تباہ کائناتی طاقتوں کو زندگی کے لیے ساز گار اور مسخر کیے ہوئے ہے۔الحاد کے پاس اس حوالے سے خدا کا ایک ہی نعم البدل ہے کہ یہ سب کچھ بخت واتفاق کی کار فرمائی ہے۔ یہ بات اتنی احمقانہ اور زمین اور کائنات کی محدود عمر کے لحاظ سے اتنی غیر سائنسی ہے کہ کوئی معقول انسان اس کو کبھی قبول نہیں کر سکتا۔ نفرت اور رد عمل کی نفسیات میں مبتلا لوگ البتہ مذہب کے نام پر بھی بہت کچھ مانتے ہیں اور الحاد کے نام پر بھی مان لیتے ہیں۔ اس کا کوئی علاج نہیں ہو سکتا۔ مذہب کے نام پر ہمارے سماج میں پچھلے کئی عشروں سے جو انتہا پسندی، عدم برداشت اور دہشت گردی پھیلی ہوئی ہے، اس نے ایک رد عمل کو جنم دیا ہے۔ اسی عرصے میں انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے فروغ نے الحاد کی اس فکر کو بھی ہمارے نوجوانوں تک پہنچا دیا جسے سوویت یونین کے خاتمے اور مذہب کے نام پر برپا عالمی دہشت گردی کے بعد ایک نئی زندگی ملی تھی۔ ان دو چیزوں نے مل کر ہمارے ہاں منفی، سطحی اور مذہب بیزار لوگوں میں الحاد کو ایک مقبول نقطہ نظر بنا دیا ہے۔ اس حوالے سے اہل علم و دانش اور صاحبان قلم و بصیرت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ نوجوان نسل کی رہنمائی کریں اور مذہب کا مقدمہ ہر پہلو سے پیش کریں۔

راجہ کاشف صاحب کی پیش نظر تصنیف "اثبات" کے بارے میں میری رائے ہے کہ انہوں نے اس ذمہ داری کو اُٹھانے میں اپنا کردار ادا کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس کاوش کو قبول فرما کر اصلاح کا ذریعہ بنائے۔ آمین!

ابو یحییٰ

انذار ارگنائزیشن کراچی

اس کتاب نے مجھے پھر سے جوان کیا

میرے فارسی زبان و ادب کے شاگردِ عزیز راجہ کاشف نے جب مجھے اپنے اس ناول کے بارے میں بتایا اور مجھ پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی کہ میں نے اس پر تقریظ لکھنی ہے تو میں سمجھا کہ عام فہم ناول ہو گا جیسا کہ ہوا کرتا ہے لیکن جب میں نے اسے پڑھنا شروع کیا تو اس میں اتنی گہرائی تھی اور اتنا فلسفہ، سائنس اور علم نفسیات کو یکجا کیا گیا تھا کہ میں اسی کا ہو کر رہ گیا اور سب سے بڑھ کر جو داستانِ عشق پیش کیا گیا ہے اس نے تو کہیں توجہ ہی نہ جانے دی۔ میں بذات خود رات کو جلدی سونے والا شخص ہوں لیکن اس کتاب نے مجھے اپنے سحر میں اتنا مبتلا کئے رکھا کہ میں بارہ، ساڑھے بارہ بجے اُٹھتا اور صُبح تک پڑھتا رہتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ راجہ کاشف نے بڑی محنت اور لگن سے اس کو تصنیف کیا ہے حتٰی کہ یہ پایا گیا کہ ایک ایک صفحے کے لکھنے کے لئے کئی کئی دن لگائے گئے ہیں۔ میں جتنا راجہ کاشف کو جانتا ہوں وہ اس قول کا صحیح مصداق ہے کہ جیسی شخصیت ویسی تصنیف۔ ایک دوست نما استاد کی حیثیت میں نے جتنا اُسے جانا ہے وہی اس کے کتاب میں محسوس کیا ہے بلکہ کتاب پڑھتے ہوئے اکثر جگہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسا کہ وہ خُود اپنی کہانی اپنی زبانی سُنا رہا ہے اور اس کا عکس ہر صفحے پر میرے سامنے مُسکراتا ہوا گزرتا جا رہا ہے۔

اس سے پہلے میں راجہ کاشف کی پشتو شاعری کی کتاب "احساس" بھی پڑھ چکا ہوں۔ لیکن اس ناول میں پہلی دفعہ اس کے فارسی آمیز اردو شاعری پڑھنے کو ملی جو کہ دل موہ لینے والی تھی اور مجھے بہت پسند آئی اور۔ یہ دونوں غزلیں بہ تخلصِ عُویم لکھی گئی ہیں۔

یہاں پر میں اپنے آخری الفاظ بیان کرنا چاہتا ہوں اور یہی وہ اظہارِ خیال ہے جو میرے اس تقریظ کا عنوان بنا کہ کتاب ختم ہوتے ہوئے وہ آخری لمحات جس میں عُویم اور سروش کی ملاقات ہو جاتی ہے، رلا دینے والی ہے۔ شاید آدھی رات کے بعد کا وقت تھا، میں اس کو پڑھ رہا تھا کہ پڑھنے کے دوران میں خوب دل کھول کر رویا۔ تبھی میں نے لکھا ہے کہ اس کتاب نے مجھے پھر سے جوان کیا۔ مزید میں اس کے سوا کچھ نہیں کہتا کہ راجہ کاشف کے لیے دین و دنیا کی بھلائی کے لیے دُعا مانگوں۔ اس کے لیے ڈھیر ساری دعاؤں کے ساتھ اپنا تحریر ختم کرنا چاہتا ہوں۔

سیّد غیّور حُسین

پروفیسر خانۂ فرہنگ ایران، پشاور

اِک نظر "اِثبات" پر

برادرم راجہ کاشف کا دائرہِ انہماک الحاد و مذہب جیسے مباحث تلک بخوبی پھیلا ہوا ہے۔ ہمارے حلقہِ احباب میں اُن کا شمار کارِ تدبر پر گامزن مردانِ خوش نصیب میں ہوتا ہے۔ میں نے انھیں جتنا جانا، کتاب و قلم سے رشتہ نبھاتے پایا۔ وہ اپنے وارداتِ فکر و خیال شعر و نثر میں ڈھالنے کے ذوق سے بھی بہرہ مند ہیں۔

یہ اِسی ذوق کا حاصل ہے کہ آج اُس نے مذہبی اور الحادی ذہن کی الجھنوں اور باہمی آویزشوں کو "اثبات" کی صورت میں ہمارے سامنے رکھا ہے۔ ان دقیق مباحث کو ناول کا آہنگ دے کر دل چسپ اور زود فہم بنانے کی خوب صورت کوشش کی گئی ہے۔ "سوفی کی دنیا" ، "جب زندگی شروع ہوگی" جیسی کامیاب کاوشوں کے بعد اہلِ قلم اس جانب متوجہ ہوئے ہیں کہ دقیق مباحث کو ناول کا رنگ بخش کر سہل و دل آویز بنا کر نسل نو کی دلچسپیاں اہم اور پیچیدہ تفکرات کی طرف موڑی جائیں۔

"اثبات" اِسی راہ کی طرف پیش قدمی کی حوصلہ افزا کاوش ہے۔ کتاب فنِ ناول نگاری میں اپنا کیا مقام بنا سکے گی؟ اس کا فیصلہ ناول شناس طبیعتیں ہی کر پائیں گی البتہ اِس میں چھیڑے گئے مباحث کا دائرہ چونکہ میرے دائرہِ ذوق سے بھی آ ملتا ہے، سو اس باب میں، میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ اِس عہد کے فکری افق پر دراصل یہی موضوعات ہیں جنھیں فکر و تدبر سے لے کر کتاب و قلم تک زیرِ بحث لانے کی ضرورت ہے۔ الحاد کی لہر اپنی

تمام تر بوقلمونیوں کے ساتھ ذہنوں کے دھارے موڑ رہی ہے، ایسے میں ضروری ہے کہ "اثبات" کی سی کاوشوں کا دائرہ پھیلایا جائے اور ذہنوں کو مذہبی بیانیے سے وابستہ رہنے کی اساسات فراہم کی جاتی رہیں۔

برادرم راجہ کاشف اِس اہم کاوش پر ہم سب کے شکریے کا مستحق ہیں۔ میں پُر امید ہوں کہ اُن کی یہ کاوش نسلِ نو کا ذہنی میلان اپنے عہد کے اہم تر فکری مباحث کی طرف موڑنے میں کامیاب ہو گی۔

محمد تہامی بشر علوی

ڈائریکٹر ادراک انسٹیٹیوٹ، اسلام آباد

ریسرچ فیلو آئی آر ڈی اینڈ ریلیجئیس آفیئرز پاکستان ٹیلی ویژن

اثباتِ حق ـــــ اِک سفر، اِک داستان

ناول کا کینوس اور میدان بہت وسعت کا حامل ہے اور آج تک فلسفے و نفسیات سے لیکر مذہب و سائنس وغیرہ کے مضامین اور افکار ناول کے موضوعات بنتے رہتے ہیں۔ آج ناول کے سلسلے میں جو تجربات ہو رہے ہیں۔ اُن کو دیکھ کر ناول کو کسی ایک ہئیت، ساخت اور موضوع تک محدود نہیں کیا جا سکتا سوفی کی دنیا سے لیکر شمس الرحمان فاروقی کے ناول "کئی چاند تھے سر آسمان" کو دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ناول میں ہر فکر، ہر موضوع، ہر کہانی و داستان کو اپنے اندر سمونے کی وسعت ہے اور آج دُنیا بھر میں ناولوں کا تنوع دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ناول میں ہر قسم کے خیالات، احساسات اور افکار کو کھنگالا جا سکتا ہے۔ راجہ کاشف کا ناول "اثبات" مختلف موضوعات کو مختلف زاویوں اور پہلوؤں سے کھنگالتا اور برتتا ہے اور اس طرح زندگی کے مختلف گوشے وا کرتا ہے۔ اصل میں عُویم نامی نوجوان کی تلاش حق اور جستجوئے حُسن کی داستان ہے۔ عُویم شک، تذبذب، لاادریت اضطراب اور دہریت جیسے مختلف ادوار سے گزرتا ہے اور ہر قسم کی انتہا پسندی سے بچتے ہوئے وہ ہر اُس دَر پر دستک دیتا ہے جہاں سے اُسے سچ کی کوئی کرن چھنتی نظر آتی ہو۔ اس ناول میں انوکھی بات یہ ہے کہ یہ ایک منتشر و ژولیدہ فکر اور خانوں میں بٹے انسان کی کتھا نہیں بلکہ ایک پورے انسان اور پورے آدمی کی کہانی ہے جو حق کو صرف حواس اور عقل کے ذریعے نہیں بلکہ علم و ادراک اور حُسن و جمال کے ہر راستے اور ہر مظہر میں بھی ڈھونڈتا ہے۔ اس ناول کی کہانی

حُسن و جمال، عقل و وجدان، شعور و لاشعور کا خوبصورت امتزاج اور تال میل ہے۔ اس ناول کا ہیرو اپنے پورے وجود، پورے احساس، جمالیاتی حِس، تعقل اور وجدان کے ساتھ حق ڈھونڈتا ہے۔ حق کو پانا اور حق کے مطابق زندگی گُزارنا اُس کی پہلی ترجیح، اُس کی آخری منزل، اُس کے زندگی اور مقصدِ حیات کا اثبات ہے، حق کی یافت اُس کے پورے وجود اور زندگی کے اثبات سے عبارت ہے اور اس لیے اس حق کی یافت کے لیے وہ پوری زندگی اپنی تمام تر صلاحیتوں، جہات اور حسیات سمیت کھپاتا ہے۔ اور اپنی دانست میں جب بھی حق کی کرن، سچ کا کوئی جلوہ، سچائی کا کوئی اُفق دیکھتا ہے تو اُس کی طرف دیوانہ وار لپکتا ہے اور پھر اپنے پورے وجود، ادراک، شعور، اذعان، سپردگی اور انقیاد کے ساتھ اپنے آپ کو حق کے حوالے کرتا ہے۔ ناول کا ایک ایک سطر، ایک ایک پیراگراف اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ یہ ناول پورے وجود کی حسیات، ادراک و شعور کی پوری بیداری اور اخلاص میں ڈوب کر لکھا گیا ہے۔ پورا ناول پکار پکار کہہ رہا ہے کہ یہ ناول پورے وجود کی حسیات، ادراک و شعور کی پوری بیداری اور اخلاص میں ڈوب کر لکھا گیا ہے اُس کی پوری زندگی، اُس کی حسیات اور کیفیات ناول کے صفحات میں جھلملا رہی ہیں۔ اور یہ سب باتیں بتا رہی ہیں کہ لکھے جانے سے پہلے یہ ناول جِیا چکا ہے، بِتا جا چکا ہے۔ اب ظاہر ہیں کہ یہ ضروری نہیں کہ قاری انہی کیفیات، اضطراب، ادراکات، کرب اور حالات سے گزر چکا ہو جس سے ناول کا ہیرو گزر چکا ہے اور اس لیے ممکن ہے کہ سب قاریوں پر اس کا اثر مختلف ہو گا لیکن ہر سنجیدہ قاری جب بھی توجہ سے یہ ناول پڑھے گا وہ اس کی رو میں اپنے آپ کو بہتا محسوس کرے گا۔ چونکہ اس ناول کے مختلف مباحث کی تفہیم کے لیے ناول نگار نے طویل عرصے تک بہت تحقیق کی ہے اور ان تحقیقات کا خلاصہ مختلف سوالات اور مباحث کے ضمن میں مصنف نے ناول کے صفحات میں اُنڈیل دیا ہے اس لیے بعید نہیں کہ شاید بہت سے لوگوں کو

ان نتائج فکر سے اختلاف بھی ہو اور ان علمی مباحث کی وجہ سے بہت سی جگہوں پر ناول کی روانی اور کہانی پن بوجھل، بی کیف اور متاثر بھی ہوئے ہیں لیکن جدید دور کے ہیجان خیز دور میں نوجوانوں کے لیے یہ مباحث کسی طرح بھی بے معنی، غیر متعلق اور لاحاصل نہیں۔ آج ہمارا معاشرہ مختلف سطحوں پر ناول میں زیر بحث مسائل، لامعنویت، الجھنوں اور بحرانوں کا شکار رہے۔ ہمارے دانشور ادارے، مذہبی اور سیاسی رہنما ان مباحث سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکتے اور جوانوں کو صرف وعظ اور روایتی طریقوں سے سمجھایا نہیں جا سکتا۔ فکشن اور خاص کر ناول کا صنف آج مختلف افکار کو پیش کرنے کا ایک آسان اور مؤثر ذریعہ ہے۔ مصنف نے ان سلگتے مباحث اور سوالات کو اپنی تحقیق اور ذوق کے ساتھ ایک کہانی کے پیرائے میں ایک فکر انگیز اسلوب میں قارئین کے سامنے رکھ دیا ہے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں مصنف کے لیے یہ سوالات اور اُن کے جوابات زندگی اور موت، اثباتِ حیات اور نفی ذات کا مسئلہ رہے ہیں۔ اس لیے پوری دیانت داری سے انہیں ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ اب جوابات اور حل، ان کا بیان تسلی بخش ہیں یا نہیں، یہ قاری کے فیصلے اور ذوق پر منحصر ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ یہ ناول فکر کو مہمیز دیتا ہے اور ہمارے بہت سے تعصبات کو جھٹک کر ان پر از سرِ نو غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ ایک جوان ناول نگار سے توقع ہے کہ اس کے آئندہ ناول بہتر سے بہتر ہوں گے اور اسی طرح اچھوتے اور نئے موضوعات زیرِ بحث لائیں گے۔

اسلم میر

المورد فیلو

گفتارِ من

"اثبات" ایک طالب علمانہ کاوش ہے جسے احساس کی سرسبز و شاداب چوٹی اور بے آب و گیاہ صحرا میں ڈیرے ڈال کر لکھا گیا ہے جس کے ایک ایک فقرے، ایک ایک منظر کو روح کی اتھاہ گہرائیوں میں اتار کر اور سیر کروا کر کتاب کے حوالے کیا گیا ہے۔ اس لئے آپ بھی اسے محسوس کرکے پڑھنے کی کوشش کریں تاکہ اس کے فقرے جو میرے لہو سے تر ہیں ، ان کی کڑواہٹ محسوس ہو۔

ویسے تو گفتار من و احساسات من سے کتاب بھری پڑی ہے لیکن چند دوست و احباب اور اساتذہ جن کا شکریہ اپنے اوپر قرض و فرض سمجھتا ہوں اور جس کو ادا کئے بغیر کتاب ادھوری ہے کے ساتھ ساتھ صرف دو الفاظ جو اس کتاب کا محور ہیں ، وہ ہیں۔

خدائے بزرگ و برتر اور محبت

نیست بر لوح دلم جز خدا و محبت

راجہ کاشف

باب اول

اِضطراب

"کائنات میں تسکین کیلئے ابھی تک جو سب سے مؤثر طریقہ دریافت ہوا ہے وہ تنہائی میں مائلِ گِریہ ہونا ہے"

عُویم اپنے کمرے میں رو رہا تھا اور ان کہے الفاظ سے فریاد کر رہا تھا۔ وہ اس انداز سے رو رہا تھا کہ کسی اور کو پتہ بھی نہ چلے بلکہ خود اپنا وجود اور احساس بھی اس رونے سے بے خبر ہو۔ لیکن مجبور تھا۔ آنسو تھے کہ خود بخود نکلتے جا رہے تھے۔ دل تھا کہ کچھ کہے جا رہا تھا جسکی اسے خود بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ وہ تکیے پر اوندھے منہ پڑا اپنے آنسو چھپانے اور خشک کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تاکہ نہ خود اپنے آنسو دیکھ سکے نہ کوئی اور۔ وہ بار بار خود سے مخاطب ہو رہا تھا کہ ایسا کیا طوفان آیا ہوا ہے جس نے مجھے رونے پر مجبور کر دیا ہے اور میں دل گرفتہ ہو چکا ہوں۔ اور یہ آج کوئی پہلی بار نہیں بلکہ ہفتے دو ہفتے میں ایسا واقعہ بغیر کسی وجہ کے میرے ساتھ ہوتا رہتا ہے۔

کون ہے جو میری روح کے ساتھ اتنی شدت سے کھیل رہا ہے جسکی تاثیر گھنٹوں تک مجھے پریشان کئے رکھتی ہے۔ کون ہے جسکی گرفت مجھ پر اتنی مضبوط ہے جس سے میں ہِل تک نہیں سکتا۔ کوئی مجھے کیوں تنگ کر رہا ہے۔ کیا بگاڑا ہے میں نے کسی کا۔ میں اپنے وجود سے کہاں بھاگ جاؤں۔ آخر یہ کیا ہے جسکی وجہ سے اس اضطراب نے یہ طوفان برپا کیا ہوا ہے۔

یہ وہ باتیں تھی جو عُویم اپنے ساتھ دل میں کر رہا تھا جس میں بہت کم الفاظ بعض دفعہ ہوا گوش ہو جاتے ورنہ عویم یہ باتیں کسی اور کے ساتھ شریک نہیں کرنا چاہتا تھا حتیٰ کہ اپنے وجود کے ارد گرد لپٹے ہوئے ہوا کے ساتھ بھی نہیں۔

اس دوران عُویم بار بار آسمان کی طرف سوالیہ اور متلاشی و رقت بھری نظروں سے بغیر کچھ کہے دیکھتا رہتا اور پھر سر نیچے کرلیتا۔ وہ اپنے جسم اور روح کے محاذ پر اپنے ساتھ جنگ میں مصروف تھا کہ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور ماں اندر داخل ہو گئی۔

عویم بیٹا! میں نے آپکا جیب خرچ آپکے دراز میں رکھ دیا ہے۔ میں رشتہ داروں کے ہاں جارہی ہوں، اس لئے بتارہی ہوں کہ مجھے ڈھونڈتے نہ پھرو۔

دروازہ کھلتے ہی عویم فوراً اُٹھ گیا اور دروازے کی طرف پشت کرکے اپنی کتابوں میں خود کو مصروف رکھنے لگ گیا تا کہ ماں اسکا چہرہ نہ دیکھ سکے۔ وہ بغیر کسی ضرورت کے ایک کتاب کو اُٹھاتا اور دوسری جگہ رکھ دیتا، اسی طرح دوسری کتاب کو اُٹھا کر ہلکا سا گرد صاف کرکے کسی اور جگہ رکھ دیتا۔

ماں نے جب بات پوری کی تو عُویم نے دھیمی سی آواز میں "جی اماں جی" کہہ دیا۔ وہ ماں سے رشتہ داروں کے بارے میں معلوم نہ کرکے بات کو طُول نہیں دینا چاہتا تھا بلکہ وہ چاہتا تھا کہ جتنا جلدی ہو سکے ماں کمرے سے باہر چلی جائے اور ہُوا بھی ایسا ہی۔ ماں نے پیسے رکھتے ہی اور اطلاع کرتے ہی رخصت ہو گئی۔ عویم نے دروازہ بند ہونے کے ساتھ آہستہ سا "خدا حافظ" کہہ دیا اور دل ہی دل میں اللہ کا شُکر ادا کیا۔

یہ عُویم کی عادت تھی کہ وہ کبھی بھی اپنے گھر میں کسی چیز کے لیے نہیں کہتا تھا اور نہ ہی اُسے بذات خود وصول کرتا تھا۔ بلکہ ماں سے کہہ دیتا کہ میرے کمرے میں رکھ دینا، میں لے لوں گا۔ اسی طرح وہ ضرورت کیلئے پیسوں کی مقدار بھی نہیں بتایا کرتا بس ماں کو خود بخود پتہ چل جاتا کہ اُسے اتنے کی ضرورت ہو گی اور ماں اُس حساب سے پیسے رکھ دیتی۔ عُویم کی

دوسری مستقل عادت یہ تھی کہ جب بھی گھر سے باہر جاتا ماں کی اجازت اور دیدار ضرور کر کے رخصت ہوتا اور واپسی پر قدرے تیز آواز میں "ماں" کہہ کر چِلاتا۔ ماں بھی اسکی عادتوں سے واقف تھی۔ بس اپنا چہرہ اُسے دکھا دیتی اور بیٹا مطمئن ہو جاتا۔ عُویم کی نظر جیسے ہی ماں پر پڑ جاتی، فوراً سکون کا سانس لیتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چل پڑتا۔ نہ کوئی تقاضا ، نہ کوئی پیغام، نہ کچھ اور، بس ماں کے چہرے کی ایک جھلک۔ اگر کوئی بات کرنی مقصود ہوتی تو وہ بعد میں آرام کے ساتھ کر دیتا۔ ان سب کے باوجود وہ اپنے بھائیوں میں ماں کے ساتھ سب سے زیادہ لڑنے والوں میں تھا۔ لیکن ماں اسکے مزاج سے واقف تھی اور وہ ماں کے مزاج سے۔

ماں کے نکل جانے کے بعد وہ دوبارہ اپنے خیالوں کی دنیا میں گھومنے لگا اور تخّیل و تعقل کا سہارا لیتے ہوئے اپنے اضطراب کو کھوجنے لگا کہ آخر کیا ہے، کیوں ہے، کون ہے، جس کے ساتھ میری روح کبھی سرشار رہتی ہے اور کبھی اس کی تڑپ اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ روح مادی جسم میں بحالتِ زنداں محسوس ہونے لگتی ہے۔ کون ہے، جس کی مجھ پر تاثیر کی شدت کے سامنے ہمالیہ بھی ہیچ ہے اور سمُندر قطرہ نما، جو کہ مجھے اسیر رکھتا ہے۔ آخر کب یہ عنقا میرے ہاتھ آئے گا اور معّمہ اپنے انکشاف کے ساحل پر پڑاؤ کرے گا، آخر کب۔۔۔۔

کبھی یک بہ یک توجہ، کبھی دفعتاً تغافل
مجھے آزما رہا ہے، کوئی رخ بدل بدل کر

باب دوم

مذہب بیزاری

یار فردان! کیوں اپنا وقت ضائع کر رہے ہو اور ہمارا بھی۔ چھوڑو یہ سب۔ آؤ گیم کھیلتے ہیں۔ یہ مہینہ دو مہینہ تو انجوائے کرنے دو۔ اس کے بعد تو ویسے بھی امتحانات شروع ہونے والے ہیں۔ پھر پتہ نہیں ہاسٹل کی زندگی، یہ دوستوں کی محفلیں نصیب ہونگی یا نہیں۔

کیف! بس یہ جمعہ پڑھ کے آتا ہوں، پھر میرا پورا دن آپ کے نام۔ یہی ایک جمعہ ہی تو رہ گیا ورنہ تو ہماری عبادتیں عادتوں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ جس میں نہ کوئی روح باقی ہے نہ احساس۔ اس جمعے کی نماز کا تو حق ادا کرنے دو اس کو تو پورے احساس اور ذمہ داری کے ساتھ پڑھنے دو بھائی!

بھائی! تُو بہت سیدھا سادہ واقع ہوا ہے اس جدید دور میں بھی مذہب کا پُجاری ہے اور اپنی خوشی و اطمینان مسجد میں ڈھونڈتا پھرتا ہے، سائنس مذہب کو کب کی شکست دے چکی ہے۔ آپ مانیں یا نہ مانیں، لیکن حقیقت یہی ہے۔

کیف کا مذہب پر تبصرہ سُن کر فردان نے کچھ نہیں کہا اور اپنی تیاری میں مشغول رہا۔ کیف کو اپنی گیم کی پڑی ہوئی تھی۔ ساتھ میں آکاش بھی اسی انتظار میں تھا کہ کب گیم شروع کریں گے۔

اسی دوران کیف آکاش سے محو گفتگو ہوا جس میں وہ باتیں تو آکاش سے کر رہا تھا لیکن ساتھ ساتھ وہ فردان کو بھی سُنانا چاہتا تھا۔

آکاش! پتہ ہے آپ کو۔۔۔ گاؤں میں ہمارے بارے میں مشہور ہے کہ ہم شہر میں اور ہاسٹل میں خوب مزے لے رہے ہیں اور زندگی کو خوب انجوائے کر رہے ہیں۔ لیکن خاک

ایسی انجوائے منٹ (Enjoyment) پر جس میں فردان جیسے دوستوں کا ساتھ شامل ہو۔ ہر انجوائے منٹ کے دوران اس کا مذہب روڑے اٹکاتا ہے۔ اور سارا مزہ پھیکا کر دیتا ہے۔ اس مذہب کی تو ایسی کی تیسی، اس کو کہیں اور جگہ نہیں ملی جو ہمارے دوستوں کے بیچ آکر لٹک گیا۔

آکاش بھی فردان کی طرف متوجہ ہوا۔ ہاں نا فردان! کیف ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے ہمارا بھی حق ہے آپ پر۔ ہمیں بھی وقت دو۔

فردان یہ ساری باتیں ایک کان سے سُن رہا تھا اور دوسرے سے نکال رہا تھا کیونکہ ایک طرف تو یہ معمول کی باتیں تھیں اور دوسری طرف وہ اس وقت خُود کو اس بحث میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ کیونکہ نماز پڑھنے میں وقت کم رہ گیا تھا اور وہ اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

چند منٹ بعد فردان دروازے کی طرف بڑھا اور مُسکرا کے "آپ دونوں جو بھی کہیں مُجھے آپ دونوں سے پیار ہے خدا حافظ" جلدی جلدی کہہ کر مسجد کو چل دیا۔ فردان کے نکلتے ہی دونوں نے ٹھنڈی آہ بھری اور ایک دوسرے کو تکنے لگے اُن کی امیدوں پر پانی پھیر گیا۔ اب اس اڑبنگے کا انتظار ہی کرنا پڑیگا اور کیا کر سکتے ہیں اسکے ساتھ۔

آکاش شکست خوردہ لہجے میں بَڑبڑایا۔

مسجد سے واپس آتے ہی دونوں فردان پر فقرے کَسنے لگے اور جملوں کے تیر برسانا شروع کر دیئے۔

ہاں بیٹا! بتا کیا کما کے آیا ہے مسجد سے؟

کیا مل گیا تجھے تیرا جھوٹا خُدا؟

کچھ ملا کہ نہیں؟

شُکر کرو اس دفعہ چپل چوری ہونے سے تو بچ گئے اگر تیرے خُدا میں اتنی طاقت ہے تو پچھلی دفعہ تیری چپل تو چوری کروانے سے بچا لیتا۔ چپل نہیں سنبھالے جاتے اور فردان

جیسوں پر حکومت کر رہاہے بلکہ محترم فلسفی فردان صاحب کے مطابق پوری کائنات کا بادشاہ ہے اور پوری دنیا اُسکی مُٹھی میں ہے۔

کیف اور آکاش دونوں فردان پر طنز کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ مذہب اور خُدا کو بھی اپنے تیروں کا ہدف بنائے ہوئے تھے۔ دوسری طرف فردان ہمیشہ کی طرح خاموشی سے سُن رہا تھا ساتھ ساتھ کانوں کو ہاتھ لگا کے استغفار بھی پڑھ رہا تھا۔ اور دونوں کی دلجوئی کیلئے مُسکرا بھی رہا تھا کیونکہ وہ دونوں فردان پر غصہ تھے اور فردان بحث کر کے جلتی پر تیل چھِڑکنے والا نہیں تھا۔

دیکھو بھائیو! آپ جو بھی کہہ لیں مجھے نہ بحث کرنی آتی ہے اور نہ بحث کرتا ہوں۔ ساتھ ساتھ میرا مطالعہ بھی اتنا نہیں ہے کہ اس حساس موضوع پر آپکے ساتھ بحث کروں۔ اور ہاں کیف! تجھے تو اپنے فلسفے کے مطالعے نے خراب کر دیا ہے اور راستے سے بھٹکا دیا ہے اس سے پہلے آپ بھی میری طرح مذہبی تھے۔

فردان نے مصلحانہ انداز اپنائے ہوئے اپنے آپکو بحث سے الگ کر دیا لیکن آخر میں کیف کے فلسفے کے مطالعے پر تبصرہ کر کے اسے دوبارہ میدان میں اُترنے کی دعوت دی۔

ہاں! پہلے میں بھی آپ کی طرح پاگل تھا اور خُدا کے پیچھے پڑا تھا اور وہ خُدا جس کا کوئی وجود نہیں۔ یہ تو شکر ہے کہ فلسفے نے میری آنکھیں کھول دیں وگرنہ میں بھی آپ کی طرح اس خوبصورت اور عیش و عشرت سے بھری دنیا سے کہاں لطف اندوز ہوتا۔

کیف نے اپنے دل کی بھڑاس نکال کر بحث کو فُل سٹاپ لگا دیا جبکہ فردان پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ خاموش ہو رہا۔ دوسری طرف آکاش خاموشی سے گیم کے لیے لیپ ٹاپ برابر کرنے اور نیٹ ورکنگ (Networking) میں مصروف تھا۔

باب سوم

مُحبتِ مخفی

آپ تو ناول اور شاعری وغیرہ پڑھتی ہیں، محبت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟
عریشہ نے سروش کی طرف توجہ کر کے سوال پوچھ لیا۔
محبت جھوٹ ہے اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے میں اس کے وجود تک سے انکاری ہوں۔
سروش نے دیکھے اور متوجہ ہوئے بغیر جواب دیا۔
زُنیرہ ہنس پڑی، یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ پوری کائنات کو محبت نے سر پہ اُٹھا رکھا ہے اور اپنی انگلیوں پہ نچا رہا ہے اور آپ کہہ رہی ہیں کہ محبت کا وجود بھی نہیں، اور جھوٹ ہے۔ دلچسپ۔۔۔۔۔۔بہت دلچسپ۔
عریشہ نے مجھ سے میرا نکتہ نظر پوچھا تھا اور میں نے وہی بیان کیا جو میرا خیال تھا ہو سکتا ہے آپ اس سے اختلاف کریں لیکن میرا خیال یہی ہے جو میں بیان کر چکی۔
سروش کے جواب میں قدرے ترشی شامل تھی کیونکہ وہ اس موضوع پر بحث نہیں کرنا چاہتی تھی۔
آپ لوگوں کو کوئی اور موضوع نہیں ملتا جو اس فضول موضوع پر مذاکرہ کرنے لگ گئی۔ سروش نے اپنی بات ہلکے سے وقفے کے بعد جاری رکھی۔
بَس، بَس زیادہ چِڑ چِڑے پن کی ضرورت نہیں۔ چلو کنٹین چلتے ہیں ویسے بھی اگلی کلاس میں ابھی کافی وقت ہے۔

عریشہ نے دونوں سہیلیوں کو ساتھ لیا۔ سروش نے مسکرا کر سر ہِلا دیا اور تینوں سہیلیاں کنٹین کی طرف روانہ ہو گئیں۔

چھٹی کے بعد گھر آکر سروش کے دل میں بار بار عریشہ کا وہی سوال گھوم رہا تھا "محبت کیا ہے، محبت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے"۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھی اپنے آپ سے محوِ گفتگو تھی۔

"محبت زندگی ہے، محبت ہی کائنات کی ابتداء ہے، محبت ہی کائنات کی انتہا ہے، محبت ہی اس کائنات کی اساس ہے، محبت کے بغیر زندگی ادھوری ہے، ادھوری کیا محبت کے بغیر زندگی کا وجود ہی نہیں، محبت تپتی صحرا میں جوئے آب ناب ہے، محبت سپردگی ہے، محبت اپنے دل و دماغ، ہوش و حواس، خیالات و تصورات اور جذبات و احساسات کو کسی ایسی جگہ پر پٹی باندھے آنکھوں سے خوشی خوشی پڑاؤ کروا دینا ہے جس کا پتہ بھی معلوم نہ ہو، محبت اپنی انا کو کسی پر خوشی خوشی نچھاور کرنے کا نام ہے، یہ فسانہ میرے عقل و فہم سے ماورا ہے کہ اس کائنات میں کوئی ایسا شخص بھی ہو جس کو محبت کی ہوا نہ لگی ہو، ہو ہی نہیں سکتا، انسان کے لاشعور کو محبت سے بھر دیا گیا ہے، محبت ہی انسانیت کی مُرشد ہے، محبت ہٹا دو تو یہ دنیا چند پل کی مہمان ہے، انسان انسان کو کھا جائے گا، کائنات کا وجود ہی مٹ جائے گا"۔

سروش آنکھوں میں آنسو لئے اپنے آپ کو کوس رہی تھی اپنے ساتھ ماتم کر رہی تھی عریشہ کے سوال کا مفصل جواب دے رہی تھی لیکن یہ سب وہ کسی اور سنانا نہیں چاہتی تھی۔

عریشہ بھی کتنی بے وقوف ہے پوچھتی ہے کہ آپ تو ناول، شاعری وغیرہ پڑھتی ہو۔۔۔۔۔ اَرے پگلی۔۔۔ ناول اور شاعری تو میں نے محبت ہی کی وجہ سے شروع کی ہے کسی کے خیال سے کھیلنے کے لیے یہ مشغلہ اپنایا ہے۔ سنا تھا کہ ناول اور شاعری میں محبت بھری پڑی ہوتی ہے لیکن غلط سنا تھا اس میں کوئی شک نہیں کہ ناول و شاعری میں محبت بھری پڑی ہوتی ہے لیکن دوسروں کی، اپنی نہیں۔

سروش کو عُویم سے محبت ہو گئی تھی لیکن سروش اس سے کہہ نہیں پا سکتی، اس میں اتنی ہمت نہیں تھی۔ کہنا تو دور کی بات اس میں عُویم کا سامنا کرنے کی بھی طاقت نہ تھی۔ وہ عُویم کے ڈیپارٹمنٹ آف فزکس کے سامنے بھی سر جھکا کر گزرتی تھی۔ محبت کے اس راز کو صرف وہ اور اس کا خُدا جانتا تھا اور شاید اس کے کمرے کی دیواریں بھی جو کبھی کبھی اس کی بھنبھناہٹ سُن لیتے۔ اس کے علاوہ کسی اور کو اس کی خبر نہیں تھی۔ سروش کا محبت کے بارے میں خیال یہ تھا کہ محبت اتنی ارزان چیز نہیں کہ ہر ایک سے اس کا تذکرہ کیا جائے۔ محبت ایک راز ہے اور راز تب تک راز کہلاتا ہے جب تک دل میں رہے۔ دل سے باہر ہوتے ہی راز کا وجود فنا ہو جاتا ہے۔

سروش ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنی سوچوں میں گم تھی کافی دیر کے بعد خود کو سنبھالنے کے بعد خود ہی اپنے آپ کو تسلی دینے لگی۔

عُویم کا ذکر اتنا بے قیمت و ارزاں نہیں کہ میں اس کو ہر ایک پر آشکار کروں وہ میرے دل میں ہے اور میرے دل ہی میں رہے گا۔ عُویم کے لیے میرے دل سے بڑھ کر محفوظ جگہ نہیں ہو سکتی۔ میں کسی قیمت پر اس کے ذکر میں کسی کو شریک نہیں کر سکتی۔ میں اپنے حسین اور پاکیزہ تمناؤں کا ڈھنڈورہ پیٹنے والی نہیں۔

باب چہارم

مُبادلۂ افکار

وہ تو خاموش ہے جہالت سے
لوگ اُسے فلسفی سمجھتے ہیں

"باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جن کو باتیں کرنی آتی ہیں اور جن کے پاس کہنے کو کچھ ہوتا ہے"۔

عُویم نے اپنے حق میں شعر بھی کہا اور دلیل بھی پیش کی۔

آکاش عُویم کا بازو زور سے پکڑے ہوئے اپنی طرف کھینچ رہا تھا اور سینئرز (Seniors) کے کلاس رومز (Classrooms) سے باہر نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

کب سے ڈھونڈ رہے ہیں آپکو اور آپ کو پرواہ بھی نہیں کہ یونیورسٹی میں کوئی ہے بھی جو آپکا انتظار کر رہے ہیں۔ آپکو تو بس بحث کے لئے ماحول چاہیئے۔

آکاش اس پر غصہ ہو رہا تھا کیونکہ کئی دنوں سے ویسے بھی ملاقات نہیں ہوئی تھی اور آج بھی وہ صبح سے غائب تھا۔ یونیورسٹی آتے ہی عُویم کی ملاقات سینئرز سے ہوئی جن سے پہلے سے جان پہچان بنی ہوئی تھی اسی دوران سیاست پر بحث چھڑ گئی اور وہ گھنٹے دو گھنٹے کے لئے وہیں پھنس گیا، عُویم کو بحث ومباحثوں سے انتہائی لگاؤ تھا وہ اسے علم کی منتقلی کا ایک بہترین ذریعہ سمجھتے تھے وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ جو علم یا کتاب دورانِ تذکرہ دہرایا جائے وہ

حافظے میں دیر تک قائم رہتی ہے ورنہ بھولنے کا خدشہ ہے۔اس کے ساتھ بحث کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ دوسرے فریق کے علم سے بھی کچھ حصہ چھیننے کو مل جاتا ہے۔

ارے بھائی! کیارکھا ہے ان بحث ومباحثوں میں؟

فردان نے عُویم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہوئے کہا۔

کیا کہا، کیا کہا۔۔۔ ذرا پھر سے بول، کیا رکھا ہے بحث ومباحثوں میں۔بھائی! میں اللہ تعالیٰ کے احسانات میں سے ایک احسان سے بھرپور فائدہ لے رہاہوں۔ آپ کو پتہ ہے، سورۃ رحمٰن کے شروع میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو اپنے احسانات یاد دلارہاہے اسکی ترتیب کچھ یُوں ہے۔

پہلا احسان یہ کہ میں نے تجھے قرآن کریم کی تعلیم دی۔ دوسرا احسان یہ کہ میں نے تجھے انسان بنایا اور پتہ ہے اللہ تعالیٰ تیسری نمبر پر کس احسان کا ذکر فرماتے ہیں کہ میں نے تجھے بولنا سکھایا۔ سمجھ گئے۔۔۔۔۔

اس نُطق کی صلاحیت کو ہلکا نہ لیا جائے۔یہی صلاحیت اس بات کی شاہد ہے کہ انسان عاقل ہے۔ اس کو استدلال، استنباط اوراجتہاد کی صلاحیتوں سے نوازا گیاہے۔ یہ ایک عظیم نعمت ہے۔

عُویم اپنے کپڑوں اور بالوں کو سیدھا کرتے ہوئے بولا۔

ہمیں پتہ ہے کہ آپ نے علمِ سیاسیات کا کافی مطالعہ کیا ہوا ہے اور بحث ومباحثوں کے شوقین بھی ہو لیکن یہ یاد رکھ کہ اس معاشرے میں بحث و مباحثے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ اکثر و بیشتر فریق ایک دوسرے کو دشمن سمجھنے لگتے ہیں اور یوں بحث میں تلخی آجاتی ہے اور یہ تلخی بڑھتے بڑھتے مخالفت کی حد تک چلی جاتی ہے۔

آکاش عُویم کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

یہ تو بحث کی غلطی نہیں ہوئی میرے دوست اور نہ بحث کو اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے یہ غلطی تو ہماری ہے کہ بحیثیت قوم ہم نے اپنی تربیت ہی نہیں کی ہے کہ بحث کس طرح کی جائے۔ کس طرح مختلف اور مخالف آراء کو سُنا اور سمجھا جائے۔گُفت کے ساتھ شَنید کو کیا اہمیت دی جائے۔بحث کو کن کن مراحل سے طے کیا جائے کس طرح دوسروں کی عزت نفس کا خیال رکھا جائے۔۔۔یہ آپ جو فرمارہے ہیں کہ بحث مباحثے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا اس کی سب سے بڑی وجہ یہی غیر اخلاقی، غیر منطقی اور غیر منظم لاعلم رویہ ہے اس کی وجہ سے یہ لفظ اور یہ فعل بدنام ہوا ہے۔ چلو آپ کی خاطر میں بحث کو لفظ "مکالمے" سے تعبیر کرتا ہوں۔اس لفظ "بحث" کی بدنامی کی ایک اور وجہ غیر علمی اور جذباتی سیاسی مباحث بھی ہیں۔ آپ لوگوں نے غور کیا ہو گا کہ ملک اِس وقت سیاسی گہما گہمی کی زَد میں ہے۔جس میں عام لوگ کافی دلچسپی لے رہے ہیں اور تقریباً ہر شخص بالواسطہ یا بلاواسطہ کسی بھی سیاسی پارٹی سے جڑا ہوا ہے، جُڑا ہوا نہ ہو ہمدردی تو ضرور ہوتی ہے جو کہ اپنی ذات میں ایک اچھی اور جمہوری روایت ہیں جس کی داد دینی چاہیے لیکن بعض کم فہم و کم علم لوگ سیاسی عقیدت کو انتہا تک پہنچا دیتے ہیں اور اپنی پارٹی کو فرشتوں اور پیغمبروں کی پارٹی بنانے پر تُل جاتے ہیں جس میں کسی بھی قسم کی غلطی کو یکسر نظر انداز کیا جاتا ہے ہر کوئی اپنی ڈیڑھ انچ کی مسجد بنانے کی قسم کھالیتا ہے اسی وجہ سے دوران بحث ایسی من گھڑت اور خلافِ عقل تصاویر پیش کرتے ہیں اور تاویلات کرتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔جس کا لازمی نتیجہ تلخی کی صورت میں نکلتا ہے اور نوبت تصادم تک پہنچ جاتی ہے بلکہ ہاتھاپائی سے بھی گُریز نہیں کیا جاتا۔یہی وجہ ہے کہ بعض سنجیدہ اور خاموش مزاج لوگ بحث سے نفرت کرنے لگ گئے ہیں، بلکہ اکثر عوامی جگہوں اور دکانوں پر یہ بورڈ آویزاں کیے گئے ہیں کہ "سیاسی بحث منع ہے"۔اصل میں یہ مسئلہ سیاسی بحث میں نہیں بلکہ ہمارے طریقہ کار میں ہے۔

عُویم نے بڑے مفصل انداز میں شد و مد کے ساتھ اپنا دفاع کیا۔

تو آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ آپ سنجیدہ نہیں ہے۔

کیف شرارتی لہجے میں مسکرا کر بول پڑا۔

یہ تو مجھے نہیں پتہ کہ میں سنجیدہ ہوں یا نہیں کیونکہ میں اپنے لئے جج تو نہیں بن سکتا لیکن بحث سے میرا مقصد کچھ سیکھنا اور سکھانا ہوتا ہے۔ اس طرح خود کو اور دوسرے ساتھی کو بحث کے اصول و مبادی سکھانے ہوتے ہیں تاکہ معاشرے سے علم کی منتقلی کی اچھی روایت مِٹ نہ پائے۔ اب موجودہ بحث جو ہماری جاری تھی اسمیں تمام حضرات سیاست اور سیاسی پارٹیوں پر دل کھول کے بحث کر رہے تھے۔ تنقید و طنز کا نشانہ بنا رہے تھے لیکن جمہوریت کے نام تک سے نا آشنا تھے جو آشنا تھے وہ ماننے کو تیار ہی نہ تھے۔ اب آپ ہی بتائیں کہ ایسی سیاسی گفتگو کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے جو جمہوری طرزِ فکر کی مخالفت میں ہو یا عقل و فہم کی عداوت میں ہو۔ میرے خیال میں گفتگو صرف اسی شخص کو زیب دیتی ہے جو یا علم رکھتا ہو اور یا اعتراف عجز کی ہمت۔

عُویم ہلکی سی خاموشی کے ساتھ دوبارہ گویا ہوا۔

میں چاہتا ہوں کہ ہمارے معاشرے کے لوگ اختلاف اور مخالفت میں فرق جان جائیں۔ علم کی ترقی اختلافات کے بڑھنے اور مخالفت کے گھٹنے میں ہیں۔

عُویم سنجیدگی چہرے پر لئے ہوئے فکر انگیز گفتگو کرتا جا رہا تھا۔

اصولاً آپ کی بات ٹھیک ہے لیکن آج کل صرف ایک ہی شخص سے لوگ خوش ہو سکتے ہیں جو کسی سے اختلاف نہ کرتا ہو، چاہے حق پر ہی کیوں نہ ہو۔ اگر غلطی سے بھی کوئی کسی سے اختلاف کرے تو کہیں عمر کا لحاظ درمیان میں آجاتا ہے کہ میں آپ سے عمر میں بڑا ہوں آپ کو اختلاف کی جرات کیسے ہوئی اور کہیں آپ پر بد تہذیبی اور بد اخلاقی کا فتویٰ تھوپ دیا جاتا ہے خواہ آپ کا اختلاف کتنا ہی اخلاق و تہذیب کے دائرے میں کیوں نہ ہو۔ ایسی سوچ پر ماتم ہی کیا جا سکتا ہے۔

کیف نے سنجیدگی سے تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔۔۔

مجھے ایسے مزاج اور رویوں کی کوئی پرواہ نہیں۔ مجھے اگر پرواہ ہے تو اپنے اخلاق اور اپنے فہم کی ہے بس۔

عُویم نے گفتگو کا خاتمہ کرتے ہوئے فل سٹاپ لگا دیا۔

یہ چاروں دوست عُویم، آکاش، فردان اور کیف یونیورسٹی میں پڑھ رہے تھے۔ اور فزکس میں ماسٹر کر رہے تھے۔ ان چاروں میں سے صرف عُویم مقامی رہائشی تھا اور باقی تین یونیورسٹی کے ہاسٹل میں مقیم تھے اور تینوں رُوم میٹ بھی تھے۔ عُویم یونیورسٹی کے اوقات سے ہٹ کر ان کے کمرے میں آیا کرتا تھا۔ اسکو دوستوں کی محفلیں اور گپیں شپیں بہت پسند تھی وہ اپنے تمام دوستوں میں سب سے زیادہ باتُونی تھا۔ جب بھی محفل جم جاتی تھی تو شمع دان پر اکثر اسکا قبضہ رہتا۔ دل کھول کر ہنسنے والا بندہ تھا قہقہے لگا کر محفل خوب انجوائے کرتا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی حساسیت بھی اپنے عروج پر تھی۔ چھوٹی چھوٹی بات اس کے سکون میں خلل ڈالنے کے لئے کافی تھی اضطراب بھی ایسا کہ اسے کئی دنوں تک جھیلنا پڑتا اور تنہائی بھی ایسی کہ دیواریں بھی کانپ اُٹھتیں۔ ہوا کی سَر سراہٹ بھی اس تنہائی میں تیروں کی بوچھاڑ ثابت ہوتی تھی۔

باب پنجم

لِبرل اِزم

شام ہوتے ہی عُویم دوستوں کے ہاسٹل پہنچ گیا اور پہنچتے ہی اپنے جیب کے حفظِ ماتقدم کی خاطر اور دوستوں کے غصے کے اظہار سے پہلے پہلے پروگرام کی آفر کر دی۔

آج شام کا کھانا میری طرف سے کیونکہ پچھلے ہفتے میں بالکل غیر حاضر رہا۔

آپکو حالات کا اندازہ ہو گیا تھا اسلئے خود ہی اپنے آپ کو پیش کر دیا۔

فردان نے مسکرا کر سَر ہلاتے ہلاتے عُویم کی آفر پر تبصرہ کیا۔

دوسری طرف سے آکاش بول پڑا۔۔۔۔ گاڑی لایا ہے؟

ہاں لایا ہوں۔۔۔۔ عُویم نے جواب دیا۔

بس اب جلدی کرو، کہیں نکلتے ہیں کیونکہ مجھے پھر گھر واپس بھی جلدی جانا ہے۔ دیر سے آنے پر ابُو بُرا مناتے ہیں۔

چاروں دوست باہر پروگرام کرنے کی تیاری میں لگ گئے۔ عُویم نے گاڑی اسٹارٹ کی اور روانہ ہو گئے۔

یار عُویم! پچھلے ہفتے دوستوں کے ساتھ بے اعتنائی برتنے پر آپ پروگرام تو دے رہے ہیں لیکن یہ بتا کہ آپ کہاں غائب ہو گئے تھے۔ کہیں گئے ہوئے تھے؟ کوئی کام تھا یا گھر ہی میں بیٹھے رہے؟

فردان نے عمومی گفتگو کے دوران عُویم سے سوال پوچھ لیا۔

یار فردان! آپ لوگوں کو تو پتہ ہے میرے مسئلے کا، میری طبیعت کا، میرے اضطراب کا۔ جب سے شعُور کی آنکھ کھولی ہے یہ واقعہ میرے ساتھ ہوتا رہتا ہے، کہ اچانک دل و دماغ کی کیفیت بدل جاتی ہے۔ دل و دماغ پر تاریکیاں مُسلط ہونے لگتی ہیں۔ دھڑکن تیز ہو جاتی ہے جسم کے اعضاء ایسے محسوس ہوتے ہیں جیسے ان سے روح نکل رہی ہو۔ ہلکا ہلکا، ٹھنڈا ٹھنڈا، پسینہ آنا شروع ہو جاتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی بات پر غصہ آنے لگتا ہے۔ سیدھی بات بھی برداشت نہیں ہوتی۔ ہوا کی سَر سَر بھی طوفان کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ کبھی کبھار تو یہ کیفیت ایک ہی رات میں ختم ہو جاتی ہے لیکن کبھی کبھار تو کئی دنوں تک ان سے لڑتا رہتا ہوں اور اپنا دل و دماغ کھاتا رہتا ہوں۔

عُویم نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

لیکن اس کا کوئی حل تو ہو گا۔ آکاش بول پڑا۔

"تنہائی، صرف تنہائی"۔۔۔۔۔۔ عُویم نے دوٹوک جواب دیا۔

آپ کی یہ نازک مزاجی اور حساسیت ایک بے چین روح کی طرف اشارہ کر رہی ہے، آکاش نے تبصرہ کیا۔

ربّ جانے۔۔۔۔ عُویم نے کندھے اُچکاتے ہوئے جواب دیا۔

چاروں دوست یہی باتیں کر رہے تھے کہ اچانک گاڑی اشارے پر رُک گئی۔ اور رُکتے ہی چوک پر بیٹھے فقیر حرکت میں آ گئے۔ ایک بوڑھا فقیر ان کی طرف آیا، شیشہ کھٹکھٹایا اور گویا ہوا۔

بیٹا! خدا کے نام پہ کچھ دے دیں۔ بھوکا ہوں، ڈھیر ساری دعائیں دوں گا۔

فقیر جیسے ہی ان کی طرف روانہ ہوا تھا ہر ایک نے پہلے ہی سے اپنی جیب سے پیسے نکالے تھے۔ کیف نے فقیر کو پیسے دیتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ملا کر کہا۔

بابا! کیوں خُدا خُدا لگا رکھا ہے کہ اس کے نام پہ کچھ دے دیں۔ اپنے نام پہ کیوں نہیں مانگتے۔ اگر اس کے نام پہ مانگنا ہے تو اس سے خود مانگ لیں۔ وہ خود کیوں نہیں دیتا۔ اگر تو اس

میں دم ہے تو جاؤ مسجد، مندر یا کلیسا میں بیٹھ جاو۔ وہ پہنچا دے گا ویسے بھی سنا ہے کہ اس نے پوری دنیا کا ٹھیکہ لیا ہوا ہے۔

فقیر نے حیرت بھری نظروں سے کیف کو دیکھا اور پیسوں کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ اس بیچارے کو اس تلخی سے کیا واسطہ وہ تو یہاں ان تلخیوں اور طنز بھرے فقروں کو سہنے کے لئے کمر کَس کے آیا تھا۔

فقیر کا ہاتھ ہٹتے ہی کیف نے دوبارہ شیشہ اوپر کر دیا۔

پیشگی معذرت چاہتا ہوں، اس سے بہتر ہوتا کہ آپ پیسے نہ دیتے میرے خیال میں آپ نے اس کی مدد نہیں کی بلکہ اسکے ہاتھوں اپنی طنز بھری باتیں فروخت کیں۔

عُویم نے بالکل بے پروائی کے ساتھ بالکل سیدھا دیکھتے ہوئے اپنی ناراضگی کا اظہار کر ڈالا۔

عُویم کی یہ عادت تھی کہ جب بھی اس کے سامنے کوئی خلافِ معمول واقعہ ہو جاتا تو وہ اُسی وقت اپنا احتجاج ریکارڈ کرا دیتے تھے۔ اس کا ماننا تھا کہ اخلاق کے دائرے میں رہ کر اپنا مدعا فوراً بیان کر دینا چاہیئے۔ ایسا کرنا منافقت کی راہ میں بڑی رکاوٹ ثابت ہوتی ہے اور دل و زبان میں اچھی اور حسین موافقت پیدا ہو جاتی ہے۔

کیف نے جواب دینے کی خاطر آستینیں چڑھا دیں کیونکہ عُویم کا تبصرہ اسے اچھا نہیں لگا۔

میں نے تو فقط اسے اسکی اہمیت و حقیقت سے روشناس کرانے کی کوشش کی کوئی گالی تو نہیں دی۔ انسان ہی اس دنیا کا حکمران ہے تو کیوں اپنے اوپر حکومت نہ کرے۔ کیوں کسی اور کی حکومت کو قبول کرنے لئے اپنی عزت داؤ پر لگا رہا ہے۔ بی لبرل(Be Liberal)، اپنے بن کر جیو۔ کب تک دوسروں کی غلامی کرتے رہو گے۔

کیف نے جذباتی انداز میں دفاع کیا۔

آپ تو غصہ ہوگئے یار،جو کہ ہرگز میرا مقصود نہیں تھا اور رہی بات لبرلزم (Liberalism) کی۔ میرے بھائی! اسکا اطلاق عمومی ہوتا ہے خصوصی نہیں اور ہرگز نہیں۔ آپ لبرلزم کو جس زاویے سے دیکھتے ہیں میں اس زاویے سے نہیں دیکھتا۔ عُویم نے مسکراکر جواب دیا۔

کیوں میرے نقطہ نظر میں کیا خرابی ہے؟ لبرلزم کا مطلب ہے آزادی۔ اس سے مراد آزادیٔ فکر ہوسکتی ہے۔ آزادیٔ اظہار رائے ہوسکتی ہے تو کیا ہم آزاد نہیں۔ جدید دنیا تو اس آزادی کی بنیاد پر کھڑی ہے۔

کیف نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ آؤ بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔

عُویم نے سر ہلاکے ہوٹل کی طرف اشارہ کرکے مُسکرا کر کہا کیونکہ اسی دوران وہ ہوٹل کی پارکنگ میں پہنچ گئے تھے اور گاڑی پارک کر رہے تھے۔ ہوٹل پہنچ کر چاروں دوست ایک کونے میں بیٹھ گئے اور کھانے کا آرڈر دیا۔اسی دوران ہلکی پُھلکی مسکراہٹیں اور مذاق بھی جاری رہا۔ دوست ایک دوسرے پر فقرے کَستے رہے کہ آکاش نے محفل کی توجہ لبرلزم کے بحث کی طرف دوبارہ موڑ دی۔

اچھا تو عُویم! آپ لبرلزم پر گفتگو کر رہے تھے۔۔

جی! تو لبرلزم سے میری مراد بھی وہی ہے جو کیف نے سنائی لیکن اس کے اطلاق کے بارے میں میری رائے مختلف ہے اگر اسکی تاریخ دیکھی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ اصطلاح مغرب میں عیسوی دور کے ازمنہ وسطیٰ میں کلیسا اور بادشاہ کے خلاف بغاوت کے نتیجے میں اُبھری۔ عیسوی دور کے اس تقریباً ہزار سالہ دورانیے میں کلیسا اور بادشاہ کو عقلِ کُل اور حرفِ آخر کی حیثیت حاصل تھی۔ان کے منہ سے نکلی ہوئی بات پتھر پر لکیر سمجھی جاتی تھی۔ یہ اپنے آپ کو اُلوہی کارندے سمجھ رہے تھے۔ ان حضرات کی حکم عدولی خُدا کی حکم عدولی سمجھی جاتی تھی۔ مذہب اور ایوانِ اقتدار تک عوام الناس کی رسائی ناممکن تھی۔ عام لوگوں کو دوسرے درجے کی شہریت حاصل تھی اس ظلم وعدوان کے خلاف لبرلزم کا فلسفہ وجود میں

آیا جو کہ انسان کو برابری کی بنیاد پر دیکھنے اور فیصلے کرنے کا حامی تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہر انسان کو اظہار رائے کی بھی آزادی ہو اور مذہبی علوم اور ایوانِ اقتدار تک پہنچنے کی بھی آزادی ہو۔ اب اصولاً تو یہ بات سو فیصد درست ہے لیکن بعض حضرات اسکا اطلاق غلط کر دیتے ہیں یہ لوگ اس کا مطلب غلطی سے یوں سمجھ لیتے ہیں کہ انسان ہر ایک قید و بند سے آزاد ہے حالانکہ حقیقت میں انسان کائنات کے پل پل سے، ذرے ذرے سے جُڑا ہوا ہے۔ اس غلط اطلاق کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے جو ابھی ہمارے سامنے پیش آیا۔ کیف نے فقیر بابا کے مذہب پر تنقید کی کہ وہ کیوں مذہب کو مان رہا ہے۔ کیوں وہ اپنے اوپر مذہب کی حکومت قبول کرتا ہے۔ اسکو مذہب سے آزاد ہونا چاہیئے۔ اس کو لبرل ہونا چاہیئے، اسے ہر قید و بند سے آزاد ہونا چاہیئے۔ جبکہ لبرلزم کا ہرگز یہ مطلب نہیں۔ لبرلزم کا مطلب یہ ہے کہ ہر کوئی اپنے فیصلے میں آزاد ہے کہ وہ اپنے لئے کونسا مذہب پسند کرے یا نہ کرے۔ فقیر بابا اس فیصلے میں مکمل طور پر آزاد اور خود مختار ہے کہ وہ اپنے لئے کونسا مذہب اختیار کرتا ہے اور کونسا نہیں۔ اس کا دارو مدار اس کی اپنی مرضی پر ہے جس طرح کیف اپنے فیصلے میں آزاد اور خود مختار ہے کہ اس نے اپنے لئے الحاد کو بطور مذہب پسند کیا ہے اسطرح فقیر بابا نے اسلام کو اپنے لئے مذہب پسند کیا ہے جس طرح کیف کے اس حق سے کوئی انکار نہیں کر سکتا اس طرح فقیر بابا سمیت کسی سے بھی یہ حق نہیں چھینا جا سکتا۔

عُویم بڑی تفصیل کے ساتھ لبرلزم پر گفتگو کئے جا رہا تھا اور سب دوست بڑی خاموشی اور انہماک کے ساتھ سن رہے تھے کہ اچانک کیف بیچ میں کُود پڑا اور قدرے تُرش لہجے میں گویا ہوا۔

الحاد مذہب نہیں، بلکہ مذہب بیزاری ہے۔

عُویم ہنس پڑا اور بولا۔ مجھے پتہ تھا کہ آپ ایسا ہی کہیں گے اسلئے قصداً میں نے الحاد کو مذہب بولا۔ ویسے جب مذہب نہیں ہے تو اس کی تبلیغ کیوں کرتے ہو؟

ٹھیک ہے نہیں ہے مذہب، لیکن یہ بتاو کہ آج کل آپ کیوں اس راستے پر چل نکلے ہو اور مذہب سے کیوں متنفر ہونے لگے ہو۔

کیف نے جواب دینے کی بجائے براہِ راست عُویم سے اسکا مذہب پوچھ لیا، عُویم نے ابھی تک زبان ہی نہیں کھولی تھی کہ بیچ میں فردان حواس باختہ ہو کر متحیر انداز میں عُویم کی طرف دیکھتے ہوئے بول پڑا۔

کیا۔۔۔۔ عُویم اور مذہب بیزاری۔

کیا نہیں۔۔۔۔ہاں۔۔۔۔ آکاش نے جواب دیا۔

میرا ماجرا الگ ہے۔ عُویم نے مختصراً جواب دیا۔

نہیں۔۔۔۔ نہیں بتاؤ۔۔۔ کیا واقعہ ہے۔

فردان ضد کرنے لگا۔

آج کے لئے اتنی باتیں کافی ہیں، ہونٹ بھی تھک گئے اور گلہ بھی خشک ہو رہا ہے۔ مزید باتیں کرنے سے ہونٹ مزید خشک ہوجائینگے اور اس وقت لپس کئیر (Lips Care) بھی نہیں میرے پاس۔ لہٰذا یہ کہانی پھر سہی۔ عُویم نے پہلُو تہی کرتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

اوئے ہوئے اتنی نازک مزاجی۔ آکاش نے طنز کر دیا۔

اسی دوران ویٹر (Waiter) کھانا بھی لے آیا۔ چاروں دوست کھانا کھانے لگ گئے کہ اچانک عُویم کا فون بجا۔

جی اماں جی!۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔ہاں۔۔۔بس آ تا ہوں۔ آدھے گھنٹے میں پہنچتا ہوں۔ یہی شہر ہی میں ہوں کہیں باہر نہیں گیا ہوں۔ آپ سو جائیں، میں گھر پہنچنے پر مطلع کر دوں گا۔

اللہ حافظ!

بابِ ششم

اِظہارِ تشویش

صبح کو عُویم ابھی یونیورسٹی پہنچا ہی نہ تھا کہ فردان بے چینی سے کار پارکنگ میں اسکا انتظار کر رہا تھا۔ عُویم کی گاڑی دیکھتے ہی فردان فوراً چوکنا ہو گیا اور گاڑی کی طرف روانہ ہو گیا۔اسی دوران اس نے گاڑی پارک کر کے پچھلی سیٹ سے کتابیں اٹھانے والا تھا کہ فردان نے پہنچ کر سلام کیا۔

وعلیکم السّلام۔۔۔ارے فردان!ادھر کیا کر رہا ہے۔باقی دوست کہاں ہیں؟

فردان کو دیکھ کر عُویم کی نے خلافِ توقع اسکی یہاں موجودگی اورانتظار کی وجہ دریافت کی۔ فردان کے چہرے پر پریشانی کے گہرے اثرات لرزاں تھے۔

کیوں بھائی!پریشان لگ رہے ہو۔۔خیریت۔۔

خیریت ہے۔بس آپ سے اکیلے میں کچھ کہنا تھا۔فردان نے جواب دیا۔

عُویم نے حیرت سے لرزاں نظروں میں فردان کی طرف دیکھااور مسکرا کر کہا۔

ضرور۔۔۔کیوں نہیں۔۔۔دوستوں نے خفا کیا ہے، گھر میں کوئی مسئلہ ہے، پیسوں کی ضرورت ہے۔جلدی اپنی پریشانی بتاؤ۔۔۔اتنا انتظار کہاں ہوتا ہے مجھ سے۔

نہیں۔۔۔نہیں۔۔۔ایسی کوئی بات نہیں۔

فردان نے مصنوعی مسکراہٹ گالوں پر بکھیرتے ہوئے جواب دیا۔

ٹھیک ہے ادھر بیٹھتے ہیں گاڑی میں یا کلاس روم تک چل کر بات کرتے ہیں۔

عُویم نے اسکی رائے لینی چاہی۔

وہاں لان (Lawn) میں تھوڑی دیر کے لئے بیٹھتے ہیں۔ فردان نے کہا۔

عُویم نے اسکے شانے کو دبایا اور سرَ کے اشارے سے لان کی طرف چلنے کا کہا۔ بیٹھتے ہی عُویم نے بے صبری سے فردان سے معمہ دریافت کرنا چاہا۔

جی بھائی۔۔۔۔۔۔بولئے۔۔۔۔۔۔کیا بات ہے؟

مجھے کل کی بات کھائے جا رہی ہے۔ کل شام کھانے پر کیف نے آپکی مذہب بیزاری پر جو کہا وہ مجھے بالکل اچھا نہیں لگا۔ پوری رات یہی سوچتا رہا کہ عُویم جیسا مذہبی شخص اور اس پر کیف کا یہ تبصرہ۔۔۔یہ بالکل ایک دوسرے کی ضد ہے اب جلدی جلدی اور دوٹوک لفظوں میں بتائیں کہ کیف اور آکاش کی کہی ہوئی باتیں سب جھوٹ ہے، افتراء ہے۔ میں آپ جیسے دوست کو اس تاریکی میں دَھکے مارتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ آپ کی حساسیت اور نازک مزاجی سے میں خوب واقف ہوں۔ یہ دوزخ کی آگ آپ کے سہنے کے قابل بالکل بھی نہیں۔ ویسے اللہ تعالیٰ معاف کرے وہ آگ کسی بھی انسان کے سہنے کی نہیں۔ لیکن آپ کے تو بالکل نہیں۔

فردان ہلکا سا رُکنے کے بعد دوبارہ بول پڑا۔ آپ نے مشاہدہ کیا ہو گا کہ یہ الحاد کی وبا آجکل ہاسٹلوں میں کافی جڑ پکڑ رہی ہے جس بھی کمرے میں جانا ہو مذہب بیزار طلباء سے سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پتہ نہیں ہم انسانوں کو کیا ہو گیا ہے اور خاص کر ہم ہاسٹل کے طلباء کو کہ اپنے رب کو ناراض کرنے پر تُل گئے ہیں۔ میں یہ بالکل گوارا نہیں کر سکتا کہ آپ اس میں اور اضافہ کریں۔

فردان کی آواز وفورِ جوش و اضطراب سے مرتعش تھی۔ اس نے اپنی پریشانی کو عُویم کے سامنے لفظوں کا جامہ پہنا دیا۔

عُویم بالکل خاموش رہا اور زمین پر اپنی نگاہیں گاڑے ہوئے تھا فردان بھی اپنی بات ختم کر کے خاموش رہا اور عُویم کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑے عرصے بعد عُویم نے

بولنا شروع کر دیا۔ مجھے نہیں پتہ کہ الحاد کیا بلا ہے لیکن مجھے خدا کہیں نظر نہیں آ رہا۔ مجھے اس کی سمجھ نہیں آ رہی تو میں کیا کروں۔ میں اپنی اس عقل کو کیا جواب دوں یہ تو پوچھتی رہتی ہے بلکہ کوستی رہتی ہے۔ دن میں دسیوں، بیسیوں مرتبہ مجھے للکارتی رہتی ہے اور میں بغلیں جھانکنے لگتا ہوں۔۔۔۔ کیا کروں میں۔۔۔۔۔ آپ ہی بتا دیں۔۔۔

عُویم کی آواز میں گہری سنجیدگی تھی اور آہستہ آہستہ کلام کر رہا تھا جیسے الفاظ اور فقرے ڈھونڈ رہا ہو۔ ہر فقرے کے اختتام پر ہلکا سا وقفہ بھی لیتا رہا اس کی کوشش یہی تھی کہ کم سے کم الفاظ میں اپنی بات ختم کرے کیونکہ وہ گفتگو کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتا تھا۔

کب سے یہ مسئلہ درپیش ہے آپکو؟ فردان بوجھل لہجے میں بولا۔

پلیز فردان! چھوڑو یہ باتیں، اس سے کچھ نہیں ہونے والا۔ چلو چلتے ہیں۔ آکاش اور کیف انتظار کر رہے ہونگے۔

عُویم پر تشویش لہجے میں بولا کیونکہ وہ گفتگو ختم کرنا چاہتا تھا۔

کوئی انتظار نہیں کر رہا۔ میرے لئے اس مسئلے سے اہم کوئی چیز نہیں۔

فردان نے قدرے سخت اور تیز آواز میں کہہ دیا۔

وہ ضد کرنے لگا اور اپنا حق جتانے لگا، اسی دوران فردان نے عُویم کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اس سے عُویم کا موبائل فون نکال کے فلائٹ موڈ پہ لگا دیا تاکہ سگنلز بند ہو، اس کا اپنا موبائل پہلے ہی سے فلائیٹ موڈ پہ تھا۔

عُویم ہلکا سا مسکرایا اور کہا۔۔ اتنی دلچسپی ہے تو عرض کئے دیتا ہوں۔

یہ آج یا کل کی بات نہیں، مہینے گزر گئے اور شاید آپکو پتہ ہو یا نہ ہو میں اپنے مسئلے اپنے پاس رکھتا ہوں کیوں اپنے مسئلوں سے کسی اور کا سَر کھپاؤں؟۔

ہاں، ہاں۔ مجھے پتہ ہے اور یہی سب سے بڑی مصیبت ہے آپکی۔

فردان نے دخل دیا۔

عُویم نے گفتگو جاری رکھی۔

آپ جانتے ہو مجھے کہ میں کتنا مذہبی بندہ تھا ہر وقت کوشش رہتی تھی کہ عبادات اور مذہبی سرگرمیوں میں بھرپور شرکت کروں، دل لگا کر عبادات کیا کرتا تھا ان عبادات کے ساتھ اپنے ربّ سے دعا بھی مانگتا رہتا تھا کیونکہ یہ دونوں آپس میں لازم وملزوم ہیں اور ساتھ میں دعا انسانی ضرورت بھی ہے لیکن مجھے اس وقت انتہائی مایوسی ہو جاتی تھی جب میری دعا رد ہو جاتی تھی۔ شروع شروع میں تو اِسے اپنے خالق کی تدبیر اور اپنی تقدیر پر محمول کر کے خود کو تسکین دے دیتا۔ لیکن کہاں تک اور کب تک چلتیں یہ جھوٹی تسلّیاں۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ جب کسی عمل کا کوئی نتیجہ ہی نہیں نکل رہا تو کیوں اس عمل کے پیچھے اپنی توانائی ضائع کروں۔ وہ عمل ہی بیکار ہے۔ اس لئے آہستہ آہستہ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ یہ عبادات اور دعائیں وہم وگماں کے جھانسے میں آنا ہے اور کچھ نہیں۔ لہٰذا میرا وہ اشتیاق دن بدن گھٹنے لگا پھر ایک وقت آیا جب میں صرف نماز پڑھا کرتا تھا اور روزہ رکھا کرتا تھا وہ بھی صرف رسمی رواج سمجھ کر۔ نہ کوئی دُعا مانگتا نہ التجا نہ گڑگڑانا، بس صرف فرض نماز ادا کی اور چلتا بنا۔ یہ بھی اس لئے کہ اسے فرض کا نام دیا گیا تھا۔ جب کچھ زیادہ معاوضہ نہیں مل رہا تو زیادہ محنت کیوں کروں؟ پھر آہستہ آہستہ یہ عادت بھی مٹتی گئی کیونکہ زندگی کے غم وحُزن اور مشاہدات نے اور سوالات کھڑے کر دیئے اور آہستہ آہستہ یوں لگنے لگا جیسے کوئی برتر ہستی موجود ہی نہیں، ہم خود اپنے آپ سے ہیں۔

عُویم بوجھل اور پُر تشویش لہجے میں بول رہا تھا اور اپنی نظریں دور آسمان پر گاڑے ہوئے تھیں کہ فردان کی طرف سے "اَستغفر اللہ" سن کر خاموش ہو گیا۔

پلیز عُویم! ایسا نہ کہو، تمہیں ضرور غلط فہمی لگی ہوئی ہے۔

فردان نے عُویم کا ہاتھ پکڑ کر التماس بھرے لہجے میں کہا۔

عُویم خاموش رہا۔ کچھ وقفے کی خاموشی کے بعد فردان نے خود ہی سکوت ختم کر دیا اور گویا ہوا۔

اچھا! اور کیا کیا سوالات ہیں؟

عُویم ہلکا سا مسکرایا اور خاموش رہا۔ منہ سے کچھ پھوٹو تو سہی، گونگے کا گُڑ کھالیا کیا؟ فردان نے تنبیہ کی۔ اسکے لہجے میں ناراضگی کے ساتھ ساتھ ہلکا سا غصہ بھی شامل تھا۔

کیا کوئی اپنی مخلوق کو اتنی پریشانی، مایوسی، الم، کوفت، دُکھ، ملال، درد، رنج و غم دے سکتا ہے۔ دنیا ان تمام کا بسیرا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنے میں کیا حرج ہے کہ اوپر کوئی نہیں ہے، اور اگر ہے۔۔۔ اگر ہے تو غیر فعال ہے۔

عُویم نے "اگر ہے" پر زور دے کر کہا۔۔

کس طرح غیر فعال ہے۔ فردان نے سخت زبان میں استفہام کیا۔

عُویم مسکرایا اور دوبارہ شروع ہو گیا۔

آپ نے کبھی مشاہدہ کیا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ برائی بڑھتی جاتی ہے۔ انسان کے معلوم تاریخ کا مطالعہ کرو تو یہ نتیجہ نکلوانا کوئی مشکل نہیں کہ موجودہ انسانی معاشرہ آج سے سو، دوسو یا ہزار برس پہلے کے مقابلے میں زیادہ بُرا اور بدکار ہے۔ پتہ ہے یہ کس چیز پر دلالت کرتی ہے؟۔۔۔ یہ اِسی ایک ہی نکتے پر دلالت کرتی ہے کہ برائی غالب ہے اور اچھائی مغلوب۔ برائی زیادہ طاقتور ہے اچھائی کے مقابلے میں۔ اسی اچھائی اور برائی کی طاقت کو ایک مثال سے سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔

آپ نے غور کیا ہو گا کہ انسان جب کوئی بُرا عمل کرنے لگتا ہے تو اسکے لئے ایسے نت نئے طریقے نکال بیٹھتا ہے کہ انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ آئے روز چوری، بدکاری، سود، قتل وغیرہ کے واردات دیکھو۔ مجرم اس انداز میں جرم کا ارتکاب کرتا ہے جیسے کوئی سائنسدان لیبارٹری میں تحقیق کر رہا ہو۔ عقل و فہم کو پوری طرح مرتکز کرکے برائی

سر انجام دی جاتی ہے اس دوران اس کی ساری تخلیقی قوتیں کارآمد آتی ہیں۔ ان واقعات کو اخبارات میں پڑھتے ہوئے بندہ انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ اور ان مجرموں کی عقل و فہم پر رشک آنے لگتا ہیں۔ بندہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ کاش یہ تخلیقی ذہن کہیں انسانی فلاح میں استعمال ہو جاتی تو انسانیت سنور جاتی، لیکن نہیں۔ یہ تخلیقی اور ذہنی صلاحیت برائی کے کاموں میں ہی فعال رہتی ہے، اچھائی میں نہیں۔ برائی کے برعکس اچھائی میں یہ تخلیق کہیں کارآمد نظر نہیں آتی۔ کیا کبھی کسی نے انسانیت کی فلاح کے لئے کوئی ایسی منصوبہ بندی کی ہے جس سے اس کی عقل کا بول بالا ہو؟ ہرگز نہیں۔

اس تمام گفتگو کا نچوڑ ایک ہی فقرے پر آکر ٹک جاتی ہے کہ اہرمنی طاقت زیادہ کھُل کر پرفارم (Perform) کر رہی ہے بمقابلہ یزدانی طاقت کے۔

اور یا تو اہرمنی طاقت زیادہ طاقتور ہے یزدانی طاقت کے مقابلے میں۔

عُویم نے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا اور ہلکے سے وقفے کے بعد دوبارہ اپنی بات جاری رکھی۔ فردان بالکل خاموشی کے ساتھ ہمہ تن گوش تھا اور افسردگی کے ساتھ ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھے بیٹھا تھا۔

آپ کو پتہ ہونا چاہیئے فردان! کہ مذہب کا پورا زور یزدانی طاقت پر ہے، اچھائی پر ہے۔ اہرمنی طاقت کے خلاف جنگ پر ہے۔ برائی کا قلع قمع کرنے پر ہے۔ اب آپ ہی بتائیں مجھے، میں کیا کروں؟

عُویم نے بیزار اور مایوس لہجے میں گفتگو ختم کی۔

اور کچھ۔۔۔۔۔۔ فردان نے مختصراً کہا۔

ہاں۔۔۔۔۔۔ اب آتے ہیں سائنس اور علت و معلول کی بحث میں۔ اور اس کے ساتھ منسلک ابتدائے کائنات بھی۔

عُویم اپنے اس اگلے موضوع پر گفتگو کے لئے تیار ہی ہو رہا تھا کہ دونوں دوستوں نے پیچھے سے کیف کی آواز سنی۔

وہ رہے دونوں۔۔۔۔۔۔ ادھر بیٹھے ہیں۔

کیف اور آکاش کو دیکھتے ہی فردان چوکنا ہو گیا اور اپنے تیور اورانداز بدلنے کی بھرپور کوشش کرنے لگا۔

عُویم۔۔۔۔بس۔۔۔بس، پلیز ان کے سامنے یہ گفتگو نہ کرنا۔۔۔۔

فردان نے التماسانہ انداز میں چپکے سے کہا۔ کیف اور آکاش کی دخل اِندازی نے فردان کو بہت حد تک مضطرب کیا۔ جبکہ عُویم بغیر کسی تغیّر کے اپنی دنیا میں گُم حالات و واقعات اوراپنے احساسات کا تماشہ کر رہا تھا۔

اسی دوران کیف اور آکاش پہنچ گئے۔

کدھر تھے یار۔۔۔۔۔ میکینکس(Mechanics) کی کلاس بھی مِس کی دونوں نے۔۔۔۔ ادھر بیٹھے غسلِ آفتابی کر رہے ہو۔ واہ سلام ہو تم دونوں پر۔ اور دونوں کا موبائل فون بھی نہیں لگ رہا۔

آکاش نے پہنچتے ہی تبصرہ کیا۔

وہ۔۔۔شاید۔۔۔۔فون میں کچھ مسئلہ ہوا ہو گا۔ فردان کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

عُویم نے مسکراتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں فردان کو جھوٹ بولنے پر سرزنش کی۔ جبکہ دوسری طرف فردان کا جھوٹ بھی بالکل بچگانہ تھا جس کی کوئی تُک نہیں بن رہی تھی۔ کیونکہ اس میں عُجلت اوراناڑی پن شامل تھا۔

ویسے اچھا ہے کہ موبائل فون نہیں لگ رہا اور اس سے بھی کتنا اچھا ہو گا کہ اس کا وجود ہی مِٹ جائے۔ اس نے تو جھوٹ کی بھرمار کر دی ہے۔ برائی کو اگر بندہ برائی سمجھ کر کرے تو ضمیر سرزنش اور ملامت کر کر کے احساس دلاتا رہتا ہے اور پلٹنے اور سنبھلنے کے مواقع ملتے

رہتے ہیں لیکن جب برائی برائی نہ لگے تو یہ عادت بن جاتی ہے اور یہی حال ہمارا ہو چکا ہے۔ جھوٹ ہماری عادت بن گئی ہے اور موجودہ دور میں اس کارِ شَر میں بڑا حصہ موبائل فون کا بھی ہے۔

عُویم نے متفکرانہ تجزیہ کیا۔

ہاں۔۔۔۔۔ہاں۔۔۔اسی وجہ سے تو اکثر آپکا موبائل فون بند رہتا ہے اور اگر آن بھی ہو تو اٹھاتے کہاں ہو، ہاں مگر شاذ و نادر۔

آکاش نے طنزاً کہا۔

آکاش کے تبصرے پر عُویم مسکرایا۔

یہ بھی ہے لیکن مجھے اپنی تنہائی سے بھی محظوظ ہونا ہوتا ہے۔ خود سے باتیں کرنا، خُود میں ڈوبے رہنا، خود ہی سوال خود ہی جواب، پھر خود ہی رونا، خود ہی ہنسنا۔ اپنے ضمیر سے گفتگو کا اپنا الگ ہی مزہ ہے۔ یہ کبھی کبھی کوس رہا ہوتا ہے اور باعث شرمندگی آپ آنکھیں اٹھا کر دیکھ بھی نہیں سکتے۔ اور کبھی کبھی داد دے رہا ہوتا ہے۔ اور آپکو تھپکی بھی محسوس کرنے دیتا ہے یعنی گالیاں بھی دیتا ہے اور تسلیاں بھی۔

خود کلامی میں کتنی وحشت ہے
کوئی دشمن ہو رُوبرُو جیسے

ہلکے سے وقفے کے بعد عُویم نے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

ہزاروں کائناتیں لے کے گھوم رہا ہوں اس سینے میں۔

اچھا۔۔۔اچھا۔۔ ٹھیک ہے لیکن یہ بتاؤ کہ کلاس کیوں مِس کی۔ اٹینڈنس شارٹیج (Attendance Shortage) میں آگئے تو کیا کرو گے۔

کیف نے پوچھا۔۔۔یار مجھے یونیورسٹی لیول پر اس اٹینڈنس کی سمجھ نہیں آتی۔ یونیورسٹی لیول ایک میچور لیول (Mature Level) ہوتا ہے۔ ہر طالب علم اپنی اچھائی اور

برائی اچھی طرح سمجھتا ہے اس لیول پر اٹینڈنس چہ معنی دارد؟ اگر ایک طالب علم استاد کی مدد لئے بغیر پاس ہو سکتا ہے تو اس میں استاد کو کیا اعتراض ہونا چاہیئے۔ عُویم نے اپنی رائے پیش کی۔

کچھ وقفے کے لئے سب دوست اس تبصرے پر حیرت سے لرزاں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے اور پھر ایک زوردار قہقہہ لگا۔۔۔

بالکل۔۔۔۔۔ صحیح کہا آپ نے۔

باب ہفتم

ارسالِ اِرتسام

ماں جی! سروش کدھر ہے؟ السلام علیکم۔

وعلیکم السلام بیٹا! ارے یہ تو زُنیرہ آگئی۔ خیریت تو ہے بیٹا کیوں آج تو فون ہی نہیں کیا۔ پی ٹی سی ایل خراب ہے کیا یا ہماری لائن خراب ہو گئی ہے۔

نہیں ماں جی! پی ٹی سی ایل ٹھیک ہے بس طبیعت آج صبح سے بوجھل سی تھی۔ ابھی ابو اس طرف آرہے تھے سوچا میں بھی سروش سے مل لوں گی کچھ وقت گزار لوں گی۔ ابو نے یہاں پر ڈراپ کیا واپسی پر پک کر لیں گے۔

تو ابو کو بھی یہاں سے کچھ چائے پانی کروالیتی، کیوں اسی طرح رخصت کیا۔

سروش کی ماں نے زُنیرہ کو ٹی وی لاؤنج میں بٹھاتے ہوئے کہا۔

بس خیر ہے ماں جی! کوئی بات نہیں۔ گھر ہی سے تو آرہے ہیں۔ سروش کدھر ہے؟

زُنیرہ نے دوبارہ سروش کے بارے میں پوچھا۔

کیوں ہم کچھ نہیں لگ رہے آپ کے، جو بار بار اپنی دوست کا پوچھ رہی ہو۔

نہیں نہیں نہیں۔۔۔ ایسی بات نہیں۔ زُنیرہ نے مسکرا کر اپنے منہ کو ہاتھ سے چھُپاتے ہوئے کہا، اصل میں اسے سرپرائز دینا چاہتی ہوں۔

اچھا بیٹا! وہ اوپر کمرے میں ہے آپ جائیں میں چائے لے کر آتی ہوں۔

میں آئی کم اِن میڈم (May I come in Madam)

زُنیرہ نے آہستہ سے سروش کے کمرے کا دروازہ کھولا اور جھانکتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

آیئے آیئے۔۔۔ زُنیرہ آپ یہاں۔۔۔ سروش زُنیرہ کا منہ تکنے لگی۔ کیسے آنا ہوا۔ ایسی اچانک، خیریت تو ہے۔ سروش نے بڑی لگن کے ساتھ زُنیرہ کو سلام کیا اور خوش آمدید کہا۔

یہ کیا پڑھ رہی ہو سروش! زُنیرہ نے سروش کے بیڈ سے کتاب اٹھاتے ہوئے دریافت کرنا چاہا۔

واہ، دیوانِ غالب۔۔۔۔۔۔ شاعری اور وہ بھی اتنی مشکل۔

زُنیرہ نے کتاب اٹھائی اور جہاں کتاب کے بیچ میں پین پڑا ہوا تھا اسی صفحے کو کھول کر پڑھنے لگی۔

دیکھنا قسمت کہ ، آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں ، بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

ہاتھ دھو دل سے ، یہی گرمی گر اندیشے میں ہے
آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

شوق کو یہ لَت کہ ہر دم نالہ کھینچے جایئے
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

دور چشم بد ، تری بزم طرب سے ، واہ واہ !
نغمہ ہو جاتا ہے واں گر نالہ میرا جائے ہے

گرچہ ہے طرز تغافل ، پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ ، وہ پا جائے ہے

نقش کو اس کے مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں
کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کِھچتا جائے ہے

سایہ میرا ، مجھ سے مِثل دُود بھاگے ہے اسدؔ
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

غالب کے اشعار سے زیادہ تو صفحے پر تمہاری لکھائی ہے۔
زُنیرہ نے آہستہ آہستہ ،رُک رُک کے غزل پوری کرتے ہوئے تبصرہ کیا۔
سروش خاموش رہی۔
لیکن اچھا ہے کہ آپ نے یہ تشریح و توضیح کی ہوئی ہے اور حاشیے چڑھائے ہیں ورنہ میرے لیے تو اس غزل کو سمجھنا مشکل ہو جاتا۔
زُنیرہ نے اپنے سوال کا خود ہی جواب دے دیا۔
آپ مجھ سے ملنے آئی ہے یا کتاب پڑھنے آئی ہو؟
سروش نے زُنیرہ کے ہاتھ سے کتاب چھینتے ہوئے کہا۔
کیا میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ غالب کی یہ غزل آپ کے حال کی ترجمان ہے۔
زُنیرہ آنکھیں چُرا کر دیکھتے ہوئے بولی۔
آپ کی مرضی۔۔۔۔۔جو کہنا ہے کہہ سکتی ہو۔
سروش نے قہقہہ لگا کے جواب دیا۔

ہاں ہاں۔۔۔۔ مجھے پتہ تھا کہ آپ یہی کہیں گے آج تک آپ کے مزاج کو کسی نے صحیح طور پر سمجھا ہے کیا جو آج میں ناکام کوشش کر رہی ہوں۔

زُنیرہ تیز نظروں سے گھُورتے ہوئے بولی۔

دونوں سہیلیاں آپس میں باتیں کر رہی تھی کہ اس دوران سروش کی ماں چائے لے کر سروش کے کمرے میں آگئی۔ سروش نے آگے بڑھ کر ماں سے طباق(Tray)لے لی اور میز پر رکھ دی۔ اِس دوران زُنیرہ بھی ادب کی خاطر کھڑی ہو گئی۔ جب تک ماں جی کمرے میں موجود رہی تب تک دونوں سہیلیاں کھڑی رہی۔

ارے بیٹھیئے، میں تو جا رہی ہوں۔

ماں جی نے اشارے کے ساتھ زُنیرہ کو بیٹھنے کا کہا۔

ماں واپسی کے لیے دروازے کی طرف مُڑی ہی تھی کہ دوبارہ سروش کی طرف متوجہ ہو کر پیار سے پُوچھا۔

سروش!اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟اور ہاں صحن میں گھُوم پھِر لیں؟

ہاں، اور اب میں بالکل ٹھیک ہوں ماں جی۔

ٹھیک ہے بیٹا! یہ کہتے ہوئے ماں نے دروازہ بند کر دیا اور چلی گئی۔

ماں کے چلے جانے کے بعد زُنیرہ سروش کی طرف متوجہ ہوئی اور حیرت سے لرزاں نظروں سے دیکھنے لگی کیوں سروش، کیا ہوا ہے تجھے، خیریت تو ہے وہ جلدی جلدی بولنے لگی اور اسی دوران اپنا ہاتھ سروش کے ماتھے پر رکھ کر ٹمپریچر بھی چیک کرنے لگی۔

ارے یار! کچھ نہیں ہوا ہے مجھے، میں بالکل ٹھیک ہوں، سروش زُنیرہ سے ہٹتے ہوئے اور چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے بول پڑی۔

تو ماں کیوں کہہ رہی تھی؟

ہاں۔۔۔وہ۔۔۔ہوتا ہے کبھی کبھی، بے وجہ اداسی چھا جاتی ہے انسان پر، لیکن یہ تو نارمل بات ہے۔

سروش نے نِچلے ہونٹ کو دانتوں میں دباتے ہوئے رک رک کر جواب دیا۔

کچھ تو وجہ ہوگی اِس اُداسی کی۔ جب کوئی مسئلہ ہی درپیش نہیں تو یہ اداسی کیوں؟ کہاں سے آتی ہیں یہ اُداسیاں۔

زُنیرہ معلومات حاصل کرنے لگ گئی۔

یہ تو مجھے بھی نہیں پتہ کہ کہاں سے آتی ہیں یہ بے وجہ اداسیاں، کیا وجہ ہو سکتی ہے اس کا مکمل علم تو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے لیکن میری دانست میں اس کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایک وجہ انسان کے جسم سے نکلنے والی لہریں ہیں جو کہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ہر انسان کے جسم سے مخصوص اور غیر مرئی لہریں نکلتی ہیں جو انسان کے تاثیر کا سبب بنتی ہیں۔ ان لہروں کی دنیا اوراس کے اثرات کو دنیائے اثیریا کاسمیک ورلڈ یا اسٹرل ورلڈ کہا جاتا ہے۔اس اسٹرل ورلڈ کو آپ مثالوں سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ آپ نے مشاہدہ کیا ہوگا کہ کبھی کبھی کوئی بالکل ہی اجنبی شخص بغیر کسی وجہ کے آپ کے دل میں جگہ کر جاتا ہے اورآپ کو اچھا لگنے لگتا ہے اسی طرح کبھی کبھی کوئی اجنبی شخص بغیر کسی وجہ کے بُرا لگنے لگتاہے اور کراہت سی محسوس ہونے لگتی ہے حالانکہ زندگی بھر نہ کبھی ان اشخاص سے ملاقات ہوئی ہوتی ہے نہ دور کا کوئی واسطہ ہوتا ہے پھر بھی ان کے باوجود ان سے محبت یا نفرت کا ایک تعلق سا بن جاتا ہے اس کی وجہ یہی اثیری دنیا ہے۔ ایک انسان کے جسم سے نکلنے والی لہریں جب دوسرے انسان کے جسم سے نکلنے والی لہروں سے مطابقت پیدا کرتی ہے تو محبت کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔ فزکس کی زبان میں اس مظہر کو ہم Constructive Interference سے تعبیر کر سکتے ہیں حالانکہ فزکس کی دنیا میں یہ مظہر حواسِ خمسہ سے محسوس کیا جا سکتا ہے لیکن اثیری دنیا چونکہ غیر مرئی دنیا ہے اس لیے یہاں ان محسوسات کا

تصور نہیں پایا جاتا۔ اس کے برعکس جب دو انسانوں کے اجسام سے نکلنے والی لہریں مطابقت پیدا کرنے میں ناکام ہو جاتی ہیں تو کراہت یا نفرت وجود پذیر ہوتی ہے فزکس کی زبان میں اس مظہر کو Destructive Interference سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اس کی دوسری مثال ماں اور بچے کا سچا تعلق ہے اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ چھوٹا بچہ ماں سے دُور رو رہا ہوتا ہے۔ماں تک اس کی آواز بھی نہیں پہنچ رہی ہوتی ہے لیکن پھر بھی ماں کو فوراً احساس ہو جاتا ہے اور ماں تڑپ اٹھتی ہے اور بیٹے تک بھاگ بھاگ کے پہنچ جاتی ہے یہ احساس ماں تک کون پہنچاتا ہے یہ تڑپ اپنے بچے کی آواز کو سنے بغیر ماں کے سینے میں کون پیدا کرتا ہے۔۔۔ یہی اثیری دنیا۔۔۔ اب جتنا ان لہروں میں شدت ہو گی اثر اُتنا ہی زیادہ ہو گا۔

سروش تسلسل کے ساتھ اپنی گفتگو پر قابو کئے ہوئے تھی اور زُنیرہ ہمہ تن گوش بنی بیٹھی تھی۔

اب آتے ہیں دوسری وجہ کی طرف۔۔۔۔۔۔ دوسری وجہ زیادہ دلچسپ اور پر کشش ہے۔ قرآنِ کریم کے مطابق جب ہم سو جاتے ہیں تو ہماری روح پرواز کر جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس روح پر اگر موت کا فیصلہ صادر ہو جاتا ہے تو یہ مادی جسم میں دوبارہ نہیں پلٹتی لیکن اگر موت کا فیصلہ صادر نہ ہو تو ایک مخصوص مدت کے لیے یہ روح دوبارہ پلٹا دی جاتی ہے اب جب یہ روح پرواز کر جاتی ہے تو ہمیں اس کی کچھ خبر نہیں رہتی اور سوتے ہوئے ہم دنیا و مافیہا سے بے خبر رہتے ہیں۔ ہمیں حالتِ نیند میں اپنی روح کی نہ کوئی خبر ہوتی ہے اور نہ اس پر قابو کہ یہ روح ہمارے مادی جسم سے الگ ہو کر کہاں تک پرواز کرتی ہے؟ کہاں رُکتی ہے؟ کس سے ملتی ہے؟ کیا کچھ حاصل کرتی ہے؟ کیا کچھ مشاہدہ کرتی ہے؟ اس کا ہمیں کچھ علم نہیں کیونکہ یہ جاننا ہمارے علم کے حدود سے باہر ہے۔ ہم صرف ممکنات کی دنیا میں خیالات کے گھوڑے دوڑا سکتے ہیں وہ یہ کہ اسی دوران اور بھی ارواح ہو سکتی ہیں جو پرواز کر

رہی ہونگی۔ تو ہو سکتا ہے کہ ایک روح کی مختلف ارواح سے ملاقات ہو۔ وہاں ان کے تعلقات ہوں، ان کی الگ الگ دنیائیں ہو، جس طرح ہماری یہ مادی دنیا ہے۔ ان ارواح میں یہ بھی ممکن ہے کہ صرف سونے والوں کی ارواح شامل نہ ہو بلکہ مادی دنیا سے مستقل طور پر رخصت ہونے والوں کی ارواح بھی شامل ہو اور ہر ایک سے ملاقات کے مواقع ملتے ہو۔ لہٰذا ہم جب اُٹھتے ہیں اور روح واپس جسم میں آجاتی ہے نئی ملاقاتوں کی تاثیر اور مشاہدات لیکر۔ تو یہ ممکن ہے کہ یہ روح جسم پر خوش کن یا پریشان کن اثرات مرتب کریں کیونکہ یہ ایک مُسلّمہ حقیقت ہے کہ روح کا جسم پر اثر ہوتا ہے۔ یہی وہ اثر ہے جس کا نتیجہ ہم جاگنے پر محسوس کرتے ہیں۔

سروش کی گفتگو جاری تھی کہ زُنیرہ بیچ میں بول پڑی۔

تو آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ آپ کی روح نے کل رات غالبؔ کی روح سے ملاقات کی ہے؟

ہو سکتا ہے اور نہیں بھی۔۔۔۔۔ لیکن اس سے بڑھ کر میرا گمان ہے کہ یہ ملاقات رنجیدہ شاعر جون ایلیا سے ہوئی ہو گی۔

سروش نے مسکرا کر جواب دیا۔

واہ رے سروش! اپنے ہی تن کا پھوڑا ستاتا ہے۔ جان ایلیا بھی تو آپ شاعروں اور ادیبوں کے قبیل سے ہے۔

زُنیرہ نے طنزاً کہا۔

میں نے یہ کب کہا کہ وہ مجھے ستاتا ہے اور یہ روح ہے بھی جان ایلیا کی۔ میں نے تو صرف اندازہ لگایا ہے اور وہ بھی مذاقاً۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس دنیا کا کوئی شخص ہو اور۔۔۔۔۔۔

سروش بولتے بولتے رک گئی، کہ زُنیرہ بے صبری سے بول پڑی۔

اور کیا۔۔۔۔۔۔۔

اور یہ کہ اس کے امکانات بھی زیادہ قوی ہیں۔

سروش نے آہستہ سے کہا۔

زُنیرہ نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے سر ہلایا کہ اس دوران ماں جی نے آواز دی۔

زُنیرہ! پاپا آگئے ہیں بلا رہے ہیں آپ کو۔

جی۔۔۔۔۔بس آگئی۔

سروش زُنیرہ کو رخصت کرنے کے بعد سوچوں میں گم ہو گئیں۔کاش وہی ہوتا۔ سروش کے دماغ میں عُویم کی تصویر بن گئی اور پھر مسکرا کر خود کو جواب دے ڈالا۔

ہے بھی وہی۔۔۔۔۔۔۔کاش اس کائنات میں ارسال پیغام اور بات چیت کے براہِ راست ذریعے کے علاوہ اور بھی محکم اور معتبر ذرائع ہوتے جن پر مکمل یقین کیا جا سکتا ۔۔۔۔۔کاش!

سروش نے ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے دروازہ کھولا اور نیچے ماں کی طرف چلی گئی۔

بابِ ہشتم

میرے غم۔۔۔۔۔میرا غم

عُویم اپنے ذاتی مسائل کسی کے ساتھ ڈسکس کرنے کا قائل نہیں تھا وہ اپنے مسائل کو اپنے ہی سینے کے دشت میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیتا۔ یہی مسائل اپنے ہی صحرا میں کبھی انکا شکار بنتے اور کبھی وہ ان مسائل کا شکار بن جاتا۔ میدان ایک تھا اور فریق دو۔ جس میں لڑائی اس وقت سے جاری تھی جب سے اُس نے شعور کی دنیا میں آنکھ کھولی تھی۔ یہ لڑائی ابھی تک یکمشت جان لیوا نہیں بنی تھی لیکن دیمک کی طرح آہستہ آہستہ اپنا کام کرتی جارہی تھی، نجانے کب کسی ایک فریق کا خاتمہ ہو جائے اور اضطراب واطمینان کی اس درمیانی کیفیت کا فیصلہ ہو جائے جس میں عُویم معلق بھی تھا اور رازدان بھی۔ اسی رازدانی کا اظہار اسکے ڈائری کے سرورق پر لکھے ہوئے ایک فقرے سے معلوم ہوتا تھا جو کہ کچھ یوں تھا۔۔

"میرے غم۔۔۔میرا غم"

اس موجودہ عقیدے یا مذہب کے معاملے کے ساتھ عُویم کا دوسرا معّمہ بے وجہ اضطراب تھا جس کو وہ ابھی تک سمجھ نہ سکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیشہ کشمکش کی کیفیت میں مبتلا رہتا تھا۔ مذہب کے معاملے میں تو وہ کبھی کبھار غصے میں آجاتا تھا اور اپنی عقل کو کوستا رہتا تھا کہ کیوں یہ سوال کرتی رہتی ہے۔ اسکی ہر بات "کیوں" اور "کیسے" سے کیوں شروع ہوتی ہے جب کہ دوسرے معمے کی وجہ معلوم کرنے کے لئے وہ خود چراغ لے کے ڈھونڈھتا پھرتا تھا۔ حل کرنا دور کی بات تھی ان مسائل نے اُس کی زندگی ومزاج میں سنجیدگی بھر دی تھی لیکن اس کے باوجود وہ کوشش کرتا رہتا کہ کچھ وقت کے لئے خود کو بھول جائے، اس

لیے وہ کبھی کبھار اپنے مزاج پر پاؤں رکھ محفلیں جمانے کو کوشش کرتا، یاریاں نبھاتا، خود کو بہلانے، بہکانے اور پھُسلانے کی سعی کرتا۔

پچھلے ہفتے عُویم کے دوستوں پر اسکے مذہب کے بارے میں موقف آشکارہ ہو گیا تھا، یہی وجہ تھی کہ کیف اور فردان نے بھی اس کے سامنے ذکر کیا اور ڈسکس بھی کرنا چاہا۔ اُس کو خود اس بات کا احساس ہو گیا تھا کیونکہ وہ تینوں کے مذہبی نظریات سے آشنا تھا خاص کر فردان کا مذہبی لگاؤ۔ اوراس سے بڑھ کر فردان کا اسکے بارے میں تشویش اور جذبات واحساسات۔ فردان بالکل سیدھا سادہ بندہ تھا۔ اس کا اپنی کورس کے کتابوں کے علاوہ مطالعہ بھی اتنا نہیں تھا اور اسکا اظہار انہوں نے عُویم کے سامنے کیا بھی تھا کہ میں آپ کے سامنے مذہب بیزاری کے ضمن میں عاجزانہ التماسات کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا کیونکہ آپکے سوالات واِشکالات کو میں دلائل سے حل نہیں کر سکتا اور نہ ہی میرا علم اتنا قوی و مستحکم ہے۔ اس کے دوسری طرف کیف کا رُجحان مکمل طور پر الحاد کی طرف تھا۔ وہ مذہب بیزار مصنفین کی کتابیں پڑھتا رہتا تھا۔ فلسفہ و سائنس پر اسکا ایمان پختہ ہو چکا تھا وہ انسانی عقل کو عقلِ کُل سمجھتا تھا۔ اس کے نقطۂ نظر کی ابتداء و انتہا انسان ہی تھا اور کچھ نہیں۔ رہی بات آکاش کی تو اسکا مطالعہ فردان جتنا تھا وہ مذہب وعقیدے کو اتنی ترجیح نہیں دیتا تھا اس کا رحجان تھا ہی الحاد کی طرف لیکن اس میں شِدّت نہیں تھی۔

ان پچھلے چند مہینوں میں عُویم دبے پاؤں مذہبی محفلوں میں شریک ہوا کرتا، علمائے کرام سے ملتا رہتا اور اپنے بل بوتے پر تحقیق کرتا رہا۔ اپنی بساط کے مطابق اس دوران انہوں نے ایسی کوئی محفل نہ چھوڑی جس کی اس نے خاک نہ چھانی ہو۔ معلّمین و مدرّسین سے ملتا رہا ،سوالات کرتا رہا۔ کبھی کبھار تو کسی عالم کی طرف سے ڈانٹ ڈپٹ بھی مل جاتی۔ بعض حضرات عُویم کے سوالات کو تنقید سمجھ لیتے جس پر اُسے غصہ بھی چڑھ جاتا لیکن صرف حسرت برسنے کے علاوہ اور کرتا بھی تو کیا کرتا۔ وہ صرف یہ کہہ کر روانہ ہو جاتا کہ سوال اور

تنقید میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ سوال کا مقصد سمجھنا ہوتا ہے جبکہ تنقید کا مقصد غلطی تراشنا ہوتا ہے۔ تبلیغی بھائیوں سے بھی ملتا رہا اس کی وعظ و نصیحتیں سنتا رہا۔ صوفیاء کرام کی صحبتوں میں جاتا رہا، ذکر و اذکار کے ورد کرتا رہا۔ مراقبوں میں خدا کو ڈھونڈتا رہا۔ ذاکرین کی محفلیں بھی نہ چھوڑیں۔ فلسفی حضرات کے چوکھٹوں پر بھی حاضری دی۔ اپنے تئیں ہر ایک دروازے پر دستک دی لیکن کہیں سے خاطر خواہ اور اطمینان بخش جوابات نہ ملے جو اس کے اعتراضات کی تردید کر سکے۔

اِس تلاش کے دوران ایک مولوی صاحب کے ساتھ ایک دلچسپ مکالمہ ہوا۔ جب مولوی صاحب سے عُویم نے چُبھتے ہوئے سوالات پوُچھنے شروع کیے تو مولوی صاحب نے فرمایا۔

کیا کبھی کِسی ڈاکٹر سے معالجے کے دوران یہ پوچھا ہے کہ فلاں دوائی کیوں تجویز کر دی؟ کیا کسی انجنیئر سے گھر ڈیزائن کرتے وقت پوچھا ہے کہ بیم (Beam) کی چوڑائی اتنی کیوں رکھی؟ اگر نہیں تو ہم سے کیوں پوچھتے ہو کہ یہ کیوں اور کیسا ہے۔ مذہب کا کام علماء کا ہے وہ جس طرح چاہے اس کو نپٹائے، عوام الناس اور جدید سکالروں کی اس میں دخل اندازی چہ معنی دارد؟

مولوی صاحب کے اِس تُرش تبصرے پر عُویم نے جواب دیا جو ہلکی سی تلخی کا سبب بھی بنا۔

جی مولانا صاحب! بالکل پوچھا ہے ڈاکٹر صاحب سے بھی اور انجنئیر صاحب سے بھی اورانہوں نے جوابات بھی فراہم کئے ہیں۔ ہاں جو غیر مستند یا کم عِلم ڈاکٹر یا انجنئیر ہوتا تھا وہ بلاشبہ ایسے سوالات پر غُصہ ضرور ہوئے ہیں لیکن اچھے ڈاکٹر اور انجنئیر نے بڑی خوش اسلوبی سے جوابات سے مطمئن کیا ہے۔ رہی بات مذہب کے بارے میں ہمارے سوالات اور دخل اندازی کی۔ تو یہ ایک فطری اَمر ہے کہ جس چیز کے ساتھ میری وابستگی جتنی ہی زیادہ ہو گی

اُس پر میں اُتنا ہی زیادہ سَر کھپاؤنگا۔ مذہب کے ساتھ میری آخرت جُڑی ہوئی ہے تو کیوں اس اہم ترین موضوع کو یونہی بھٹکتا چھوڑ دوں۔ یہ ہر ایک انسان کے زندگی اور موت کا سوال ہے اور اس سے بڑھ کر دائمی زندگی کا انحصار اس موضوع پر ہے تو کیوں میں اپنی تقدیر کسی اور کے ہاتھ میں تھما دوں۔ میرا گھر جیسا تیسا بنے، میرا علاج جیسا تیسا ہو، یہ اتنا اہم نہیں۔ یہ عارضی دنیا ہے، میں گرتے پڑتے رہ لُونگا لیکن میری آخرت کیسی بنے، میری دائمی زندگی کیسی ہو یہ میرے لیے سب سے اہم ہے۔ اس کے بغیر میں ایک پَل زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسی لیے اس موضوع میں ٹانگ اَڑانا ہر ایک انسان کا پیدائشی اور فطری حق ہے اور یہ حق مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا مذہب کے نام نہاد ٹھیکیدار بھی نہیں۔

ان محفلوں کے ساتھ ساتھ مطالعہ کرنا تو اسکے سَرشت میں شامل تھا، وہ تو جاری ہی جاری تھا لیکن ان تمام کاوشوں کے باوجود اطمینان کی بجائے اضطراب غلبہ پا رہا تھا۔ شاید اوپر والا بھی اسکا امتحان لے رہا تھا اور اپنی تلاش میں اسے دَر دَر کی ٹھوکریں دلا رہا تھا کیونکہ جب کوئی مقصد آسان تلاش سے مل جائے اسکی اتنی قدر نہیں ہوتی، جتنا کسی مقصد کے پیچھے آدمی دن رات تگ و دو کرے اور مصیبتوں سے دوچار ہو جائے۔

اس وقت عُویم تذبذب کا شکار تھا اس نے نماز، روزہ وغیرہ سب کچھ چھوڑ رکھا تھا۔ مذہبی سرگرمیاں تمام کی تمام معطل کر رکھی تھی کیونکہ ابھی تک وہ کسی قادر مطلق ہستی کی تلاش میں ناکام رہا تھا۔ لہٰذا اس کے پاس انکار کے سوا کوئی اور راستہ نہیں بچا تھا۔ وہ اپنی دانست میں اپنی تلاش کی ناکامی کو خدا کے نہ ہونے سے تعبیر کر رہا تھا۔ اسکے سامنے پرکھنے اور جانچنے کا معیار عقل اور ضمیر ہی تھا۔ اور ابھی تک اسی معیار پر اسکے سامنے خدا کی حقیقت نہیں کُھل رہی تھی اور وہ اس کی گرفت میں نہیں آ رہا تھا۔ شاید اسے ابھی اور زمانے کی گردشیں کاٹنی تھیں۔ وہ ماننے اور جاننے کو ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم سمجھتا تھا اور ان میں تطبیق کا قائل تھا۔ جس طرح دل و دماغ کا ایک دوسرے کے بغیر نہیں بنتی اور

گزارہ نہیں ہوتا اس طرح ماننے اور جاننے کا بھی ایک دوسرے کے بغیر رہنا ناممکن ہے کیونکہ اول الذکر کا تعلق دل سے ہے اور ثانی الذکر کا دماغ سے۔

عُویم بچپن ہی سے عقل پرست واقع ہوا تھا اور خرد پرور حضرات سے اٹھنا بیٹھنا پسند کرتا تھا بلکہ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ مجھے دو بندوں سے نفرت ہیں ایک وہ جو عقل سے کام نہیں لیتے اور دوسرے وہ جو دوسروں کا احساس نہیں رکھتے۔ ان لوگوں سے وہ کراہت محسوس کرتا تھا۔ رہی بات ضمیر کی، تو ضمیر کو اس نے اتنا سر پر اٹھار کھا تھا کہ اس کی عدالت میں ہر وقت عُویم کی پیشی ہوا کرتی تھی اور سزا بھی۔ ضمیر بھی خدا نے جنجھوڑنے والا ضمیر بخشا تھا۔ یوں حساسیت اوار عقلیت میں وہ اپنی مثال آپ تھا۔

باب نہم

نُدرتِ تخیّل

تین ہفتوں بعد یونیورسٹی کے اینڈ سمسٹر ایگزامز (ESE) شروع ہونے والے تھے اس لئے ہر کوئی نوٹس اِکھٹا کرنے اور اپنے سوالات کو حتمی شکل دینے میں مصروف تھا۔ عُویم پورے 14 ہفتے سمسٹر کو خوب انجوائے کرتا رہتا، صرف سیشنل ٹیسٹ (Sessional Tests)، کوئیزز (Quizzes) اور اسائنمنٹ (Assignment) کے لئے راتوں رات پڑھ لیتا اس کے علاوہ باقی کورس آخری تین ہفتوں میں کَور (Cover) کرلیتا۔ چودھویں ہفتے میں نوٹس اکٹھا کر لیتا اور جن دوستوں نے کلاسز میں نوٹس بنائے ہوتے تھے ان سے فوٹوسٹیٹ کرلیتا اور پھر خلوت نشین ہو جاتا تھا اور دل لگا کر کورس ختم کرلیتا تھا۔ اس دوران وہ اپنی باقی تمام سرگرمیاں معطل کر دیا کرتا تھا۔ ایکسٹرا اسٹڈی (عمومی مطالعہ) بھی مؤخر کئے دیتا تھا تاکہ کورس کی پڑھائی میں کسی بھی قسم کا خلل نہ ہو۔

اینڈ سمسٹر ایگزام کے بعد دو ہفتے کی چھٹیاں تھیں۔ دو ہفتے بعد سپرنگ سمسٹر (Spring Semester) شروع ہونے والا تھا ان چھٹیوں کے دوران ہاسٹل کے تمام دوست گاؤں چلے گئے۔ عُویم بھی چند دن گزارنے کے لئے اپنے آبائی گاوں چلا گیا تاکہ اگلے سمسٹر کے لئے پھر سے تازہ دم ہو جائے۔

سردی ختم ہونے والی تھی اور بہار کی آمد آمد تھی سبزہ ابھی پوری طرح شباب پہ نہیں آیا تھا لیکن گندم اور جَو کی فصلیں خوب زمین کی سطح پر سبز قالین بچھائے ہوئی تھی۔ ساتھ میں سرسوں کے پھول مصور کے اعلیٰ ذوقِ جمالیات کا پتہ دیتی تھی۔ رات کے وقت آسمان

سے ہلکی سے شبنم آفشانی بھی ہوا کرتی تھی جو صبح کی نماز کے بعد طلوع آفتاب سے پہلے مارننگ واک میں روح افزا و صحت افزا ثابت ہوتی تھی اور بندے کو پورا دن تازہ دم رکھنے کا سامان مہیا کرتی تھی۔ اسی طرح عصر کا منظر بھی قابل دید و قابل داد ہوا کرتا تھا۔

عُویم آج ماحول، موسم، فطرت اور اپنے آپ سے لطف اندوز ہونے کی خاطر عصر کے بعد دریائے کُرم کے کنارے اکیلے آیا ہوا تھا جہاں پر دریا کنارے وسیع و عریض سبزہ پھیلا ہوا تھا جس میں نوجوان گیم بھی کھیلا کرتے تھے۔

اس نے سب لوگوں سے دور گاڑی کھڑی کی اور دریا کے کنارے بیٹھ گیا اور فطرت کے عطیات و بخششوں میں گم ہو گیا اور اپنے تخیل و افکار کے پَروں سے پرواز کرنے لگ گیا۔ کبھی بیٹھتا اور کبھی کنارے کے کم گہرے پانی میں برہنہ پا چکر لگاتا۔ اسی دوران شاعری کی پَری نے عُویم کو اپنے حصار میں لے لیا۔ وہ شاعری کیا کرتا تھا لیکن اس حساس سرگرمی کے لئے مخصوص ماحول و مزاج کی ضرورت ہوتی ہے اور آج شاید اسی مخصوص ماحول و مزاج نے گٹھ جوڑ کیا ہوا تھا۔ الفاظ قلم کے ذریعے قرطاس پر منتقل ہونا شروع ہو گئے۔

افکار و تخیّل سے بدن بال و پَر ہُوا
رفتارِ روشنی سے بھی میں تیز تر ہُوا

اُفتاد و رنج اسکے مقدر میں آن پڑی
مانندِ جُو جو علم میں عزمِ سفر ہُوا

عقل و خرِد کی واں کو رسائی کہاں ہوئی
مجمع جو روح و زیست کے زیرِ اثر ہُوا

وہ کیا مجھے سکھائے مقدر کے فیصلے
اپنی شعور ذات میں جو بے خبر ہُوا

خود اپنے امتحان میں مُعلّق ہوں کب سے میں
ہستی میں اپنے معرکۂ خیر و شر ہُوا

اندوہ و حُزن و غم بھی توبہ گار ہوگئے
اس اضطراب سے جو ہمارا حشر ہُوا

تحقیق حقیقت میں ذہن ماؤف ہوگیا
اب عجز کا اظہار ہی پیشِ نظر ہُوا

اب مانگنا دلیل ہے بالائے ذات سے
اپنے تئیں جو پایا تھا زیر و زَبر ہُوا

کس طرف لے کے جا رہی ہے زندگی عُویم
کھوجِ طمانیت میں مگر دَر بدَر ہُوا

باب دہم

تجدید و احیائے تفکر

چھٹیاں ختم ہو گئیں، کلاسز دوبارہ شُروع ہو گئیں۔ یونیورسٹی کی رونقیں پھر سے بحال ہو گئیں۔ سمسٹر کے ابتدائی ہفتوں میں ہر ایک پروفیسر کی خواہش تھی کہ زیادہ سے زیادہ کورس کور کیا جائے کیونکہ آگے پھر گرمی آنے والی تھی۔اسی وجہ سے تمام طلباء انتہائی مصروف تھے۔ عُویم آج کلاس میں لیٹ آیا۔کلاس شروع ہوئے تقریباً آدھا گھنٹہ ہو چکا تھا۔ اس کا رنگ اُڑا ہوا تھا اور پریشان لگ رہا تھا دوست فوراً پہچان گئے کہ کچھ ہوا ہے کیونکہ اُس کی پریشانی واضطراب ہمیشہ اسکے چہرے پر دکھائی دیتی تھی۔سامنے والا فوراً اس کے مزاج کا اندازہ لگا لیتا تھا۔ چہرے کا تاثر ایسا ہو جاتا کہ پریشانی ٹپک رہی ہے۔اُس کے بیٹھتے ہی دوست آپس میں کھُسر پھُسر کرنے لگ گئے اوراس کی حالت دریافت کرنی شروع کی لیکن چونکہ کلاس جاری تھی اسلئے کھل کر نہ بول سکے۔ جیسے ہی کلاس ختم ہوئی، تینوں دوست فوراً عُویم کی طرف لپک گئے۔

کیا ہوا عُویم! لیٹ کیوں آ گئے؟

آکاش نے عُجلت میں پر تشویش لہجے میں دریافت کیا۔

خیریت تو ہے؟ کیف نے بیچ میں دخل دی۔

عُویم نے اثبات میں سر کو جُنبش دی۔

بول کیوں نہیں رہے، کیا ہوا؟ کچھ مسئلہ تو ضرور ہے۔ کیف دوبارہ بول پڑا۔

کچھ نہیں ہوا ہے، ایک خبر کی وجہ سے طبیعت بوجھل ہو رہی ہے۔ چلو ہاسٹل چلتے ہیں وہاں بتاتا ہوں۔

عُویم فیصلہ کن لہجے میں آہستہ بولا۔

بَنک(Bunk) کرتے ہیں۔

آکاش نے تھوڑی سی تیز آواز میں پوچھ لیا۔

یوں چاروں دوست یونیورسٹی ہاسٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں ہلکی پھلکی گپ شپ کے بعد آکاش نے دوبارہ دوستوں کی توجہ اس خبر کی طرف دلادی جو عُویم کو پریشان کئے ہوئے تھی۔

عُویم! آپ کس خبر کی بات کر رہے تھے؟

ہاں جی! ابھی جب گھر سے نکل رہا تھا تو ٹی وی لاونج(TV Lounge) میں ٹیبل پر صبح کا اخبار پڑا ہُوا تھا، غلطی سے اٹھالیا۔ نہ اٹھاتا تو اچھا ہوتا کیونکہ میں خبریں، اخباراور حالاتِ حاضرہ سے واقفیت وغیرہ سے سخت نالاں ہوں۔ یہ بندے کو پریشان کر دیتی ہے کوئی اچھی خبر سننے کو نہیں ملتی۔ ان لوگوں کے لئے مایوسی، جھگڑا، فساد، پریشانی، آہ وفغاں، سنسنی پھیلانا اور نفرتیں بکھیرنا زیادہ اہمیت کی حامل ہو گئی ہیں۔ تمام چینلز اسی کی ترغیب دے رہے ہوتے ہیں۔ مجھے تو اکثر صحافی حضرات، نام نہاد تجزیہ نگاروں کے ضمیروں پر ترس آتا ہے اوردوسری طرف ہمارے ادارے بھی شُتر بے مہار بنے ہوئے ہیں۔ ہر کوئی اپنی من مانی کر رہاہے کوئی پرسانِ حال نہیں۔ کل ایک بندے کو عدالت سے رہائی کا پروانہ مل گیا۔ اوراس کا کیس غلط ثابت ہو گیا عدالت کی طرف سے اسکے بَری ہونے کے احکامات جاری کر دیے گئے۔ لیکن پتہ ہے کتنی مدت میں اس کیس کا فیصلہ ہوا ہے۔ پورے پانچ سالوں میں، جبکہ اس بیچارے شخص کو مرے ہوئے ڈیڑھ سال سے زائد کا عرصہ ہو چکا ہے۔ اس دوران وہ بغیر کسی جرم کے جیل کی سلاخوں کے پیچھے تڑپتا رہا کوئی بھی مدد گار نہیں تھا جو اسکی آواز سن

لیتااوراس کی دادرسی کرلیتا۔ غریب تھا، لاچار تھا، کمزور تھا، اسی وجہ سے سب کچھ برداشت کرنا پڑا۔ اور بالآخر گھُٹ گھُٹ کر اپنی جان دے دی۔ یہ ایک زندگی تو نہیں تھی جو رخصت ہو گئی اسکے ساتھ اور کئی زندگیاں متعلق تھیں۔ اس کا پورا خاندان اس ایک شخص کے ساتھ منسلک تھا۔ ان کا کیا ہو گا۔ اب ان تمام مظلوموں کو انصاف کون دے گا؟ ان کا ازالہ کون کرے گا۔ کون یہ ہنستی کھیلتی زندگیاں لوٹائے گا؟

عُویم ہلکی سی خاموشی کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔ اسکی آنکھیں نم تھیں اورآواز بھر آئی تھی۔

اخبار میں اسکی دونوں تصویریں چھپی تھی۔ اس وقت جب اسے گرفتار کیا جارہا تھا اور اسکے لاش کی۔ سفید داڑھی نکل گئی تھی ان ساڑھے تین سالوں میں جیل میں دس سال کی زندگی برداشت کر گیا تھا۔ کس کرب میں گزری ہو گی۔ ایک ایک سیکنڈ گنا ہو گا بیچارے نے۔ اس کی سفید داڑھی کے ساتھ تصویر دیکھ کے کلیجہ پھٹ جاتا ہے۔ کاش کہ نہ دیکھتا۔

عُویم نے گہرے دکھ بھرے لہجے میں پوری خبر سنائی۔ سب دوست خاموشی کے ساتھ سن رہے تھے کچھ توقف کے بعد وہ دوبارہ بول پڑا۔

یار! یہ تو ہماری ہی طرح جیتا جاگتا، احساسات و خواہشات سینے میں لئے ہوئے ایک مکمل انسان تھا میں تو کسی بےشعور جانور کے ساتھ بھی ایسا ظلم برداشت نہیں کر سکتا۔ برداشت کرنا تو چھوڑے اسکا سوچ بھی نہیں سکتا۔ درخت کی پتی کو ٹہنی سے الگ کرنا بھی میرے لئے پریشانی کا باعث بنتی ہے۔

آہ یہ ظالم لوگ! کوئی تو ان مظلوموں کا پرسان حال ہونا چاہیئے۔

ہے نا ان مظلوموں کا پرسان حال۔۔۔ میرا عظیم و منصف اللہ۔۔۔۔۔ قیامت کے دن انکی چمڑی اُتاری جائے گی اس دن ان سب ظالموں کو چھٹی کا دودھ یاد دلایا جائے گا۔

فردان بڑے پر وقار اور پُر تیقُن لہجے میں بڑی شان سے گویا ہوا اس کے لہجے سے احساس تفاخر ٹپک رہا تھا۔

یار بس کرو۔ کون کرے گا یہ سب کچھ۔ اس دنیا میں آپکا خدا کچھ نہ کر سکا وہاں کیا کرے گا اور وہ دنیا ہے کہاں؟

کیف نے فردان کے تبصرے پر طنزاً کہا۔

تو آپ سے کس نے کہا ہے کہ یہ دنیا جزاو سزا کی دنیا ہے۔ یہ دنیا تو عمل کی دنیا ہے۔

فردان نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

عُویم جو خود بھی خدا کے وجود کے بارے میں تذبذب کا شکار تھا۔ کہیں انکار کئے دیتا تھا کبھی سوالات کی بھرمار لگا تا رہتا۔ اسکی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ لیکن اس نے تمام مذہبی سرگرمیاں نماز، روزہ وغیرہ چھوڑرکھی تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ جب بھی اپنے ساتھ خدا کا انکار کرتا تو جھجک سی ضرور محسوس کرتا تھا اسلئے اس بات کا کبھی بھی برملا اظہار نہیں کیا۔ اس واقعے نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ وہ فردان اور کیف کی بحث خاموشی سے سن رہا تھا کہ اسی دوران چاروں دوست ہاسٹل کے کمرے میں پہنچ گئے۔

یہ تو ایک واقعہ ہے جو ہماری معلومات کی گرفت میں آگیا وگرنہ ایسے ہزاروں واقعے ہو سکتے ہیں جن میں ظلم کے پہاڑ ڈھائے جاتے ہوں۔ ان جنگوں کو دیکھئے کتنا خون بہتا ہے آپ کے خیال میں کیا سارا خون ظالموں کی رگوں سے گرتا ہے؟ ان میں تو ایسے بھی ہوں گے جو ان برائیوں میں تھوڑے سے بھی حصہ دار نہ ہوتے ہوں گے اور چھوٹے چھوٹے بچے بھی۔ ان کا کیا قصور؟ کیا یہ سب انصاف کے امیدوار نہیں؟ جبکہ انسانی تاریخ تو جنگ و جدل سے بھری پڑی ہے۔

فردان نے بیٹھتے ہی تبصرہ کیا۔

کیوں نہیں ہیں انصاف کے امیدوار۔ اور کون کہتا ہے کہ انصاف نہیں ملنا چاہیئے،ضرور ملنا چاہیئے اوران لوگوں کو بھی کوشش کرنی چاہیئے کہ اپنے لئے انصاف تلاش کریں، تلاش کیا بلکہ انصاف چھیننا چاہیئے۔

کیف نے فردان کو جواب دینے کی کوشش کی۔

آپ ایک آئیڈ ئیل اور بے عیب نظام کی بات کر رہے ہیں جہاں جرم کا نام ونشان نہ ہو اور وہ اس دنیا میں ناممکن ہے۔ ابھی تک انسانی آنکھوں نے ایسی کوئی آئیڈ ئیل دنیا نہیں دیکھی۔ جب ایسی دنیا وقوع پذیر ہو جائے گی تو ہم آپ کی بات پر غور کر لینگے۔ فردان نے کہا۔

تو کیا ایسے بے عیب نظام کے نہ ہونے سے آپکا خدا مل سکتا ہے ہمیں؟

کیف نے قدرے ترش زبان میں استفہام کیا۔

عُویم جو خاموشی سے دونوں دوستوں کی باتیں سن رہا تھا، پر تفکر لہجے میں گویا ہوا۔

اوراس پر مستزادیہ کہ یہ جو اپنے سینوں میں ہم خواہشات وامیدوں کے ہمالیہ لے کے گھوم رہے ہیں۔ انکا کیا ہو گا؟ ان کو بھی تو تعمیل و تکمیل کے ساحل پر پڑاو کرنا ہے اگر ان کی تعمیل و تکمیل نہ ہو تو کہاں سے آتی ہیں یہ خواہشات اور خیالی دنیائیں جو ہم سب نے اپنی سینوں میں بسا رکھی ہیں؟ اس کا وجود ہی اس کے تعمیل و تکمیل کا متقاضی ہے۔

تھوڑی خاموشی کے بعد دوبارہ بول پڑا اور سر کو جنبش بھی دیتا رہا۔

کوئی تو ہو جو ان سب دُکھیاروں کو اپنی آغوش میں لے لیں۔ ان کے آنسو پونچھ لیں۔ ان کو تسلی دیں۔ انکو ممتا جیسا پیار دیں اوران تمام خواہشات کو ٹھکانہ دیں۔۔۔۔ کوئی تو ضرور ہو۔۔۔۔ یہ سب کسی دوسری دنیا کا اشارہ کر رہی ہے کیونکہ اس دنیا میں تو ایسا کچھ ابھی تک نہیں ہوا اور وہ جو بھی ہو وہ ضرور ایک طاقتور، منصف، ہر فنِ مولیٰ، باخبر اور ہر شے پر قدرت رکھنے والی ہستی ہو۔ کوئی تو ہونا چاہیئے۔۔۔۔ ضرور ہونا چاہیئے۔

عُویم کی باتیں سن کر فردان کا چہرہ جوش و مسرت سے تمتمار ہا تھا کیونکہ اسے دوبارہ عُویم میں امید کی کرن نظر آنے لگی تھی۔

جو بھی ہے لیکن اس بے انصافی اوراس کے ازالے کو مذہب کے ساتھ نہ جوڑا جائے۔مذہب کی یہاں کوئی تُک نہیں بنتی۔

آکاش بیچ میں مخل ہوا۔وہ مکالمے کا اختتام چاہتا تھا۔

کیوں نہیں ہے تعلق۔۔۔۔مذہب ہی انصاف کی بات کرتا ہے۔ذرے ذرے کے حساب کی بات کرتا ہے۔ازالے کی بات کرتا ہے۔دکھیاروں کو سینے سے لگانے کی بات کرتا ہے۔۔۔۔فردان بولا

اس کو آپ مذہب سے تعبیر کریں یا نہ کریں لیکن اس دنیا میں انسان کے اعمال وافعال کا لازمی نتیجہ ہے کہ کہیں ایک اور دنیا ہماری انتظار کر رہی ہے اس وقت اس کو مانے بغیر میرے پاس کوئی اور چارہ نہیں۔۔۔۔اوراس دوسری دنیا کے ساتھ کسی برتر ہستی کا ہونا لازم وملزوم ہے۔

عُویم نے متجسّسانہ انداز میں سب دوستوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

یار کچھ نہیں ہے۔ایک واقعے کو لے کر آسمان سر پر اٹھالیا اور دوبارہ پرانی مذہبی باتوں کی طرف چھلانگ دی۔چھوڑو یار۔چِل کرو۔مزے لو،انجوائے کرو۔

کیف نے عُویم کے شانے دباتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

بھائی یہ میرے لئے ناممکن ہے کہ اپنے ضمیر واحساس پر پاؤں رکھ کر صرف اپنے لئے جیوں اور صرف اپنی خوشی کا سوچوں۔یہ ایک واقعہ نہیں۔یہ ہزاروں واقعوں کی ایک کَڑی ہے جن میں ایک ہمیں معلوم ہوگئی ہے اسطرح کے واقعے ہمارے سامنے روزانہ ہوتے رہتے ہیں لیکن ہم اسکی طرف توجہ نہیں کرپاتے۔اسکے ازالے کا اگر نہ سوچا جائے تو ایک ناامیدی

ضرور ایک حسّاس انسان میں اپنا گھر کر جاتی ہے۔ سزا و جزا کے بغیر تو دنیا تاریک ہے۔ آپ ایک چھوٹی سی ریاست کی مثال لیجئے۔

سزا کے لئے کتنے بڑے پیمانے پر ادارے بنائے گئے ہیں ۔پولیس ہے،عدالتیں ہیں، جرگہ سسٹم ہے وغیرہ۔اسی طرح جزا پر اگر غور کیا جائے تو جو مزدور کارلوگ اپنے کام کی تنخواہ لیتے ہیں یہ جزا نہیں تو کیا ہے۔ جب ایک چھوٹی سی ریاست میں جزا و سزا کے لئے کلیے و قوانین ہوسکتے ہیں تو اتنی بڑی کائنات کے لئے ان قوانین پر اعتراض کیوں؟؟ اوراس حقیقت میں کسی قسم کے شک کی گنجائش ہی نہیں کہ اس دنیا میں سوفیصد اپنے کئے کی جزا و سزا نہیں مل سکتی۔ ایسے بہت سے خیر وشر کے کام ہے جن کو سرانجام دیتے وقت کسی قسم کی قانون کی آنکھ دیکھنے پر مامور نہیں ہوتی جو کہ مکمل خلوت میں پایہ تکمیل تک پہنچ پاتی ہیں۔ان کو بھی تو انہی قوانین کے زمرے میں آنا چاہیئے کیونکہ عقل کا تقاضہ یہی ہے کہ قانون تمام اعمال کے لئے یکساں ہونا چاہیئے، چاہے وہ خلوت میں سرانجام ہو یا جلوت میں۔ جزا و سزا انسان کی سرشت میں شامل ہے یہ انسانی نفسیات کا مطالبہ ہے۔

عُویم بول پڑا۔ اسکے چہرے پر فکر کے گہرے تاثرات لرزاں تھے۔

کس ناامیدی کی بات کر رہے ہیں؟ کس تاریکی کی بات کر رہے ہیں آپ؟ ہمیں تو نظر نہیں آئی یہ ناامیدی اور یہ تاریکی؟

کیف نے استفہام کیا۔

معذرت کے ساتھ۔۔۔ آپ نے شاید اس زاویے سے دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ آپ فلسفے کے بڑے دلدادہ ہیں۔ چلو آپ کو فلسفے کے میدان سے یہ ناامیدی دکھاتا ہوں۔ بیسوی صدی کا سب سے بڑا ملحد برٹرینڈرسل۔۔۔۔ پڑھا تو ہوگا اسے ۔۔۔ ضرور۔ اس کی آپ بیتی میں کتنی ناامیدی جھلکتی ہے۔۔۔ کتنا خوف ہے اس میں۔ اور یہ بھی آپ جانتے ہیں کہ برٹرینڈرسل فلسفی کے ساتھ ساتھ ریاضی دان بھی تھا۔اپنی آپ بیتی میں ریاضیات

کے بارے میں تین جلدوں پر مشتمل ضخیم کتاب کے بارے میں وہ کیا تبصرہ کرتا ہے۔۔۔ فرماتے ہیں کہ "میں نے اپنی زندگی کی بہترین سال اس پر لگائے ہیں اس امید سے کہ کہیں سے کوئی قابل یقین علم ہاتھ آجائیں۔۔۔ لیکن حقیقت میں یہ تمام کوشش شک، گھبراہٹ اور اضطراب پر ختم ہوگئی۔" پھر آگے بڑھ کر مختلف دوسرے نظریات اپنالیتا ہے اور اس کی روشنی ماند پڑنے پر دوبارہ مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کے آگے اس اعتراف پر مجبور ہو جاتا ہے کہ "مجھے میری زندگی بیکار نظر آرہی ہے جس کو میں نے ناممکن کمالات کے لئے وقف کر دی تھی۔" اور دنیا کے لئے تاریکی کا اندیشہ ظاہر کرتا ہے اور اپنی زندگی کو بے مقصد تعبیر کرتا ہے۔ یہ بے بسی نہیں تو اور کیا ہے۔ اسی طرح اتنا بڑا ملحد ایمان کے بارے میں اپنی دوسری کتاب میں یہ اعتراف کرتا ہے کہ "نفسی تحقیق نے بقا کے حق میں شواہد اکٹھی کی ہیں۔ یہ شواہد کسی بھی وقت اتنی مضبوط تر ہو سکتی ہے کہ اس کے بعد زندگی بعد از موت میں یقین نہ رکھنا غیر سائنسی طرز فکر قرار پائے گا۔ اور یہی بقا کا عقیدہ موت کی دہشت کو ختم کرتا ہے۔" اسی برٹرینڈرسل کے طرزِ فکر کو اگر میں اطلاق کے زمرے لاؤں تو پوری دنیا میں صرف صحیح معنوں میں مذہبی شخص ہی ایسا ہوتا ہے جو موت سے نہیں ڈرتا ہے بلکہ اس ابدی زندگی کا انتظار کرتا ہے جس میں بقا ہے۔

اسی کتاب میں رسل ایک اور اعتراف بھی کرتا ہے کہ "میرا یہ دعویٰ ہی نہیں کہ میں یہ ثابت کر سکوں کہ خدا کا کوئی وجود نہیں۔ ممکن ہے کہ وہ موجود ہو۔"

ہاں۔۔۔ اس اعتراف سے ایک اور بات یاد آگئی۔ موجودہ دور کا سب سے بڑا ملحد رچرڈ ڈاکنز بھی اسی اعتراف میں برٹرینڈ زرسل کا ساتھی ہے۔ اسکا مناظرہ نظر سے گزرا ہے؟ جو انہوں نے اکسفورڈ یونیورسٹی میں آرچ بشپ آف کنٹبری (Archbishop of Counterbury) روون ویلمز (Rowan Williams) سے حال ہی میں کیا تھا۔ رچرڈ ڈاکنز جس کو ڈارونزم کا چیمپئن بھی سمجھا جاتا ہے اس اعتراف پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کہ

"میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ خدا کاوجود نہیں ہے میں ملحد نہیں بلکہ لاادری (Agnostic)ہوں۔

عُویم نے بڑی تفصیل کے ساتھ ملحد فلسفیوں کے اعترافات مناظرے کی میز پر بڑی خوش اسلوبی سے رکھ دیے۔

کیف بالکل خاموش بیٹھا تھاجیسے اسے سانپ سونگھ گیا ہودوسری طرف فردان لاشعوری اور غیر محسوس انداز میں عُویم پر داد وشاباش برساتا رہااوراس پر فخر محسوس کرتا رہا۔ عُویم نے بات پوری کرنے کے بعد ادھر اُدھر دیکھا کہ کہیں سے کوئی جواب (Response) آئے لیکن ہر طرف خاموشی تھی اسی سکوت کو ختم کرنے کے لئے وہ براہِ راست کیف کی طرف متوجہ ہوااور بولا۔

کیف مجھے نہیں پتہ کہ آپ میری گفتگو کو خدا کے وجود کا نام دیتے ہیں یا مذہب سے تعبیر کرتے ہیں، اسکا مجھے خود بھی علم نہیں لیکن میرا مطلب اس سے یہ ہے کہ انسان بے بس ہے اور انتہائی بے بس اور اسی بے بسی کے لئے ضرور کوئی سہارا چاہیئے۔ اتنا بے بس ہے انسان کہ قدم قدم پر کبھی فطرت کے قوانین کے سامنے ڈھیر ہو جاتا ہے اور کبھی اپنے ہی جبلتوں کے سامنے۔ اورانسان کی بنائی ہوئی بلند وبالا محلات یکدم و یکمشت پیوند خاک ہو جاتی ہیں۔ اسکی ایک مثال دیتاہوں۔ آپ لوگوں نے مشاہدہ کیاہو گا کہ کتناہی باوقار اور عزت دار شخص ہوتاہے کہ اپنی عزت پر کسی بھی صورت کسی بھی قسم کی آنچ آنے نہیں دیتا۔ لیکن بعض دفعہ اپنی جبلت کی تسکین کے لئے کیا کیا گُل کھلا دیتا ہے۔ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ معاشرے میں اکثریت اس پر لعن وطعن کرتی ہیں لیکن مجھے ترس آتاہے کیونکہ ان میں اکثریت اپنی جبلت کے سامنے بے بس ہو جاتے ہیں۔ ان میں ایسے بھی ہے جن کو مستی چڑھی ہوتی ہے میرا یہاں مقصود وہ لوگ ہر گز نہیں لیکن بے بسی سے انکارنا ممکن ہے۔

عُویم کے اندازِ گفتگو میں ترس کے گہرے اثرات نمایاں تھے کہ اس دوران آکاش نے ہنس کر مداخلت کی۔

عُویم! آج تو پانی نہیں مانگ رہا، ہونٹ اور حلق خشک نہیں ہو رہے کیا۔ آپ کا جسم تو ویسے بھی پیٹرول کی بجائے سی این جی پر چلتا ہے۔

عُویم نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلا دیا اور اشارے سے پانی کی درخواست بھی کر دی۔

باب یازدہم

دَربارِ دُربار

کل کے واقعے نے عُویم کے دل ودماغ پر گہرے اثرات مرتب کئے۔اس واقعے کی طرف بار بار توجہ نے اسے جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔اسی طرح ہاسٹل کے کمرے میں اس واقعے پر گفتگو نے اُس کے لئے اور سوالات کھڑے کر دیے۔اس طرح کے ظالمانہ واقعے کے ساتھ جو بے بسی اور انصاف کا حصول متعلق تھا نے اُس کے لیے نئی راہیں کھولنے کا عِندیہ دیا۔اُس نے تو اسی وقت اپنے دل کی بات کا کھُل کر اظہار کیا اور جو تذبذب، اضطراب، بے چینی اور سوالات اس کے دل و دماغ میں گھر کر گئے تھے اس کو برملا سب کے سامنے بیان کر دیا ،جس طرح وہ احتجاج کو فوراً ریکارڈ کرانے کا حامی تھا۔ اس طرح شکوک وشبہات اور تردید و تائید کے ضمن میں بھی وہ کسی کنجوسی سے کام نہیں لیتا تھا بلکہ فوراً دل کی بات زبان پر لے آتا تھا چاہے اس کے اپنے ہی نظریات پر زد کیوں نہ پڑے۔اسی طرح اس گفتگو نے کیف اور آکاش کو بھی سوچنے پر مجبور کر دیا۔

عُویم جو ابھی تک مذہب اور خدا کی تلاش میں دَر دَر کی ٹھوکریں کھا چکا تھا اوران کے عدم ہونے میں یقین محکم کی جانب گامزن تھا کیونکہ اس تلاش سے مایوس ہو چکا تھا دوبارہ اس کے دماغ کی متلاشی رَگ پھڑک اٹھی۔ اس نے دوبارہ اپنے سوالات پوچھنے اور تلاش کرنے کا تہیہ کر لیا۔وہ حقیقت تک پہنچنے میں سر گرداں تھا۔

تلاش کرنے میں تو کوئی عیب نہیں چاہے نتیجہ میرے بنائے ہوئے نظریات کے خلاف کیوں نہ نکلے۔ اگر حق کسی اور کے ہاں موجود ملا تو مجھے اپنے نظریات کو پس پشت ڈالنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہو گی۔ حق کا واحد وارث نہ میں ہوں نہ کوئی اور۔ پوری انسانیت اسکی حقدار اور متلاشی ہے یہ جس قدر بھی ملے جہاں سے بھی ملے لپیٹ لو۔ اس پر کسی کا قبضہ نہیں ہے۔ مجھے اطمینان کی تلاش ہے اور سوالات کے جوابات چاہئیں اور اس کی منزل مقصود صرف وہاں ہو سکتی ہے جہاں حق ہو۔ غلط اور گمراہ کن نظریات اس کے تسلی بخش جوابات نہیں دے سکتے بلکہ وہ اضطراب میں اور اس اضافے کا باعث بنتے ہیں۔

یہ وہ مقدمہ تھا جسکی بنیاد پر عُویم دوبارہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ابھی تک انہوں نے جو خدا کے انکار پر مقدمہ مرتب کیا تھا وہ بھی اُس کے لئے اطمینان کا سبب نہیں بنا تھا۔ اس کے بر عکس خدا کے اقرار پر اس کے سامنے کافی سوالات تھے۔ لہٰذا وہ دوبارہ بیچ میں لٹک گیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی تلاش میں مخلص اور کمیٹڈ (Committed) تھا۔

مدعا جو ہے سو وہ پایا نہیں جاتا کہیں
ایک عالم جستجو میں جی کو اپنے کھو گیا

اس دفعہ اُس نے انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا سے فائدہ لینے کی کوشش کی۔ انہوں نے انٹرنیٹ پر ایسے سکالر کی تلاش شروع کی جس کا مذاہب عالم پر لٹریچر بھی موجود ہو اور وہ کسی ڈھکا چُھپا بھی نہ ہو بلکہ ہر ایک کے سامنے عیاں ہو۔ اس ضمن میں اسے مختلف سکالرز سے واسطہ پڑا اور اس کی کتابیں پڑھتا رہا۔ چند ایک سے تو ملاقات کے لئے دوسرے شہروں میں بھی جانا پڑا لیکن اس کی تشنگی دور ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ ان اسکالرز کی تلاش ان سے ملاقات اور استفادہ اُس کا ذاتی فیصلہ تھا۔ لہٰذا اس ضمن میں وہ بہت محتاط تھا کیونکہ اس نے سن اور دیکھ رکھا تھا کہ ان لوگوں میں ایسے گروہ بھی پائے جاتے ہیں جو نوجوان طبقے کے جذبات سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان کو راہ سے بھٹکا کر گمراہی میں دھکیل دیتے ہیں اور اپنے

گمراہ کن عقائد پر کاربند کراتے ہیں۔ اسی طرح وہ ہپناٹزم اور جذباتی تقاریر کے فریب سے بھی پوری طرح آگاہ تھا۔ لہٰذا انہوں نے اپنے اس انتخاب کے لئے چند قوانین بنا لئے۔

پہلے یہ کہ کسی ایسے سکالر سے استفادہ کرنا ہے جس کا لٹریچر عوام الناس کے سامنے چھپا ہوا موجود ہو چُھپا ہوا نہ ہو۔ دوسرا یہ کہ اس کے دلائل عقل کے معیار پر پورے اترتے ہوں۔ جذبات شاملِ حال ہوں لیکن سمجھ بوجھ کے بعد۔ اس سے پہلے جذبات کا کوئی لینا دینا نہ ہو۔ تیسرا یہ کہ چونکہ اس وقت مادیت پرستی اور فرقہ پرستی کا بڑا زور ہے۔ لہٰذا وہ ان دونوں سے پاک ہو۔ نہ وہ آپ سے مال کا حریصانہ مطالبہ کرتا ہو اور نہ اپنے فرقے کی دعوت دیتا ہو۔ چوتھا یہ کہ وہ جس چیز کی دعوت دے رہا ہو اس پر وہ خود بھی عمل پیرا ہو یعنی اس کے قول و فعل میں تضاد نہ ہو۔ پانچواں یہ کہ اس سکالر کا اخلاقی معیار مضبوط ہو۔ انسانیت کے ساتھ اس کا رویہ اچھا ہو۔ چھٹا یہ کہ وہ سکالر اپنی رائے کو حرف آخر نہ سمجھتا ہو۔ اس میں غلطی کے امکان کو بھی موجود رکھتا ہو اور وہ دنیا کے کسی بھی کونے سے حق کی تلاش میں ہمہ تن گوش رہتا ہو کیونکہ مکمل علم کبھی بھی انسان کی گرفت میں نہیں آسکتا۔ ساتواں یہ کہ وہ سوال اور تنقید میں فرق کو جانتا اور پہچانتا ہو اور اس کو ملحوظ بھی رکھتا ہو۔ یعنی گفتگو کے قوانین سے باخبر بھی ہو اور باعمل بھی۔ اور آخر میں آٹھواں قانون کہ اس اسکالر کے دلائل کو پرکھنے کے لئے معاشرے میں موجود اور صاحبانِ علم سے اسکی گفتگو کو شریک کیا جائے اور دوسرے صاحبانِ علم کی رائے لی جائے اور موازنہ کیا جائے۔

انہیں اصولوں کو لے کر عُویم مختلف اسکالروں سے ملتا رہا اور اپنی کیفیت بیان کرتا رہا اور سوالات کرتا رہا۔ آج وہ ایک سکالر جناب عبدالاحد صاحب سے ملنے اپنے شہر سے دوسرے شہر آیا ہوا تھا۔ عبدالاحد صاحب عمر رسیدہ شخصیت تھے جس کے ماننے والوں کی کافی تعداد اندرون اور بیرونِ ملک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی کافی کتابیں چَھپی ہوئی تھی جو کسی بھی بک سٹور سے باآسانی حاصل کی جاسکتی تھی۔ ان کتابوں سے اُس نے کسی حد تک

استفادہ حاصل کیا ہوا تھا۔ ان کتابوں ہی کی بخشش تھی کہ عُویم آج اس کی محفل میں شریک تھا۔ اس کے درس کا وقت اور تاریخ انٹرنیٹ سے معلوم کر کے وہ وہاں حاضر ہوا تھا اور ایک کونے میں بیٹھا جانچ پرکھ میں مصروف تھا۔

وہ عبد الاحد صاحب کے چہرے پر تسکین کے گہرے اثرات بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ استاد نے بڑی دل جمعی اور ٹھہراؤ کے ساتھ اپنا بیان مکمل کر دیا اس کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ عُویم کو ایسا لگا جیسا کہ محفل ختم ہونے والی ہے اور اسکا سوال یونہی سوال رہ گیا اور پوچھا نہ گیا۔ اسکو محفل کے ختم ہونے کا غم کھائے جا رہا تھا۔ لہٰذا انہوں نے جلدی جلدی جیب سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالا اور اس پر یہ تحریر لکھ کر بذریعہ خادمِ محفل استاد کی طرف روانہ کیا۔

"جنابِ عالی!

میرا ایک سوال ہے لیکن آپ سے اکیلے میں پوچھنا چاہتا ہوں۔

طالب علم۔ عُویم"

خادمِ محفل نے کاغذ کی پرچی استاد کے ٹیبل پر باقی پرچیوں کے ساتھ رکھ دی محفل ختم ہو گئی لیکن اس کے پرچی پر تبصرہ نہ ہوا۔ محفل ختم ہونے کے بعد حاضرین نے اپنی اپنی راہ لی۔ عُویم اس امید کے ساتھ کہ شاید استاد کی طرف سے کوئی بلاوہ آجائے قصداً جانے میں تاخیر کرتا رہا اور ادھر اُدھر ٹہلتا رہا اور اپنے آپ کو کوستا رہا کہ پرچی پر کم از کم اپنے نام کے ساتھ موبائل نمبر یا پتہ درج کرا دیتا۔ آخر کار بادل ناخواستہ خارجی گیٹ کی طرف بڑھا کہ وہاں پر اچانک اسکی امید بر آئی کیونکہ خارجی گیٹ پر گیٹ کیپر ہر ایک سے اسکا نام پوچھ رہا تھا۔

جی کیا نام ہے آپ کا؟

عُویم!۔۔۔۔۔ عُویم نے آہستہ سے رُکے بغیر جواب دیا۔

ارے یار! عُویم آپ ہیں، تھکا دیا پوچھ پوچھ کے۔ چلیئے استاد نے بلایا ہے۔ یہ سنتے ہی عُویم کا چہرہ کِھل اُٹھا۔ گیٹ کیپر نے اُس کو اپنے ساتھ لیا اور سیڑھیاں چڑھ کر ایک کمرے میں استاد کی خدمت میں حاضر کیا۔ کمرے میں عبد الاحد صاحب اپنے دو اور دوستوں کے ساتھ چائے میں مصروف تھے اور گپ شپ جاری تھی کہ عُویم اور گیٹ کیپر کے داخل ہوتے ہی سب ان کی طرف متوجہ ہوئے۔

جناب! یہ ہے عُویم۔

گیٹ کیپر نے داخل ہوتے ہی کہا۔

اچھا جی۔۔۔ بیٹا! پرچی بغیر پتہ کے روانہ کی تھی اس لیے گیٹ کیپر کے ذریعے آپکو تلاش کرنا پڑا۔ آیئے بیٹھیئے۔

استاد نے عُویم کی طرف توجہ کرکے فرمایا۔

عُویم صوفے پر بیٹھ گیا۔

بیٹا اپنے لئے چائے خود ہی ڈالنی پڑے گی اور اگر کچھ کھانا ہے تو وہ بھی خود ہی لینا پڑے گا۔ سیلف سروس ہے کیونکہ خادم باہر مصروف ہے۔ استاد نے میز پر پڑے خورونوش کی سامان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اسکے بعد محفل میں تھوڑے سے عرصے کے لئے خاموشی چھاگئی۔ کیونکہ استاد عُویم کو موقع دے رہا تھا تاکہ گفتگو شروع کرے۔ آخر کار استاد کو خود ہی بولنا پڑا۔

بولئے نا بیٹا۔ کہاں سے آئے ہو۔ کیا کرتے ہو، اپنا تعارف تو کیجئے۔

اُس نے اپنا تعارف کرنے کے بعد باقی دو صاحبان پر نظر ڈالی، استاد سمجھ گیا کہ وہ پوچھنے میں جھجک محسوس کر رہا ہے۔ لہٰذا انہوں نے عُویم کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

پوچھئے بیٹا جو پوچھنا ہے۔ یہ میرے اپنے دوست ہیں۔

جی۔۔۔ پوچھتا ہوں لیکن آپ مجھے ڈانٹیں گے تو نہیں؟

عُویم کے چہرے سے معصومیت ٹپک رہی تھی۔

کیا بیٹوں کو سوال کرنے پر ڈانٹا جاتا ہے؟

استاد نے مسکرا کر کہا۔ باقی دو صاحبان بھی ہلکا سا مسکرا گئے۔

جی۔۔۔۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ خدا نہیں ہے۔ عُویم نے مختصراً انداز میں سوال پوچھ لیا۔ اس نے بات کو ادھر اُدھر گھمانے کی بجائے فوراً اپنی تلاش اور تجسس کا آخرہ کنارہ دَھر لیا۔

بس یہی یا اور کچھ کہنا چاہتے ہو۔ استاد نے فرمایا۔

لیکن۔۔۔۔۔۔ لیکن بولنے کے بعد عُویم دوبارہ خاموش ہو گیا۔

بولئے بیٹا۔۔۔ آگے بولو۔ استاد نے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

لیکن میرے ساتھ میرا دل یہ بات مکمل طور پر تسلیم نہیں کر رہا، مطابقت نہیں بن رہی۔ اسلئے میں ایک اضطراب کی کیفیت میں مبتلا ہوں، اطمینان کی تلاش میں ہوں اور اس کے لئے جگہ جگہ چھان ماری ہے۔

عُویم نے معصومانہ انداز میں استاد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

دل کیوں نہیں مان رہا۔ کوئی وجہ؟

استاد نے جواب دینے کی بجائے سوال پوچھ لیا۔

جب بھی میں خدا کے انکار کے بارے میں سوچتا ہوں تو اندر سے آواز آتی ہے کہ میں غلط کر رہا ہوں جس کو میں اگر دبانا چاہوں بھی تو نہیں دبا سکتا۔ اسی طرح جب میں اس دنیا میں ہونے والے مظالم، بے انصافیوں اور انسان کی بے بسی پر سوچتا ہوں تو اس کے ازالے کا مجھے خاطر خواہ جواب نہیں ملتا۔ عُویم نے انصاف، مظالم اور بے بسی کی وہ پوری کہانی جو ہاسٹل میں زیر بحث آئی تھی۔ استاد کے میز پر کلام کر کے رکھ دی۔

استاد مسکراہٹ اور سنجیدگی کے ساتھ سب کچھ سنتا رہا۔ پھر عُویم کا حوصلہ بڑھانے اور عزت نفس میں اضافے کی خاطر اُس سے کلام کی اجازت چاہی۔

بیٹا! اجازت ہے اب میں کچھ بول دوں؟

عُویم نے بڑی تیزی کے ساتھ جلدی جلدی اثبات میں سَر کو جُنبش دی۔

سب سے پہلے تو میں آپ پر رشک کرتا ہوں کہ آپ متلاشی ہو۔ تلاش ہمیشہ محبوب کی کی جاتی ہے۔ آپ نے ثابت کر دیا کہ انسان کی محبوب ترین ہستی خدائے بزرگ و برتر ہے اور ہونا بھی اُسی کو چاہیئے۔ اب آتے ہیں آپ کے سوال اور آپ کی گفتگو پر۔ اس کو اگر ہم 3 حصوں میں تقسیم کریں تو سمجھنے میں آسانی ہو گی۔

نمبر 1: آپ نے کلمہ طیبہ کے پہلے حصے کا جزوِاول مکمل کامیابی سے طے کر دیا ہے۔ اب جزو دوئم پر تدّبر کر کے اسکو جزو اول سے جوڑنا ہے۔ کلمہ طیبہ کا پہلا حصہ توحید اور دوسرا حصہ رسالت پر مشتمل ہے۔

لا الہٰ الا اللہ محمد الرسول اللہ (اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں)۔ اسکا پہلا حصہ لا الہ الا اللہ ہے۔ اس پہلے حصے کا جزو اول (لا الہ) نفی ہے اور جزو دوئم (الا اللہ) اثبات ہے۔ نفی کا حصہ یعنی نہیں ہے کوئی الہ۔ اسکو آپ طے کر چکے ہیں کیونکہ آپ کا بنیادی سوال ہی یہی ہے کہ کوئی خدا نہیں ہے۔ اب ہم مل کر جزو دوئم پر تدبر کرینگے اور نفی کے بعد اثبات کو ثابت کریں گے اور دلائل کی مدد سے دیکھیں گے کہ اثبات کا پورشن یعنی "مگر ایک اللہ" حقیقت ہے یا فسانہ۔ لہٰذا جزو اول طے کر کے آدھا کام آپ نے میرا آسان کر دیا ہے۔

نمبر 2: آپ نے انسان کی بے بسی، ظلم و عدوان، بے انصافی اور اس کے ازالے کی بات کی، جو کہ بالکل عقلیات پر مبنی ہے۔ ان بے انصافیوں اور ظلم و عدوان کا کہیں ازالہ ہونا چاہیئے۔ اسی طرح انسان کے سینے میں رچی بسی امید و خواہشات کی تکمیل کا بھی کوئی نا کوئی

بندوبست ہونا چاہیے۔ ساتھ میں انسان کی کمزوری کے لئے سہارا بھی ہونا چاہیئے۔ کون صاحب عقل اس سے انکار کر سکتا ہے۔ یہ تمام مقدمات اس تصور کو تقویت بخشتی ہیں کہ یہ دنیا نامکمل ہے۔ اس عارضی دنیا کے نامکمل ہونے کی ایک اور دلیل یہ بھی ہے کہ کوئی ایک شخص بھی اس دنیا سے اس حالت میں نہیں گیا ہے کہ اس کے تمام ادھورے کام مکمل ہوئے ہو۔ کوئی بھی نہیں گیا۔ کچھ نہ کچھ چھوڑ کے گیا ہے۔ یہ بات مُسّلم ہے کہ یہ دنیا نامکمل اور عارضی ہے اور اس پر پوری انسانیت کا اجماع ہے۔

اب تھوڑے وقت کے لئے اس نامکمل دنیا کی بحث کو یہیں پر مؤخر کرتے ہیں۔ آپ نے شروع میں بتایا کہ آپ سائنس کے طالب علم ہے۔ الیکٹرون پروٹان کو اچھی طرح جانتے ہوں گے ۔کیا الیکٹران کی زندگی ممکن ہو سکتی ہے اگر پروٹان نہ ہو۔ اسطرح کیا پروٹان کی زندگی ممکن ہو سکتی ہے اگر الیکٹران نہ ہو۔ اس وقت گفتگو ان ذرات کے چارج پر ہو رہی ہے اس کو اگر زیادہ وسیع مفہوم میں بولا جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ اگر منفی چارج نہ ہوتا تو مثبت چارج کا وجود بھی نہ ہوتا۔ یعنی مثبت اور منفی چارج ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ اب ذرا یہ بتائیں کہ کیا ان کی عدم موجودگی میں مادے کا وجود ممکن ہو سکتا تھا۔۔۔نا ممکن۔۔۔۔۔بالکل ناممکن۔۔۔۔۔بلکہ اب تو سائنس نے دو قدم بڑھ کے اور ترقی کر لی ہے اور ان بنیادی ذرات کے اندر کے ذرات بھی دریافت کر لئے ہیں جن کو کوارکس (Quarks) کہتے ہیں۔ ان کو آپ جیسے فزکس کے طالبعلم سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ الیکٹران، پروٹان اور نیوٹران ان کوارکس سے بنے ہوتے ہیں ان کوارکس میں سے بعض پر مثبت اور بعض پر منفی چارج ہوتا ہے۔ نیوٹران جو کہ مجموعی طور پر نیوٹرل ذرہ ہے اور اس پر کوئی چارج نہیں ہوتا۔ موجودہ سائنس نے ثابت کر دیا کہ چارج کے یہ جوڑے اس نیوٹرل ذرے کے اندر کوارکس کی شکل میں موجود ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ مثبت اور منفی جوڑے وہاں بھی بنتے ہیں۔ یہ تو ان ذرات کی ساخت ہوگئی، اب ذرا ان کے توازن و حرکات کا معائنہ

کرتے ہیں۔ جب تک ایٹم کے اندر کولمب فورس(Coulomb Force)اور سینٹری پیٹل فورس(Centripetal Force) آپس میں برابر نہ ہو جائیں تب تک ایٹم کا وجود ہی ناممکن ہے۔ اگر کولمب فورس بڑھ جائے تو عین ممکن ہے کہ الیکٹران نیوکلیئس میں گر جائے اوراگر سینٹری پیٹل فورس بڑھ جائے تو عین ممکن ہے کہ الیکٹران نیوکلیئس سے بغاوت کر جائے۔ لہٰذا یہ بھی ثابت شدہ حقیقت ہے کہ یہاں بھی فورسز کا یہ جوڑہ کولمب اور سینٹری پیٹل فورسز کی شکل میں موجود ہیں۔

اب آتے ہیں معمول کی زندگی کی مثالوں کی طرف۔ کیا مَرد اس دنیا میں عورت کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے؟ اسی طرح کیا عورت اپنا وجود برقرار رکھ سکتی ہے مرد کے بغیر۔ لہٰذا یہ جوڑے یہاں بھی ہیں اورایک دوسرے کے بغیر ناممکن ہے اوراس پر مستزاد یہ کہ اسکے تناسب پر تو ذرا غور کرو۔ ازل سے لیکر آج تک خدائے بزرگ وبرتر نے اس میں متوازن تناسب قائم کیا ہوا ہے۔ یہ جوڑے صرف انسانوں میں نہیں بلکہ ہر ذی روح میں ہیں۔ پرندوں، جانوروں، پودوں، کیڑے مکوڑوں غرض سب میں نر اور مادے کے جوڑے موجود ہیں۔ یعنی یہاں بھی جوڑے ہی جوڑے۔ اب آتے ہیں ضروریات واحساسات کی طرف۔ اگر پیاس ہے تو اسکے لئے بطورِ جوڑا مشروبات ہیں۔ اگر بھوک ہے تو اس کے لئے بطورِ جوڑا ماکولات ہیں۔ یعنی یہاں بھی جوڑے ہی جوڑے۔ غرض یہ کہ مخلوق میں سے جس چیز کا بھی مشاہدہ کرو جوڑوں ہی کی شکل میں نظر آئیں گے۔

اس کو دلیل بنا کر کیا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اگر امید وخواہشات ہیں جو کہ حقیقت میں ہیں تو اسکے لئے بھی جوڑا ہونا چاہیئے اوراسکی تکمیل بھی ضرور ہونی چاہیئے۔ کیونکہ اس کا وجود اس کے تکمیل کا تقاضہ کرتی ہے۔ اس طرح اگر محنت ہے تو اس کی جزا بھی ضرور ہونی چاہیئے اگر ظلم ہے تو سزا بھی ضرور ہونی چاہیئے۔ غرضیکہ اس بحث سے ہم اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ ایک کے بغیر دوسرا ادھورا ہے۔ ان تمام کے مخلوق ہونے کا تقاضہ ہے کہ ان کا جوڑا

موجود رہے تا کہ وہ ایک دوسرے کے اثر کو زائل کر سکے اور ایک دوسرے پر انحصار کر کے تکمیل کی طرف سفر کر سکے۔ جب اتنے جوڑے ہیں اور ضروری بھی ہیں تو اس دنیا کے نامکمل ہونے کی وجہ سے اس میں کیا چیز مانع ہے کہ اس کا جوڑا نہ مانا جائے؟ جب دنیا کا وجود ہے اور وہ بھی نامکمل تو کیا اس کے لئے ایک ایسی دنیا کا ہونا لازمی نہیں ہے جہاں انکی تکمیل ہو؟ بالکل ضروری اور لازمی ہے اور ازحد ضروری ہے۔ اسی دوسری دنیا کو ہم مذہبی لوگ آخرت کہتے ہیں جو کہ حقیقتاً اس دنیا کا جوڑا ہے اور وہاں ان سب عوامل کا ازالہ کیا جائے گا جس کا آپ نے ذکر فرمایا ہے اور کیا یہ ازالہ انسان کی فطرت میں نہیں ہے؟۔۔۔ ہے اور بالکل ہے۔۔۔۔۔ میری فطرت پکار رہی ہے اور بار بار پکار رہی ہے کہ میں نے جتنا کام کیا ہے مجھے اس جتنا پھل ملے اس سے کم پر کسی صورت بھی راضی ہونے کو تیار نہیں۔ اب کوئی بھی صاحب فہم و شعور مجھے بتائیں کہ کیا ایسا پھل اس عارضی دنیا میں ہر ایک کو صحیح صحیح مل رہا ہے؟ امید ہے پوری انسانیت کا جواب نفی میں ہو گا۔ تو کیوں نہ میں اس پھل کو حاصل کرنے کے لئے دوسری دنیا پر اکتفا کروں جو کہ حقیقت بھی ہے اور میری فطرت کی پکار بھی ہے۔

اب جیسے ہی آپ دوسری دنیا کو تسلیم کریں گے اس کے ساتھ ہی ایک ایسے قادر مطلق ہستی کو ہر صورت میں قبول کرنا پڑے گا جو کہ مکمل انصاف والا ہو۔ پوری طاقت رکھنے والا ہو۔ انتہائی اعلیٰ اور ارفع خزانوں کا مالک ہو۔ سخاوت میں اپنی مثال آپ ہو اور انتہائی لطیف ہو جو کہ لفظ لفظ بلکہ حرف حرف بلکہ نقطے نقطے سے باخبر ہو۔

کیونکہ اگر انصاف والا نہ ہو تو اس دنیا اور اُس دنیا میں کوئی فرق نہیں رہ پائے گا لہٰذا تکمیل نامکمل رہے گی۔ اگر طاقت والا نہ ہو تو اس دنیا کے طاقتوروں اور ظالموں کو کسی صورت زیر نہیں کر سکے گا جو کہ انصاف کی تکمیل میں رکاوٹ بنے گی۔ اگر انتہائی اعلیٰ اور ارفع خزانوں والا نہ ہو تو میرے دل میں جو امید و خواہشات ہیں جسکو صرف تخیل کی پریاں احاطے میں لے سکتی ہیں اس کی تکمیل نہیں ہو سکے گی۔ اگر سخی نہ ہو تو ایسے خزانوں کا کیا جن سے

میری مُرادیں پوری نہ ہو۔ لہٰذا تکمیل پھر بھی نامکمل ہو جائے گی اور اگر پوری طرح باخبر نہ ہو، تو محنت کی جزا اور ظلم کی سزا کس طرح ممکن ہو سکے گی کیونکہ اس کے لئے سب سے پہلے جج کو حالات و واقعات کا مکمل علم ہونا ضروری ہے۔ میرے دل میں آئے ہوئے ہر خواہش کے علم کا ہونا بھی ضروری ہے وگرنہ اِس دنیا اور اُس دنیا میں کوئی فرق نہیں رہ پائے گا۔

عُویم بالکل گُم سُم بیٹھا ہمہ تن گوش بنا ہوا تھا اور عبد الاحد صاحب کی باتوں میں پورے شعور کے ساتھ محو تھا۔

نمبر 3: تیسری بات جو آپ کے گفتگو کا حصہ تھی وہ یہ کہ آپ کا دل خدا کے انکار میں آپکا ساتھ نہیں دے رہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ خدا کے اقرار کا اس سے بڑا ثبوت ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ جو انکار خدا پر آپ کے اندر سے آواز آتی ہے جسے آپ دل کے نہ ماننے سے تعبیر کر رہے ہیں اسکو قرآن کریم نے نفسِ لوّامہ کہا ہے۔ نفسِ لوامہ کو ہم روزمرہ زندگی میں ضمیر کہتے ہیں۔ قرآن کریم نے اسی ضمیر کی قسم کھا کے انسانیت کو خبردار کیا ہے کہ آپ کے اعمال کی پوچھ گچھ ضرور ہو گی۔

اب ذرا ضمیر کے کمالات دیکھئے۔ آپ نے مشاہدہ کیا ہو گا کہ جب آپ کوئی غلط کام سرانجام دیتے ہیں تو آپ کے اندر سے کوئی آپکو ملامت کر رہا ہوتا ہے۔ آپ کو کَھری کَھری سُناتا ہے اس کے برعکس جب آپ کوئی اچھائی کا کام سرانجام دیتے ہیں تو ایک اطمینان کی کیفیت آپ پر طاری ہو جاتی ہے اور آپ ایک غیبی تھپکی محسوس کرتے ہیں۔ یہ برائی یہ سرزنش اور اس کے نتیجے میں اضطراب جبکہ بھلائی پر داد و تحسین اوراس کے نتیجے میں اطمینان انسان کے اندر کہاں آیا؟۔۔۔۔ یہ برائی کے لئے انسان کی پیدائشی نفرت اور بھلائی کے لئے انسان کی پیدائشی محبت کہاں سے آئی؟ یہ بھلائی اور برائی کے جو مسلّمات ہیں جو کہ کسی استاد کے تدریس کی محتاج نہیں۔ یہ انسان کو شروع دن سے کون بتا دیتا ہے؟ یہ سب کچھ ضمیر کی درسگاہ میں انسان کو پڑھائی گئی ہیں۔ یہ ضمیر برائی کے لئے کڑوا اور بھلائی کے لئے

شیریں ثابت ہوا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کڑواہٹ اور شیرینی کے لئے کسی کا مذہبی ہونا ضروری نہیں بلکہ یہ حقیقت انسانوں کے لئے یکساں ہے۔ یہ انسانیت کا اجتماعی ورثہ ہے۔ انسان کو اسی ہی شاہکار فطرت پر پیدا کیا گیا ہے۔ بلکہ اس فطرت کو اگر میں زیادہ وسیع مفہوم میں بیان کروں۔ تو یوں ہو گا کہ تین چیزیں ایسی ہیں جسے انسان کو سمجھانے کے لئے کسی استاد کی ضرورت نہیں پڑتی۔ یہ انسان کی فطرت میں ودیعت کر دی گئی ہیں۔ ہر ذی عقل و ذی شعور انسان کو اس کی سمجھ بوجھ عطا کر دی گئی ہے۔ پہلا یہ کہ زندگی انسان کو کم از کم ایک موقع ایسا ضرور فراہم کرتی ہے جس میں وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس کائنات کا کوئی خالق و مالک ضرور ہے اس خالق و مالک کے بغیر یہ کائنات اور اسکا وجود ناممکن ہے۔ دوسرا یہ کہ انسان اچھائی اور برائی میں مکمل طور پر تمیز کر سکتا ہے۔ اور تیسرا یہ کہ ہر انسان کو اس کا ادراک حاصل ہے کہ اچھائی کے بدلے میں جزا ہے اور برائی کے بدلے میں سزا۔ ان تین مسلّمات میں کسی قسم کا امتیاز نہیں بَرتا گیا۔ یہ ہر مسلمان کو بھی بخشش دیا گیا ہے، ہر مسیحی کو، ہر یہودی، ہر ملحد، ہر لاادری وغیرہ ہر ایک کو۔ تو آپ مجھے بتائے میرے بیٹے! کہ جب ایک چھوٹے سے مٹی کے پتلے میں فطری طور پر ان خصائص کا اہتمام کیا گیا ہے اور ہر اچھائی اور برائی کے لئے عدالت قائم کر دی گئی ہے جو کہ بغیر کسی خوف کے سچ کے ساتھ اپنا فیصلہ سناتی ہے، تو اس بڑے کائنات کے لئے عدالت کو نہ ماننے میں کیا حرج ہے؟ جب اس عالم اصغر کے لئے عدالت صغریٰ موجود ہے تو اس پورے عالم اکبر کے لئے عدالت کبریٰ کے نہ ماننے کی کیا دلیل ہو سکتی ہے؟۔۔۔ کوئی بھی دلیل نہیں۔۔۔۔۔۔ کچھ بھی نہیں۔ موت کے بعد عدالت کبریٰ کا واقع ہونا ایک اٹل حقیقت ہے جسے کسی بھی طرح سے جھٹلانا ناممکن ہے۔ وہ ہونی شدنی ہے۔ وہ ہو کر رہے گی۔ کوئی بھی طاقت اسے نہ مؤخر کر سکتی ہے نہ معطل اور نہ موقوف و منسوخ۔ لہٰذا جب وہ ہونی ہی ہے تو پھر بات وہیں پر پہنچ جاتی ہے کہ جیسے ہی

آپ موت کے بعد کی دنیا اور عدالت کبریٰ کو تسلیم کرینگے تو اس کے ساتھ ضرور ایک قادر مطلق ہستی کو ہر صورت میں قبول کرنا پڑے گا۔

عبد الاحد صاحب کا لہجہ و انداز احساس تفاخر سے لبریز تھا۔ جب کہ عُویم ٹکٹکی باندھ کر استاد کو دیکھ رہا تھا۔ وہ حیرانی و پریشانی کے درمیان لٹک گیا تھا۔ اتنی لمبی گفتگو استاد نے کی جبکہ حلق عُویم کا خشک ہو گیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ استاد خاموش ہو جائے بلکہ بولتا ہی جائے لیکن استاد نے بات ختم کرتے ہی خاموشی اختیار کی اور عُویم کے جواب کا انتظار کرتا رہا۔ لیکن عُویم بھی خاموش رہا اور خاموشی کے ذریعے استاد کو دوبارہ گفتگو شروع کرنے کی دعوت دیتا رہا۔ خاموشی کو مزید طُول نہ دینے کی خاطر استاد دوبارہ گویا ہوا۔

عُویم بیٹا!۔۔۔ اب ہمیں جانا چاہیئے۔ مجھے ایک اور میٹنگ بھی اٹینڈ کرنی ہے۔

یہ سنتے ہی عُویم ایسا چونکا جیسا کسی نے اسے نیند سے جگایا ہو۔

جی۔۔۔ ضرور۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے سر۔

اُس نے رُک رُک کر کہا۔۔ اور رخصت ہونے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ سر! کیا آپ سے دوبارہ بھی ملاقات ہو سکتی ہے؟

عُویم نے محفل سے رخصت ہوتے وقت استاد سے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھ لیا۔

ضرور۔۔۔۔۔ بے شک۔۔۔۔ ہمارے دروازے آپ جیسے طالب علموں کے لئے ہر وقت کھلے رہتے ہیں۔

عبد الاحد صاحب نے کھڑے ہو کر عُویم کو کندھے پر تھپکی دی اور رخصت کیا۔ عُویم کے رخصت ہوتے ہی ایک دوست نے عبد الاحد صاحب سے پوچھا۔

سائنس کا طالب علم تھا اور سنجیدہ بھی تھا تو آپ نے مزید گفتگو کیوں نہیں کی سائنسی تناظر میں؟

میں نے قصداً گفتگو ختم کی کیونکہ ایک تو وقت کم ہے اور ہمیں جانا بھی ہے اور دوسرا میں چاہتا تھا کہ اسے ہوم ورک کے لئے اتنا کام ملے جتنا وہ کر سکے۔ میں اتنے دلائل مہیا کرنا چاہتا تھا جتنا وہ ہضم کر سکے۔ جس پر وہ "الف سے ی" تک سوچ سکے اور بار بار سوچ سکے۔ اگر گفتگو زیادہ ہو جاتی تو امکان تھا کہ اس سے کچھ پوائنٹس نظر انداز ہو جاتے اور یہ میرے خیال میں اچھا تدریسانہ رویہ نہیں۔

عبد الاحد صاحب نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

باب دوازدہم

اَدبیات

ادب کیا ہے؟

میم سلمٰی نے کلاس میں آتے ہی وائٹ بورڈ پر سوال لکھ دیا اور ساتھ ہی ہاتھ میں پکڑے ہوئے دو پین ہوا میں لہراتے ہوئے کلاس سے دوسرا سوال بھی پوچھ لیا۔

آپ اِن میں سے کون سا پین لینا پسند فرمائیں گے؟

پوری کلاس نے دائیں ہاتھ میں پکڑے ہوئے پین کی طرف اشارہ کیا۔

میم سلمٰی نے مسکراتے ہوئے وجہ پوچھی۔۔۔۔کیوں؟اور بائیں ہاتھ کو لہراتے ہوئے کہا۔۔۔۔ یہ والا پین کیوں نہیں۔ حالانکہ دونوں پین ایک ہی کمپنی کے ہیں اور دونوں کی افادیت ایک ہی جیسی ہے، دونوں ایک ہی جیسا کام کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک پین نیا ہے اور دوسرا پرانا اور خستہ ہو چکا ہے۔

ہم نے نئے اور صاف ستھرے پین کا انتخاب اس لیے کیا کہ یہ ہمارے ذوقِ جمالیات کو تسکین دیتا ہے۔

کونے میں بیٹھی ایک طالبہ نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

بہت خوب۔۔۔۔۔ بہترین جواب۔

میم سلمٰی نے داد دیتے ہوئے اس کے جواب کی تصدیق کر دی۔

اب یہی مثال اگر میں تحریر و گفتگو پر چسپاں کر دوں تو میرے اس سوال کی تشفی ہوتی ہے جو میں نے بورڈ پر تحریر کیا ہے یعنی ادب کیا ہے۔ آیئے اس پر مزید گفتگو کرتے ہیں تا کہ گرہیں مزید کُھل جائیں۔ آپ میں جو اس سوال کا جواب دینا چاہتا ہے وہ اپنی رائے کا اظہار کرے۔

میم سلمٰی نے شمع دان کلاس کے سامنے رکھ دی۔

"ادب ایک مہذب انسان کی زندگی کا عکس ہے"۔

کلاس کی طرف سے جوابات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

"وہ تمام معلومات جو کتابوں سے حاصل ہوتی ہے ادب کہلاتی ہیں"۔

"ادب زبان کی وہ روح ہے جس میں وہ اپنے دور کے بہترین خیالات کا اظہار کرتا ہے"۔

"جذبات واحساسات کی صحیح اور پر کشش عکاسی ادب کے دائرے میں آتی ہے"۔

"وہ تحریر جو دل کو چھولے ادبی تحریر کہلاتی ہے"۔

"ادبی تحریر مناسب الفاظ کی مناسب ترتیب کا نام ہے"۔

"ادب وہ علمی کوشش ہے جو انسان اپنے گفتگو اور تحریر میں شائستگی پیدا کرنے کے لیے کرتا ہے تا کہ اس میں خوبصورتی پیدا ہو"

"ادب انسان کو مہذب بنانے کی سعی ہے"۔

میم سلمٰی مسکراتے ہوئے طلباء کے خیالات سن رہی تھی۔ وہ سَر کو تفہیمی انداز میں جنبش دے رہی تھی اورآنکھوں ہی آنکھوں میں سنانے والے کو داد بھی دے رہی تھی۔جب کلاس میں خاموشی چھا گئی تو میم سلمٰی نے طلباء کے خیالات کو آگے بڑھاتے ہوئے ادب پر گفتگو شروع کی۔

آپ سب نے ادب کی بہترین اوراچھی تعریفیں پیش کی اب ذراان کی وضاحت کرتے ہیں۔

ایک دن میں مرزاغالب کی غزلیں سن رہی تھی جن کو ایک گلو گار گُنگنارہا تھا۔ وہ گلو گار اپنے تیئں کافی کوشش کر رہا تھا کہ غزل کا حق ادا کیا جائے لیکن بد قسمتی سے وہ پورا نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے فوراً یہیں غزلیں بآواز جگجیت سنگھ یاد آ گئیں۔ سو یوٹیوب(Youtube) پر تلاش کر کے پلے(Play) کر دیں۔ سنتے ہوئے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسا کہ غالب نے یہ غزلیں جگجیت ہی کے لیے لکھی ہو اور جگجیت ان کا پورا پورا حق ادا کر رہا ہو۔ یہی باہمی ملاپ، ادب ہے کہ جوڑ باہم پیوست ہو جائے یعنی لکھاری اور قاری متفقہ طور پر باہمی احساسات کے ساتھ محو سفر ہو جائیں۔ اس مثال کے مطابق ادب کی ایک تعریف یوں بنتی ہے کہ "اظہار کی خوبصورتی اور خوبصورتی کا اظہار" ادب ہے۔ غالب اظہار کی خوبصورتی پیش کر رہا ہے اور جگجیت خوبصورتی کا اظہار کر رہا ہے اسی طرح پشتو میں غنی خان اور سر دار علی ٹکر ہے۔ غنی خان کا مقام اظہار کی خوبصورتی ہے اور سر دار علی ٹکر کا مقام خوبصورتی کا اظہار ہے۔

سروش! آپ کوئی اور مثال پیش کر سکتی ہیں؟ سروش جو ہمہ تن گوش بنی بیٹھی تھی اور میم کی باتوں میں گم تھی اچانک سوال پر چوکنا ہو گئی۔

جی۔۔۔ میم۔۔۔ فیض احمد فیض اور مہدی حسن۔

تھوڑے وقفے کے بعد جواب دیا جس کو میم سلمٰی نے خوب سراہا،۔۔۔۔ بہت خوب۔

اچھا! اب ذرا ادب کی افادیت پر بات کرتے ہیں۔

انسان اللہ تعالیٰ کی ایک برتر اور باشعور ہستی ہے اس ہستی میں بیک وقت تین مختلف قسم کی باہم مربوط علمی فیکٹریاں کام کر رہی ہوتی ہیں جس سے مختلف پراڈکٹس نکلتی رہتی ہیں۔ ایک انسان کا عقلی شعور ہے جس سے تمام علوم یعنی نیچرل سائنسز اور سوشل سائنسز وغیرہ پیدا ہوتے ہیں۔ عقلی شعور انسان کو بھلے بُرے اور صحیح و غلط میں تمیز سکھاتی

ہے۔ دوسرا انسان کا اخلاقی شعور ہے جس سے مذاہب پیدا ہوتے ہیں یہ شعور انسان کو حق و باطل اور حلال و حرام سکھاتی ہے اور تیسرا اس کا جمالیاتی شعور ہے جس سے ادبیات پیدا ہوتے ہیں یہ شعور انسان کو خوبصورتی اور بدصورتی میں فرق سکھاتی ہے یہ تینوں شعور آپس میں باہم مربوط اور بیک وقت کام کر رہے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے پر منحصر بھی ہوتے ہیں۔

اب ذرا ایک منٹ کے لیے سوچیں کہ اگر خدانخواستہ کسی کے جمالیاتی شعور پر گرد پڑ جائیں یعنی ادبیات کی پراڈکٹس بند ہو جائیں تو وہ صرف چیزوں کو بھلے بُرے، صحیح غلط، حق و باطل اور حلال و حرام میں پرکھے گا لیکن خوبصورتی و بدصورتی کا ادراک کرنا اس کے لیے ناممکن ہو جائے گا۔ کیا ایسا ہونا بہت بڑا نقص نہیں جو انسانی وجود میں رہ جائے؟

پوری کلاس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میرے لیے خدا اگر خوبصورت نہیں تو اس سے مجھے وہ تسکین حاصل ہو ہی نہیں سکتی جو ایک خالق کے ساتھ زندہ تعلق کا خاصہ ہے اور یہ تسکین مجھے میرے جمالیاتی شعور کے پختہ ہونے سے ہی حاصل ہو گی۔ یہ جمالیاتی شعور میرے عقائد، نظریات اور اعمال کو پرکشش بنانے کا کام کرتی ہے ان کو بدلے بغیر اور ان کو چھیڑے بغیر۔ کیونکہ جمالیات نظریہ دینے کا نام نہیں بلکہ یہ میرے مانے ہوئے نظریے کی تزئین کرتی ہے۔ اسے خوبصورتی بناتی ہے تاکہ اس سے مجھے تسکین حاصل ہو۔ اس میں میرا دل لگے۔ بحیثیت انسان مجھے یہ شرف حاصل ہے اور جانوروں پر یہی میرا اعزاز ہے کہ میں پھول اور کانٹے میں فرق سمجھ سکتی ہوں، میں موسیقی سمجھتی ہوں اور جانتی ہوں تبھی تو اس سے حظّ اٹھاتی ہوں۔ میری فطرت میں اس کا داعیہ رکھا گیا ہے۔ میں موسم کی دلفریب اٹھکھیلیاں محسوس کرتی ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ مجھے صرف تعمیر ہونے سے غرض نہیں بلکہ مجھے پرکشش تعمیر ہونا مطلوب ہے کیونکہ میں صرف مادے کا ڈھیر نہیں بلکہ روح کا نغمہ بھی ہوں اور میرے روح کا اطمینان میرے احساس جمال

کی تشفّی سے عبارت ہے کیونکہ یہی سے تہذیب ابھرتی ہے۔ یہی سے شائستگی کمال کو پہنچتی ہے اور یہی سے خوبصورتی پیدا ہوتی ہے۔

میم سلمیٰ ہلکی سی جذباتی ہوگئی اس کی آواز کسی حد تک وفورِ جوش سے مرتعش تھی۔ دوسری طرف کلاس میں مکمل سناٹا تھا جیسا کہ کوئی موجود ہی نہ ہو۔ اس نے ہلکا سا وقفہ لیا اور منٹ دو منٹ کے لیے کرسی پر بیٹھ گئی پھر کھڑی ہو کر دوبارہ شروع ہوگئی۔

اب میں آپ کو اچھے ادب کی خاصیت بتاتی ہوں کہ اچھا اور بلیغ ادب کیا ہے۔

سب سے پہلے تو وہ ادب بہترین گردانا جائے گا جو تہذیب و اخلاق کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہو۔ اس کے بعد وہ تمام خاصیتیں جو ہم نے کلاس میں بیان کیں ان کا بدرجہ اتم موجود ہونا اچھے ادب کی نشانی ہے اس کے ساتھ ساتھ اچھے ادب کی ایک انفرادی خاصیت یہ ہے کہ اس کی مختلف تعبیریں ممکن ہوتی ہیں۔ ایک ایک لفظ میں معنی کی کئی کئی تہیں ہوتی ہیں۔ ہر فقرہ مفہوم کے کئی کئی جہتیں رکھتا ہے جس کو مختلف الزماں و مختلف المکان معاشرے کے لیے موزوں قرار دیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن مجید۔۔۔ قرآن مجید ادب کا بہترین اور بے مثال شہ پارہ ہے جس کے پایے کی مثال دنیائے ادب کے پاس موجود نہیں۔ یہ چودہ سو سال سے لے کر آج تک ہر ایک معاشرے کے لیے مختلف ہائے تعبیریں فراہم کرتا آرہا ہے اور آگے بھی فراہم کرتا رہے گا۔

میم سلمیٰ نے دیوار پر لگی گھڑی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا، میرے خیال میں کلاس کا وقت ختم ہوا چاہتا ہے اور موضوع بھی اپنے اختتام کو پہنچتا ہے۔ لہٰذا آپ سے اجازت چاہتی ہوں۔

اللہ حافظ!

باب سیز دہم

تعارف و تاریخِ الحاد

عُویم! آپ کی اسائنمنٹ (Assignmnet) مسنگ (Missing) ہے اور آپ کل غیر حاضر بھی تھے آپ کی اسائنمنٹ سبمٹ (Submit) نہیں ہوئی۔

سَر فواد نے سٹوڈنٹس کی چیک شدہ اسائنمنٹس واپس تقسیم کرتے ہوئے عُویم سے دریافت کیا۔

سَر میں شہر سے باہر گیا ہوا تھا اس لیے غیر حاضر رہا۔ اگر اجازت ہو تو میں کل جمع کرا سکتا ہوں؟

ہاں ٹھیک ہے کل ہی جمع کرالو۔ لیکن اصول کے مطابق پینلٹی (Penalty) کے طور پر 20 فیصد مارکس کم ملیں گے۔

سرَ فواد نے اجازت کے ساتھ ساتھ مارکنگ کا فارمولہ بھی بتا دیا کہ اب آپ کی مارکنگ 100 کی بجائے 80 میں شمار کی جائے گی۔

ٹھیک ہے سَر۔۔۔ کوئی بات نہیں۔۔۔ عُویم نے شکریے کے ساتھ جواب دیا۔

کلاس کے ختم ہونے پر کچھ طلباء باہر لان (Lawn) میں چلے گئے، کوئی لائبریری چلا گیا کوئی کسی ٹیچر سے ملنے گیا کیونکہ اگلی کلاس فری تھی۔ عُویم دوستوں سمیت لان میں آگیا۔

جب کل اسائنمنٹ سبمٹ ہو رہی تھی تو میرے لئے بھی ایک اسائنمنٹ لکھ لیتے اور جمع کرا لیتے کونسا لوہے کے چنے چبانے تھے۔

عُویم نے دوستوں سے مخاطب ہو کے اپنا حق جتاتے ہوئے استفسار کیا۔

یار! ہمیں کب پتہ تھا کہ آپ غیر حاضر ہونگے اور ویسے بھی سَر فواد کی کلاس پہلی ہی کلاس ہوتی ہے جس میں اتنا موقع کہاں ملتا ہے کہ اسائنمنٹ لکھی جائے اور جمع کی جائے اگر یہ کوئی دوسری یا تیسری کلاس میں سبمٹ کرنی پڑتی تو ضرور لکھ لیتے۔ اسمیں کیا مشکل ہے۔

آکاش نے منطقی اور حقیقت پر مبنی جواب دیا۔

ہاں! یہ تو ہے۔ عُویم نے سَر کو اثبات میں جنبش دی۔

لیکن اچھا ہے سَر فواد بڑے دل کا بندہ ہے بعد میں بھی سبمٹ کرا لیتا ہے۔

ویسے غلطی تو آپکی اپنی ہی ہے عُویم! اگر آپ نے چھٹی کا ارادہ کیا ہوا تھا تو کم از کم شام کو فون کر لیتے کہ آپ نے کل نہیں آنا تو ہم میں سے کوئی لکھ لیتا اور سبمٹ کرا دیتا۔ فردان نے کہا۔

بس یار موقع ہی نہیں ملا۔ عُویم نے جواب دیا۔

کیوں۔۔۔۔ اتنے مصروف تھے کیا۔۔۔ ویسے گئے کہاں تھے؟

فردان نے سوال پوچھ لیا۔

جناب عبد الاحد صاحب سے ملنے گیا تھا۔

عُویم نے بڑی شان کے ساتھ عبد الاحد صاحب کا نام لیا اس کے چہرے پر چمک تھی۔

اب یہ نیا صاحب کون آ گیا اور کس لیے ملنے گئے تھے۔

یہ ایک سکالر ہے انٹرنیٹ پر اس کا ڈیٹا مل گیا تھا پھر اس کی چند کتابیں پڑھیں۔۔۔ پھر ملاقات کا شوق پیدا ہو گیا اور یوں جا کے مل لیا۔۔۔۔ مزہ آ گیا۔ بڑا ہی نفیس بندہ ہے آپ کو اس بات کا احساس ہی نہیں ہونے دیتا کہ آپ اس سے سوال پوچھ رہے ہیں اور وہ جواب دے رہا ہے بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے دو دیرینہ دوست آپس میں گفتگو کر رہے ہیں جن سے کافی خوب جان پہچان ہے وہ اپنے آپ کو اور اپنے علم کو سامنے والے کے اعصاب پر

حاوی نہیں ہونے دیتا۔ مہمان بھی اس کے حلقے میں کافی مطمئن محسوس کرتا ہے ہم نے سنا تھا کہ حقیقی علم بندے میں عجز پیدا کرتا ہے۔اس قول زریں کی مجسّم شکل میں نے عبد الاحد صاحب کی شکل میں دیکھ لی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے جواب دینے کا جو انداز ہے ، دلچسپ۔۔۔انتہائی دلچسپ۔ سوال کو حصوں میں تحلیل کرکے جواب دیتا ہے تاکہ گڈمڈ نہ ہو۔ جواب میں ترجیحات کا تعین جس خوبصورتی کے ساتھ کرتا ہے اس میں اپنی مثال آپ ہے۔ اگر زندگی نے وفا کی اور وقت نے ساتھ دیا تو ایک دن آپ سب کی ملاقات کرواؤں گا۔

عُویم نے عبد الاحد صاحب کی تعریفوں کے پُل باندھ لیے۔

کاش کہ ہمارے سارے سکالرز اسی طرح ہوتے جس طرح آپ کہہ رہے ہیں بد قسمتی سے ہماراواسطہ تُرش رُو اور تلخ زبان حضرات سے ہو پڑا ہے جو علم سے تو خالی ہیں لیکن تکبر میں ہمالیہ کے سامنے بھی اکڑ کے چلتے ہیں۔ کیف نے تبصرہ کیا۔

بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔۔۔ دونوں طبقوں میں آسمان و زمین کا فرق ہے دونوں کے انداز فکر و ابلاغِ فکر میں بھی فرق ہے۔ علم کی دنیا میں یہ جو قبیح اور تلخ رویہ ہے جس کا کیف آپ نے ذکر کیا میرے خیال میں اس کے دو بنیادی وجوہات ہیں۔ پہلی بات یہ کہ ان لوگوں نے تحقیق کے کام میں غفلت سے کام لیا ہوتا ہے۔ یہ اپنے علمی میدان میں مہارت نہیں رکھتے کیونکہ یہ حضرات فنِ تحقیق سے ناواقف ہوتے ہیں۔ فنِ تحقیق سے واقفیت کے لیے بندے کو چاہیئے کہ فلسفے کو صحیح طرح سے پڑھ لیں۔ کیونکہ فلسفہ آپ کو تحقیق کا طریقہ کار سمجھاتا ہے۔ غور و فکر کے نئے راستے کھلواتا ہے، نت نئے زاویوں سے آشنا کراتا ہے موجودہ زمانے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ سائنس فلسفے کا تسلسل ہے۔ لہٰذا جو سکالر فلسفے یا سائنس سے دور ہو گا اُس میں تحقیق کا مادہ کم سے کم ہو گا۔ دوسری بات ادبیات کے میدان میں کج روی ہے جس شخص کی ادبیات پر نظر نہ ہو اس کو گفتگو کرنے کا صحیح سلیقہ نہیں آتا ہو گا۔ ادب

آپ کو یہ سکھاتا ہے کہ دوسرے کی بات کس طرح سمجھنی ہے اور اپنی بات کس طرح پہنچانی ہے۔ کلام کا حقیقی مفہوم اور مجازی مفہوم، استعارہ، تشبیہ، کنایہ، تمثیل، تنقید، ترجیحات کا تعین— یہ سب ادبیات کی مرہونِ منت ہے۔ لہٰذا کسی بھی علمی دنیا میں داخل ہونے سے پہلے ان دونوں میدانوں میں عقل و ہمت کے گھوڑے دوڑانا از حد ضروری ہے کیونکہ اول الذکر کھوج پرکھ سکھاتا ہے اور ثانی الذکر اسی کھوج پرکھ کے نتائج کا خوش اسلوبانہ بیان۔

عُویم نے پُر تفکر انداز سے علمی رویے و حصول کے شرائط بیان کیے۔

بہت خوب۔۔۔ ویسے کیا گفتگو ہوئی عبد الاحد صاحب سے۔

آکاش نے سوال پوچھ لیا۔

وہی جو سابقہ ہفتے ہاسٹل میں ہمارے درمیان ہوئی تھی۔ اسی کو آگے لے کے عبد الاحد صاحب نے ردِ الحاد اور وجودِ باری تعالیٰ پر اپنے دلائل دیے۔

تو آپ مطمئن ہوئے۔ آکاش نے کہا۔

دلائل تو عقلی تھے۔ عُویم نے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔

ویسے یہ الحاد آیا کہاں سے؟ فردان بیچ میں کود پڑا۔

اتنی لمبی گفتگو اور اتنا مختصر وقت۔۔۔۔۔ ابھی کچھ وقت بعد کلاس شروع ہونے والی ہے۔

عُویم نے سوال ٹالنے کی کوشش کی۔

وقت کے مطابق جتنا بتا سکتے ہو بتا دو۔ باقی پھر سہی۔ فردان اصرار سے بولا۔

ٹھیک ہے۔

عُویم نے "ٹھیک ہے" کے ساتھ گفتگو کا آغاز کیا۔

الحاد کا لفظ لَحَد کے مصدر سے نکلا ہے جس کے لغوی معنی ہے "راہِ راست سے ہٹنا"۔ انگریزی میں اسے "Atheism" کہا جاتا ہیں جو کہ Theism کی ضد ہے۔ Theos یونانی

زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہے خُدا۔ سو Theism کے معنی ہوئے "خدا کا اقرار کرنا" اور Athesim کے معنی ہوئے "خُدا کا انکار کرنا"۔ بعض مذہبی حضرات الحاد کو راہِ راست سے ہٹنے کی بنیاد پر شرک سے بھی تعبیر کرتے ہیں۔ جو کہ اصطلاحی مفہوم میں صحیح تعبیر نہیں ہے۔ شرک میں خدا کو مانا جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ اور چھوٹے چھوٹے خدا بھی شریک کئے جاتے ہیں۔ اپنی اصل میں یہ بھی راہِ راست سے ہٹنا ضرور ہے لیکن اصطلاحی مفہوم میں یہ الحاد نہیں بلکہ شرک ہے جس کی بہترین مثال مشرکین مکہ ہیں جن کو ملحدین کی بجائے مشرکین کہا گیا ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ مشرکین مکہ ان 360 بتوں کے ساتھ جو خانہ کعبہ میں رکھے گئے تھے ایک بڑا خدا بھی مانتے تھے اور صرف مانتے ہی نہ تھے بلکہ ان 360 بتوں سے اعلیٰ درجہ بھی دیتے تھے۔ جب کہ اس کے بر عکس الحاد اپنی اصطلاحی مفہوم میں سرے سے خدا کا انکار کرنا ہے۔

یہ تو ہوا لفظ الحاد کا تعارف، اب ذرا اس کی اساسی نظریات پر بات کرتے ہیں۔

الحاد نے اپنی بنیادیں مختلف نظریات پر استوار کیں ہوئی ہیں۔ پہلے اس کے نمائندے کہتے تھے کہ مادہ ازل سے ہے نہ اس کا کوئی آغاز ہے نہ انجام۔ لہٰذا پہلی بنیاد مادہ پرستی (Materialism) بنی۔ پھر ان لوگوں نے کہا کہ جس چیز کا عقل ادراک نہ کر سکے اور جو مشاہدے اور عقل کی گرفت میں نہ آسکے وہ وہم ہے۔ لہٰذا وہ موجود نہیں پس انہوں نے خدا کا انکار کیا۔ اس نظریے نے الحاد کو فلسفیانہ بنیاد فراہم کیا۔ اس کے بعد سائنس کا دور شروع ہوا جس کا بنیادی کام مادے کے قوانین دریافت کرنا ہیں لہٰذا ایک دفعہ پھر سے مادہ پرستی اپنے عروج پر چلی گئی اور لوگ سائنس کو خدا کا درجہ دینے لگ گئے۔ ایک وقت یوں آیا کہ خدا کو ڈر اور خوف کا منبع قرار دیا گیا۔ یعنی خدا کا وجود انسان کے اپنے ڈر کی وجہ سے انسان کی اپنی ہی پیداوار ہے لہٰذا اس خوف پر قابو پانے کے لئے خدا کا انکار ضروری ہے۔ اس نقطہ نظر سے الحاد کو نفسیاتی حمایت مل گئی۔ پھر ایک وقت آیا جب اچھائی اور بھلائی کو انسان

کے اپنے اخلاقی وجود کا ماحصل سمجھا گیا یوں خدا کو بے دخل کر دیا گیا۔ ایک وقت میں دولت کی غیر مساوی تقسیم کا ذمہ خدا پر ڈالا گیا اور یوں خدا کو غیر منصف کہہ کر ایک طرف کر دیا گیا۔ یہ وہ بنیادی نظریات ہیں جن کو طول دے دے کر ملحدین حضرات نے مابعد الطبیعیاتی عقائد ماننے سے انکار کر دیا۔

اب آتے ہیں اس کی تاریخ کی طرف۔ الحاد کی اصل تاریخ سولہویں صدی کے وسط میں مغرب سے شروع ہوتی ہے جو کہ اپنی اصل میں ایک بغاوت کا نتیجہ تھی۔ بعض ملحد حضرات اس کو کھینچ کر یونانی دور تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں اور اسکی کڑیاں وہاں کے فلسفیوں سے ملاتے ہیں۔ اس کے لئے مشہور فلسفی ہیراکلائٹس کا نام لیتے ہیں لیکن یہ توجیح میری نظر میں بالکل بے بنیاد ہے۔ فلسفے کی تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ ہیراکلائیٹس اس وقت کی دیوی دیوتاؤں پر تنقید کیا کرتے تھے لیکن اس سے یہ بات اخذ کرنا کہ وہ مذہب بیزار تھے عقل کے منافی ہے۔ اس رویے سے مذہب بیزاری کی بہ نسبت دیوی دیوتاؤں کی عبادت کا الگ اور انفرادی رخ زیادہ جھلکتا ہے کیونکہ اس کی تنقید کا ہدف وہ رسومات تھیں جسے وہ غیر مقدس قرار دیتا تھا۔ ایسی ہزارہا تنقیدیں ہم اس وقت معاشرے میں کھلے عام سنتے رہتے ہیں لیکن کبھی کسی نے دوسرے پر ملحد کا فتویٰ نہیں ٹھوکا۔ اس کے باوجود بھی اگر کوئی بضد ہو کہ ہیراکلائیٹس مذہب بیزار تھا یا اسی طرح کھوج لگا کر کھینچ تان کر چند اور حضرات کے نام گنوائے کہ وہ بھی پرانی تاریخ میں مذہب بیزاری کی فہرست میں آتے ہیں تب بھی اس سے الحاد کی وہ اصطلاحی مفہوم اور تشریح وتوضیح ہر صورت میں ناممکن ہے جو سولہویں صدی عیسوی سے شروع ہوئی اور ایک ادارے کی شکل اختیار کر گئی اور ایک مکمل فلسفہ بن گیا۔ شاذ ونادر کی بنیاد پر کبھی بھی بیانیے تشکیل نہیں پاتے۔ انسانی مزاج ورویہ بیان کی جگہ بیانیے کی گاڑی میں سفر کرتی ہے۔ فلسفے کی پوری تاریخ پر جن حضرات کی نظر ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ ان کی اکثریت مذہب کے قائل رہے ہیں۔

عُویم مکمل تفصیل کے ساتھ الحاد اور فلسفے پر گفتگو کر رہا تھا جن کو تمام دوست بڑے غور و فکر اورانہماک کے ساتھ سن رہے تھے خاص کر کیف گفتگو میں پوری طرح گم تھا۔

میں نے شروع میں کہا تھا کہ الحاد بطورِ تحریک سولہویں صدی عیسوی میں بغاوت کے نتیجے میں شروع ہوئی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ بغاوت کس کے خلاف تھی اور کیوں تھی۔۔۔۔۔ یہ بغاوت کلیسا اور بادشاہ کے استبدادی حکومت اور عمل دخل کے خلاف تھی ان کے ظلم وعدوان کے خلاف تھی ان کے اجارہ داری کے خلاف تھی جو یورپ سے آہستہ آہستہ پروان چڑھتی گئی اور یہاں تک پہنچ گئی جو آج ہم سب کے سامنے ہے۔

عُویم ہلکا سا خاموش ہو گیا کہ اس دوران فردان نے پوچھا۔

یہ کلیسا اور بادشاہ کا کیا گٹھ جوڑ تھا؟

مسیحیت حضرت عیسیٰؑ کے بعد انحرافات کا شکار ہو گئی اور کوئی عام انحرافات بھی نہیں بلکہ ایسے انحرافات کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ان انحرافات کا اثر بہت جلد رونما ہونے لگا۔ ابھی حضرت عیسیٰؑ کے حواری حیات ہی تھے کہ ان انحرافات نے رنگ جمانا شروع کیا جس نے مسیحیت کے بنیادی عقائد تک ہلا ڈالے۔ وقت گزرتا گیا اور چوتھی صدی عیسوی کے شروع میں مسیحیت قسطنطین پہنچ گئی۔ 325ء میں نیقیہ (Nicaea) کے مقام ازنیک (Iznik: موجودہ ترکی) پر پہلی مسیحی کونسل منعقد ہوئی جس میں مسیحیت کو بطورِ ریاستی مذہب قبول کر لیا گیا اور یوں شہنشاہ قسطنطین اول نے رومی سلطنت کے لیے مسیحیت کے مذہب کا اعلان کر دیا اور خود بھی مسیحیت اختیار کی۔ ریاستی مذہب ہونے کے ناطے یہاں دوسری دفعہ مسیحیت کے عقائد کے ساتھ انحرافات کا ایک اور کھیل کھیلا گیا۔ رومی لوگ جو شروع سے نظم و نسق کے ماہر چلے آئے تھے ادارے چلانا، قانون سازی کرنا، تنظیمی امور سنبھالنا ان کا پسندیدہ مشغلہ رہا تھا اور ان میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ انہوں نے مسیحیت کو ایک ادارے کی شکل دے دی۔ اسی طرح مذہب یہاں پر ایک ادارہ بن گیا جن کو کلیسا کہا جاتا

تھا۔ اس کا سربراہ پوپ کہلاتا تھا۔ اب یہ تو ایک قطعی امر ہے کہ جہاں عوام کا حق ایک ادارے کو سونپ دیا جاتا ہے تو عام آدمی کو وہاں تک رسد میں مشکلات حائل ہو جاتی ہیں۔ اور ہوا بھی یہی کہ آہستہ آہستہ کلیسا تک عامی آدمی کی پہنچ مشکل سے مشکل تر ہوتی گئی اور یوں کلیسا طاقتور سے طاقتور تر بنتا گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ اس نہج پر پہنچ گیا کہ ریاست کے ہر معاملے میں کلیسا کا عمل دخل ہوا کرتا تھا۔ یہ ملک کی تقریباً ایک تہائی زمین کا مالک ہوا کرتا تھا ۔ ریاست ان کے زیر سایہ تھی۔ یہاں تک کہ بادشاہ بھی ان کے احکام کے تابع ہوا کرتا تھا۔ اگر کہیں بادشاہ اور کلیسا کے درمیان چپقلش آتی تو اس کے پاس بادشاہ کو معزول کرانے کا اختیار ہوتا تھا اور معزول کرا بھی دیتا۔ اس سے ایک ایسا تاثر اُبھرا کہ کلیسا کے پاس اُلوہی سند کے ساتھ ساتھ ایک لامتناہی طاقت بھی موجود ہے۔

دوسری طرف روم میں مسیحیت کے آنے سے پہلے یہاں بھی کچھ عقائد موجود تھے جس کے ساتھ مسیحیت کو گڈ مڈ کر دیا گیا اور یوں مسیحیت جو پہلے بھی ابتدائی دور میں انحرافات کا شکار ہوئی تھی۔ اب ایک دفعہ پھر سے مظلوم بن گئی۔ ان موجودہ عقائد میں یہودیت تھی، رومیوں اور مصریوں کی بت پرستی تھی اور سب سے بڑھ کر فلسفیانہ افکار تھے جن میں سرفہرست رواقی فلسفہ تھا۔ یہ حضرات رُہبانیت پر یقین رکھتے تھے یعنی دنیا سے لاتعلقی اور اپنے وجود کی نفی کرنا ان کے ہاں مقصد اولین سمجھا جاتا تھا۔ یوں ان تمام عقائد کا ایک ملغوبہ بن کر مسیحیت میں مدغم ہوا جس کا اثر آج تک مسیحیت میں دیکھا جا سکتا تھا۔ ان تمام انحرافات کو ساتھ لئے مسیحیت نے روم پر قبضہ کر لیا اور کلیسا اور بادشاہ روم اکھٹے طور پر حکومت کرنے لگ گئے۔

اب ظاہر سی بات ہے کہ جب ایک پیغمبر کے دین میں اتنے انحرافات آجائیں اور اس کی اصل شکل بگڑ جائے تو وہ کس طرح عقل کی کسوٹی پر پورا اترے گی؟ بلکہ میرا تو ذاتی رجحان یہ ہے کہ مجھے جب دین کی کسی بات میں پیچیدگی نظر آجاتی ہے تو قدرتی بات ہے کہ مجھے

شک سا ہونے لگتا ہے کہ ہو نا ہو کہیں پر کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ کیونکہ اگر دین خدا کا عطیہ ہے تو ضرور اس کا رجحان سادگی کی طرف ہو گا۔ پوری انسانیت عمل کے معاملے میں آسانی اور سادگی کو پسند کرتی ہے۔ پیچیدگی فلسفے اور فقہ کو زیب دیتی ہے الوہی اور مطلق دین کو نہیں اور یہ ایک قطعی امر ہے کہ دین انسانیت کے لیے ہوتا ہے چند اشخاص یا کسی ایک دو مکتبہ فکر کے لئے نہیں۔ یہی پیچیدگی ان انحرافات اور کلیسا کو بطور ریاستی ادارہ قرار پانے کی وجہ سے میسحیت میں اپنا گھر کرتی گئی اور مسیحی عقائد میں نشو و نما پانے لگی اس پر مستزاد یہ کہ ریاستی جبر اور حکومتی مجبوریاں و پابندیاں شاملِ حال ہونے لگیں۔ کیونکہ میسحیت کو بزور تلوار رائج کرنے کی کوشش کی گئی اور جو بھی انکار کرتا اس کا سَر اڑایا جاتا تھا۔ بادشاہ اور پوپ آسمانی نمائندے قرار دیے گئے ان کے خلاف زبان کھولنا مذہب کی توہین سمجھا جانے لگا۔ عام آدمی کی مذہب اور حکومت تک رسائی ناممکن ہونے لگی۔ انجیل مقدس کی وہی شرح و تفصیل حرفِ آخر مقرر کی گئی جو کلیسا کے زیر اہتمام انجام کو پہنچی ہو۔ انجیل مقدس براہِ راست عوام الناس کی پہنچ میں نہ تھی۔

اس ظلم و عُدوان کا نتیجہ یہ ہوا کہ سولہویں صدی عیسوی کے شروعات میں کلیسا اور بادشاہ کے جبر اور گٹھ جوڑ کے خلاف عقلی تاویلیں آنی شروع ہو گئیں۔ اس لمبے عرصے میں جس میں یورپ سوتا رہا کو اہلِ یورپ ظلماتی دور یا تاریک دور کہتے ہیں۔ جس کو مارٹن لوتھر نے توڑنے کا عزم کیا۔ اس نے کلیسا کی اجارہ داری چیلنج کرنے کا تہیہ کر دیا۔ چرچ کو الہام کا وسیلہ ماننے سے انکار کر دیا اور مطالبہ کر دیا کہ انجیل مقدس کو عوام الناس کے ہاتھوں میں دیا جائے تاکہ وہ خود اسے براہِ راست سمجھ سکے اور خدا اور اس کے مخلوق کے درمیان کوئی پوپ حائل نہ ہونے پائے۔ انجیل مقدس کی سمجھ بوجھ میں اگر کوئی اختلاف آجائے تو پوپ کو کوئی الوہی سند نہ مانا جائے اور بدقسمتی سے یہی حال آج کل مسلمانوں، قرآن کریم اور مولوی حضرات کا ہے جو پروٹیسٹنٹ (Protestant) تحریک سے پہلے

مسیحیوں، انجیل مقدس اور پوپ حضرات کا تھا۔ مارٹن لوتھر کی اس تحریک سے مسیحیت میں ایک اور فرقہ بن گیا جس کو آج ہم پروٹیسٹنٹ کہتے ہیں۔ پروٹیسٹنٹ کی اس تحریک کو ریفارمیشن (Reformation) تحریک بھی کہا جاتا ہیں۔ پروٹیسٹنٹ فرقے کی پیدائش پر کلیسا میں ہلچل مچ گئی اوااس کو برداشت نہ کرنے کی ٹھان لی گئی۔ جس کا نتیجہ تلخ نکلا اور اس نئے فرقے پروٹیسٹنٹ اور پرانے فرقے کیتھولک میں جنگیں شروع ہو گئیں۔ کافی خون بہایا گیا۔ نتیجتاً عام آدمی کا مذہب سے اعتماد اٹھنا شروع ہو گیا کیونکہ ایک طرف تو وہ پہلے سے بھی کلیسا کے مظالم کا شکار رہا تھا اور پہلے ہی سے مذہب پر اس کے اعتماد کی ڈوریں کمزور پڑی ہوئی تھیں۔ ان موجودہ جنگوں نے اس کمزوری میں اوراضافہ کر دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسی سولہویں صدی عیسوی میں ری نی ساں (Reneaissance) کی تحریک بھی اٹھی جس سے فلسفہ، سائنس، ادبیات اور مختلف علوم پر از سرِ نو تحقیق شروع ہو گئی جس سے نئے نئے خیالات پیدا ہونے لگے۔ سائنسی ایجادات ہونے شروع ہو گئے۔ نئی دنیائیں تلاش کی جانے لگی۔ فرد آزادی کے مفہوم سے شناسا ہونے لگا۔ ان تمام امور کی وجہ سے روایتی اور کلیسائی تقدس تنقید کی زد میں آنے لگا۔ لہٰذا یہ بھی اہل کلیسا کے بھڑکنے اور مشتعل ہونے کا سامان مہیا کر گیا۔ اہلِ کلیسا کے بنیادی مقدمات میں سے ایک مقدمہ زمین کا کائنات کے محور ہونے کا تھا۔ اس عقیدے کو تحقیق سے چیلنج کر دیا گیا۔ یہ قدم سب سے پہلے پولینڈ کے ایک ماہر فلکیات کوپرنیکس نے اٹھایا۔ کوپرنیکس نے کہا کہ سورج محور ہے اور زمین سالانہ کے حساب سے اس کے ارد گرد گھومتی ہے۔ اس نئے خیالات کو منظر عام پر لاتے ہی اہل کلیسا آگ بگولہ ہو گئے۔ لیکن خوش قسمتی سے کوپرنیکس بذاتِ خود کلیسا کے ظلم و ستم کا نشانہ نہیں بنا کیونکہ اس کتاب کے شائع ہونے کے بعد جلد وہ 1543ء میں وفات پا گئے۔ اہل کلیسا نے اس نظریے کی بھرپور مخالفت کی۔ اور اس کی کتاب کو شیطانی وسوسہ قرار دیا گیا جو انجیل مقدس کے روح کے منافی ہے۔ اس کے بعد اور سائنسدانوں نے بھی یہی نظریہ پیش کیا جس میں

برونو اور گلیلیو زیادہ نمایاں تھے۔ برونو کو اپنے عقائد کی بنیاد پر پکڑ کر جیل میں ڈالا گیا اور تقریباً 6 سال تک جیل میں رکھا گیا۔ پھر بالآخر 1600ء میں آگ میں ڈال کر جلا یا دیا گیا۔ جب کہ گلیلیو جو تجربات کی مدد سے اپنی تحقیق ثابت کرنے کا ماہر تھا کو بھی اپنے عقائد کی بنیاد پر خطرناک انجام سے ڈرایا گیا لیکن وہ توبہ تائب ہو کر سزائے موت سے بچ گیا حالانکہ اسے بھی سزائے موت سنادی گئی تھی۔ یہ تو کلیسا کے ظلم کی چند مثالیں تھیں وگرنہ جو بھی عقلی اختلاف رکھتا وہ مذہبی انتہا پسندی کی زد میں آجاتا تھا اور موت اس کا مقدر ہوتی تھی۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ شدت پسندی اپنے انتہا کو پہنچی ہوئی اور ناقد کا درجہ مخالف کا ہوا کرتا تھا۔

ان سزاؤں اور ظلم وعدوان کا عام انسان پر بڑا گہرا اور برا اثر ہوا اور وہ مذہب سے کراہت محسوس کرنے لگ گیا۔ وہ مذہب کو قید خانے کی نظر سے دیکھنے لگا۔ جب کہ اس کے برعکس سائنسدان اور فلسفی حضرات نئی نئی دریافتیں کرتے رہے۔ ایک طرف آزاد خیالی اور آزاد فکر پروان چڑھنے لگا تو دوسری طرف ایجادات و دریافتیں عام انسان کی زندگی آسان سے آسان تر کرنے لگ گئی اور آسائشوں و رنگینیوں میں اضافہ ہونے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ رجحان بھی رنگ گہرا ہوتا گیا کہ اہلِ کلیسا اور جدید ذہن کا آپس میں بیر ہے اور ایک دوسرے کی ضد ہے۔ لہٰذا ری نی ساں کی تحریک بھی ریفارمیشن تحریک کی طرح اہلِ کلیسا کی کمزوری کا سبب بنا۔

جوں جوں وقت گزرتا گیا کلیسا کمزور ہوتا گیا اور یہ تحریکیں اور اس سے پیدا ہونے والا ذہن غالب آتا گیا۔ کلیسا کی یہ مخالفت مذہب کی مخالفت تھی کیونکہ کلیسا نے بذاتِ خود اپنی تقدیس کو مذہبی تقدیس کا نام دیا تھا۔ لہٰذا کلیسا سے بغاوت دراصل مذہب سے بغاوت کا ذریعہ بنی۔ اسی مذہب بیزاری کی کوکھ میں الحاد پلتا رہا اور جوان ہوتا گیا جو آج آپ سب کے سامنے ہے۔ اس پورے بحث سے ہم یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہیں کہ اپنی اصل میں الحاد کوئی

مذہب نہیں بلکہ ایک بغاوت ہے جو کلیسا سے مخالفت کے نتیجے میں پروان چڑھی ہے۔ یہ کوئی مستقل نظامِ حیات نہیں بلکہ مذہب پر سوال ہے صرف سوال۔

تینوں دوست خاموش بیٹھے سن رہے تھے اور عُویم لیکچرر کی طرح یورپ کی تاریخ پر روشنی ڈال رہا تھا۔ گفتگو کے اختتام پر عُویم کا لہجہ اچانک متحیر اور متفکر ہو گیا تھا اور اس پر سوچ و فکر کے گہرے بادل چھا گئے تھے۔ جیسا کہ وہ کسی اور دنیا میں گھوم رہا ہو جسمانی طور پر وہ دوستوں کے درمیان تھا لیکن ذہنی طور پر وہ کہیں اور تھا۔

آپ اس وقت کس خیال کے حامی ہیں۔

کیف نے عُویم سے سوال پوچھ کے دوسری دنیا سے کھینچ لے آیا۔

میں۔۔۔ میں سوالوں کی دنیا میں پھنسا ہوا ہوں۔ اضطراب کی چادر اوڑھے ہوئے استفہام کے گھر میں کرایہ دار کی شکل میں مقیم ہوں اور میرے خیال میں میری شُومئ قسمت ہے کہ اب میرے پاس کرایے کے پیسے بھی ختم ہوتے جا رہے ہیں۔

عُویم نے مسکرا کر کیف کی طرف رخ کر کے جواب دیا۔

اگر آپ کو یاد ہو عُویم! ایک دن آپ نے رچرڈ ڈاکنز کے بارے میں لاادری کا لفظ استعمال کیا تھا کہ بقول ان کے وہ لاادری ہے ملحد نہیں۔ یہ لاادری کیا ہے؟

آکاش نے ذہن پر زور دیتے ہوئے سوال پوچھ لیا۔

لاادریت۔۔۔ اس کو انگریزی میں Agnosticism کہتے ہیں اور اس کے ماننے والوں کو لاادری (Agnostic) کہا جاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہمیں نہیں معلوم کہ خدا ہے یا نہیں۔ یہ حضرات اقرار و انکار کے بیچ میں لٹکے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کو متشککین بھی کہا جاتا ہے کیونکہ یہ شک میں مبتلا ہوتے ہیں اور فیصلہ نہیں کر پاتے۔ اس نظریے کا ماخذ یہ ہے کہ خدا کا ہونا یا نہ ہونا انسان کے فہم کے بس کی بات نہیں اور انسان اپنے علم

اور مشاہدے کی بنیاد پر یہ معلوم کرنے میں بے بس ہے کہ خدا ہے یا نہیں۔ لہٰذا اس بحث کو شک کے صحرا میں چھوڑ دیا جائے اور اس پر مٹی ڈال دی جائے۔۔۔۔

اس طرح اس ضمن میں ایک اور نظریہ بھی موجود ہے۔۔۔۔ڈیزم (Deism)۔

یہ کہتے ہوئے سب نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے عُویم کو دیکھا جب کہ کیف سر نیچے کئے ہوئے خاموش بیٹھا تھا۔ عُویم ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ دوبارہ گویا ہوا۔

ان حضرات کا دعویٰ ہے کہ خدا موجود تو ہے اور اس نے دنیا تخلیق بھی کی ہے لیکن اس تخلیق کے بعد خدا اب دنیا سے الگ ہو گیا ہے۔ اب کائنات چلانے کے لئے خدا کی کوئی مداخلت نہیں ہے بلکہ فطری قوانین ہی ہیں جس کے مطابق دنیا کے شب و روز رونما ہو رہے ہیں اور کائنات چل رہی ہے۔ خدا کی موجودگی کی گواہی اور شہادت عقل، مشاہدہ اور فطرت ہے وحی کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں ہے۔

بعض حضرات ڈیزم کی مثال آٹومیٹک گھڑی (Automatic Watch) کی دیتے ہیں کہ جس طرح ایک میکینک آٹومیٹک گھڑی بنا کے اس سے بے فکر ہو جاتا ہے اور یہ چلتی رہتی ہے۔ اس طرح کائنات بھی ہے خدا نے اس کو بنا کے چھوڑ دیا ہے اب یہ اپنے قوانین کے مطابق چل رہی ہے۔ لیکن میری نظر میں یہ آٹومیٹک گھڑی کی مثال اس نظریے پر ٹھیک نہیں بیٹھتی۔ کیونکہ اگر اس مثال کو اس نظریے پر منطبق کیا جائے تو کائنات پر باہر سے ایک اور طاقت کو ماننا پڑے گا۔ آٹومیٹک گھڑی تب کام کرتی ہے جب اس کو کلائی (Wrist) کی طرف سے حرکت ملے اور گھڑی کا سیمی سرکلر ڈسک (Semi Circular Disk) متحرک ہو جائے۔ اس کے نتیجے میں باقی پُرزے گھڑی کے قوانین کے مطابق حرکت شروع کر دیتے ہیں۔ اگر اسی آٹومیٹک گھڑی کو ساکن رکھا جائے تو کچھ مدّت بعد وقت بتانے کی سوئیاں ساکن ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا اس گھڑی کو چلانے کے لئے بھی گھڑی کے باہر سے ایک قوت ہر وقت چاہیئے ہوتی ہے جس سے وہ ڈسک حرکت میں رہے۔

عُویم ابھی خاموش ہی ہوا تھا کہ فردان نے سیکولرازم کے بارے میں سوال داغ دیا۔
ان نظریوں میں ایک نظریہ سیکولرازم کا بھی ہے۔

بالکل ہے۔۔۔ اور میرے خیال میں ان تمام نظریوں میں سب سے متنازعہ نظریہ بھی ہے جس کی مختلف شعبوں میں مختلف زبانوں میں اور مختلف معاشروں میں الگ الگ تعریفیں اور وضاحتیں رہی ہیں۔ ایک اصطلاح جب کسی معاشرے میں جنم لیتی ہے تو جب وہ دوسری جگہ تک سفر کرتی ہے تو اکثر وبیشتر اس کے مفہوم میں تبدیلی رونما ہو جاتی ہے۔ یہ کوئی بعید از عقل مظہر نہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ایسا واقع ہر اصطلاح کے ساتھ ہو جبکہ سیکولرازم کے معاملے میں یہ تبدیلی صادق آتی ہے۔ تبھی تو میں نے اس کو سب سے متنازعہ نظریہ کہا کیونکہ اس پر اہلِ علوم کا اتفاق کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ مختلف معاشروں اور مختلف زمانوں میں اس کے الگ الگ مفہوم لئے گئے اور اس پر مستزاد یہ کہ ایک ہی وقت میں ایک ہی معاشرے میں مختلف شعبوں میں بھی مفہوم اور اطلاق پر اختلاف رہا بلکہ ابھی بھی ہے۔

سیکولرازم کے بانی برطانوی محقق جارج ہولی اوک تھے۔ جنہوں نے انیسویں صدی کے وسط میں یہ اصطلاح پیش کی اور "سیکولرازم کے اصول" (The Principles of Secularism) کی شکل میں سیکولرازم پر پہلی باقاعدہ تصنیف لکھ ڈالی۔ سیکولرازم کا تعلق انسانی مسائل (خاص کر انتظامی و سماجی مسائل) کے حل کے لیے ترجیح کا تعین تھا کہ انسانی دانش اور آسمانی روشنی میں کس کا سہارا لیا جائے؟ یہ مذہب کو انسان کے انفرادی اور ذاتی کردار تک محدود کرنے کے حق میں تھا کہ مذہب کا سروکار انسان کی ذات تک ہے سماج میں اس کا کوئی کردار نہیں۔ اسی وجہ سے اس اصطلاح سے سروکار اہلِ مذہب کو بھی رہا اور اہلِ سماجیات کو بھی۔ اس اصطلاح کے شروع شروع میں چونکہ مغرب مکمل پاپائیت کے استبدادانہ یلغار کی زد میں تھا اس لیے اس اصطلاح میں لادینیت کا رجحان زیادہ پایا جاتا تھا۔ کیونکہ بیانیہ (Narrative) جتنا مضبوط اور شدید ہوتا ہے مخالف بیانیے (Counter)

Narrative میں شدت اس کا لازمی نتیجہ ہے۔ تبھی تو اہلِ مذہب اس کو مذہب کے نفی ہونے سے تعبیر کرتے رہے بلکہ اب بھی کرتے ہیں۔ اسے لادینیت قرار دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ الحاد ہی کی ایک شکل ہے۔ اس سے قطع نظر کہ سیکولرازم الحاد ہے یا نہیں حقیقت یہ ہے کہ سیکولرازم الحاد اور مذہب کے درمیان تطبیق کی ایک کوشش ضرور ہے جو کہ اہلِ مذہب کو کسی صورت قبول نہیں۔ اب کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ تطبیق کی یہ کوشش ماضی میں رہی ہے اب نہیں ہے لیکن کم از کم اس تطبیق سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔

مذہب کے دوسری طرف علم سماجیات(Social Science)میں سیکولرازم کو نرم اور لچکدار انداز میں لیا جاتا ہے ۔یہ حضرات کہتے ہیں کہ سیکولرازم کا مطلب یہ ہے کہ ریاست کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، مذہب کا تعلق افراد سے ہے نہ کہ ریاست سے ۔لہٰذا ریاست کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہیئے کہ اس کے شہریوں کا مذہب کیا ہے۔ ہر شہری کو مکمل اختیار ہونا چاہیئے کہ وہ جونسا مذہب چاہے اختیار کریں۔ ریاست اوراس سے ملحقہ اداروں کی سرگرمیوں میں مذہب کا کوئی عمل دخل نہیں ہونا چاہیئے یعنی مذہبی سرگرمیاں انفرادی ہونا کہ ریاستی۔

اس متنازعہ لفظ کے مفہوم و اطلاق کے مختلف پہلوؤں کو دیکھتے ہوئے میرا یہ احساس ہے کہ سیکولرازم کا لفظ بولتے ہی فوراً اس کا رخ متعین کرنا چاہیئے کہ اس سے مراد سیکولرازم کا مذہبی رخ ہے یا سماجی رُخ۔ بلکہ میرا احساس یہ ہے کہ جدید دنیا میں سیکولرازم مکمل سماجی رُخ اختیار کر گیا ہے۔ کیونکہ لفظ ایتھیزم (Atheism) نے انکارِ خُدا اور لادینیت کا سارا مفہوم اپنے اندر سمو دیا ہے۔ جو کہ لغوی اور اصطلاحی دونوں معنوں میں اپنے مفہوم پر پورا اترتا ہے۔ لہٰذا اب سیکولرازم کو لادینیت سے جوڑنا کم فہمی ہے۔ اب سیکولرازم مکمل سماجی رخ اختیار کر گیا ہے اوراس کو قبول کرنے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ نہیں کیونکہ ریاست کا مذہب متعین کرنا اقلیتوں کی حق تلفی ہے ۔ ریاست کا مذہب ہونا بھی نہیں چاہیئے کیونکہ

ریاست صرف افراد کا نام نہیں۔ کیا ریاست پر مذہب کا ٹھپہ لگا کے ہم دریاؤں، پہاڑوں، گلی کوچوں اور اداروں کو کلمہ پڑھائیں گے؟ یا بپتسمہ کرائیں گے؟ یا سَبت کا اہتمام کروائیں گے؟ یا انہیں گائتری منتر سنائیں گے؟۔۔۔۔۔نا ممکن۔

لیبارٹری میں کسی نئی چیز کی ایجاد کرتے وقت نہ تو ہم کسی مذہب کی تردید کر رہے ہوتے ہیں اور نہ تائید۔ ہمارے اس علم کا غیر جانبدار رہنا کسی بھی مذہب کی نفی نہیں۔ علوم و فنُون کی دنیا میں سائنسدان نہ مسلمان ہوتا ہے، نہ مسیحی، نہ یہودی اور نہ ہندو بلکہ اس دوران پوری یکسوئی کے ساتھ وہ صرف سائنسدان ہوتا ہے۔ اسی طرح انتظامی امور چلانے کے دوران کوئی منتظم صرف منتظم ہی ہوتا ہے جس کی نظر میں سب برابر ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس دوران یہ علم، یہ ہُنر، یہ نظامت سب اپنی ذات میں سیکولر ہیں۔ مذہب کا تعلق انسان کے ذات اور سماج سے ہے۔ یہ انسان کے شخصی مطالبات اور سماج کی تشکیل دونوں میں برابر کا شریک ہے۔ کسی ریاست پر ایک ہی مذہب کو حاوی کرنا بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔

عُویم نے الگ الگ کر کے سیکولرازم کی مذہبی اور سماجی وسیاسی تعبیریں بیان کی۔ پھر ہلکی سی خاموشی کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔

بلکہ اب تو ایک نئی اصطلاح نے جنم لیا ہے جسے پوسٹ سیکولرازم کہا جاتا ہے۔ بیسویں صدی کے آواخر میں مذہب نے سیاست و ریاست پر اپنا گہرا رنگ جمانا شروع کر دیا۔ جس کی وجہ سے سیکولرازم کی باگیں کمزور پڑنی شروع ہو گئیں۔ اس کا لازمی نتیجہ پوسٹ سیکولرازم کی شکل میں نکلا اور اہلِ علم اس کے لیے تیار ہو گئے کہ مذہب و ریاست کا باہمی تعلق تفہیمِ نو کا متقاضی ہے۔ پوسٹ سیکولرازم کی اصطلاح جرمن فلاسفر جرگن ہابر ماس (Jurgen Habermas) نے اختیار کی۔ جس کا بنیادی مقصد سیکولرازم اور مذہب کے درمیان تطبیق کے لیے ایک درمیانی راہ متعین کرنی تھی۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا کہ سیکولرازم اپنی اصل

میں مذہب اور الحاد کے درمیان ایک تطبیق کا نام تھا اسی طرح دورِ جدید میں پوسٹ سیکولرازم مذہب اور سیکولرازم کے درمیان تطبیق کا نام ہے۔ اس ضمن میں ہابرماس کے ساتھ ساتھ کنیڈین فلاسفر چارلس ٹیلر کی کتاب سیکولر ایج (A Secular Age) کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ جنہوں نے یہ بتانے کی کوشش کی کہ انسان کے متنوع رجحانات کو سامنے رکھتے ہوئے مذہب اور ریاست کے مختلف مطالبات کا صحیح تعین کیا جائے کیونکہ سیکولرازم کا مقصد اجتماعی زندگی سے علیحدگی نہیں بلکہ ان کے مقامات و مطالبات کا صحیح ادراک ہے۔ اس اجتماعی زندگی و ریاستی امور میں مذاہب کا ایک دوسرے پر ترجیح کو ختم کرنا ہی سیکولرازم کی بنیاد ہے کہ ان اجتماعی امور میں تمام مذاہب یکساں و برابر ہیں۔

عقل کا مطالبہ بھی یہی ہے کہ وہ چیلنجز و مسائل جو مذہب و سیاست کے اختلاط کی وجہ سے معاشروں کو درپیش ہیں، سیکولرازم ان کے حل کا متلاشی ہے۔ مذہبی تشخص کو برقرار رکھتے ہوئے مذہب کو ریاست کی بجائے فرد اور معاشرے سے متعلق کروانے میں ہی خیر وعافیت ہے۔ مسلم معاشروں میں بالخصوص اس خَلط ملط کے غلط تصور سے کافی خون بہا دیا گیا۔

اس دوران آکاش نے مُنادی کرنے کے انداز میں بآواز بلند کھڑے ہو کر مخاطب کر کے کہا۔

آپ لوگوں کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ کوانٹم فزکس کی آدھی کلاس گزر چکی ہے۔

اوہووو۔۔ افسوس۔۔۔۔۔۔ پہلے کیوں نہیں بتایا۔ یہ سنتے ہی تمام دوست عُجلت میں کھڑے ہو کر کلاس روم کی طرف بھاگ گئے۔

باب چہاردہم

انتقال یا موت

اتنی اچھی محفل ہے، اتنا اچھا موسم ہے، دوستوں کا اجتماع ہے، کھانا پک رہا ہے، کم از کم موسیقی کا بندوست تو کر دیتے۔ حضرت غالب نے کیا خوب فرمایا۔

ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

عُویم نے مطالبہ کیا۔

چاروں دوست تفریح کی غرض سے دریا کنارے پروگرام کرنے آئے تھے اپنے ساتھ کھانا پکانے کا تمام بندوبست کر کے دریا کنارے پکانے اور خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ بھیڑ سے بالکل دور گاڑی کھڑی کر کے، چٹائی بچھا کر کھانا پکانے میں لگے ہوئے تھے۔

ہاں! تو گاڑی کا شیشہ کھول کر میوزک لگا لو۔ اس میں کونسی بڑی بات ہے ویسے بھی تو آپ نے پکانے اور بندوبست کرانے میں ہمارا ہاتھ نہیں بٹانا ہے، صرف تبصرے اور مطالبے ہی کرنے ہیں۔

فردان نے محبت بھرے طنز میں جواب دیا۔

کون کہتا ہے کہ میں کام نہیں کرتا یا نہیں کیا ہے؟ ابھی پیاز، ٹماٹر اور مرچ کس نے کاٹے۔ گاڑی سے سامان اتارنے میں کس نے مدد کی۔ قہوہ بنانے میں کون ساتھ تھا۔ آپ کو چٹائی بچھانے میں کس نے ساتھ دیا۔ میرا کام تو آپ لوگوں کو نظر ہی نہیں آرہا۔

عُویم نے جلدی جلدی اپنے حصے کے کام گنوا دیے۔

یار کیف اور آکاش! چھوڑو یہ کام۔ پہلے اس کے ہاتھ پاؤں دباتے ہیں کافی تھک گیا ہے بیچارہ۔

فردان نے کیف اور آکاش کی طرف رخ کر کے مسکرا کر کہا۔

دیکھیئے آپ مجھے طعنے مت دیں اور طنز نہ کریں۔ میں جتنا کر سکتا تھا وہ میں نے کر لیا اور جو میرا کام ہے وہ کر رہا ہوں باقی اپنی صلاحیت سے بڑھ کر کچھ نہیں کر سکتا۔ جس کی جس میدان میں جتنی صلاحیت ہو اُتنی ڈیمانڈ اور اس کے مطابق پراڈکٹ۔

فکرِ ہر کس بہ قدر ہمتِ اُوست

اور ہاں! میں جو یہ آپ لوگوں کے ساتھ باتیں کرتا ہوں کیا یہ کام نہیں؟ آپ لوگوں کے لیے خوبصورت خوبصورت اشعار پڑھتا ہوں، کیا یہ کام نہیں۔ ابھی دیکھ لینا تھوڑی دیر بعد آپ لوگوں کے لئے کھانا بھی کھاؤں گا کیا یہ کام نہیں اور سب سے بڑھ کر آپ لوگوں کے لئے زندہ جو ہوں۔ کیا یہ سب کام نہیں۔

عُویم نے مسکراتے ہوئے اور اپنے ہاتھوں کو ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ وہ قصداً دوستوں کو غصہ دلا رہا تھا۔ بات کرتے وقت وہ دوستوں سے ہلکا سا دور بھی ہو گیا تاکہ ان کے چنگل سے محفوظ رہ سکے کیونکہ اسے اپنے تبصرے کے ردِ عمل کا پتہ تھا۔

ہائے میرا شویٹو(Shweetoo)، پیارا اور نازک عُویم۔۔۔۔۔۔ ذرا نزدیک تو آنا۔

آکاش نے چھری سے اشارہ کرتے ہوئے، جس پر وہ کٹائی میں مصروف تھا سر اٹھا کر کہا۔

یار ہم آپ کے احسانات تلے دَب رہے ہیں۔

کیف نے خوبصورت انداز میں طنز کیا جس پر عُویم نے زوردار قہقہہ لگایا۔

لیکن ہاں! اب بات کو ہمارے لئے جینے اور موت کی طرف نہ گھما۔ ہمیں پتہ ہے کہ آپ اس طرف بھی دلچسپی لیتے ہیں۔

کیسی دلچسپی۔۔۔۔ آکاش بول پڑا۔

ہلکی سی خاموشی کے بعد عُویم نے متجسسانہ انداز میں سر کو جنبش دی اور ہلکی سے آواز میں کہا۔۔۔۔ موت۔۔۔ بلکہ موت یا انتقال۔۔۔ اس کے بعد آہ بھری۔

انتقال ایک بہت بڑی حقیقت ہے اور اس سے بڑی حقیقت یہ کہ یہ حقیقت کو کھول کے رکھ دے گی اور یہی میری دلچسپی کا سبب اول ہے کیونکہ مجھے حقیقت کی تلاش ہے۔ مجھے مطلق علم کی جستجو ہے۔ مجھے میرے سوالات کے تسلی بخش جوابات چاہئیں۔ مجھے ہوش و حواس سمیت خواب نگر کی سیر کرنی ہے۔ بلکہ صرف مجھے کیا یہ ہر انسان کی خواہش ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں ایک نئے اور منفرد تجربے ومشاہدے کا متلاشی بھی ہوں جو کہ انتقال کی صورت میں میرے سامنے ہے۔ میرے اس تبصرے سے آپ لوگ ہر گز یہ تصور ذہن میں نہ سمالینا کہ میں انتقال کا خواہشمند ہوں۔ اسے اپنے وقت پر ہی آنا ہے جس پر مجھے کوئی گرفت نہیں لیکن انتقال کے بعد جو واقعات بالرضا و بالخیر ہونے والے ہیں اس میں میری دلچسپی یقیناً موجود ہے۔

دوسری بات یہ کہ آپ لوگ اس کو موت کہتے ہیں لیکن میں اس کو انتقال کہتا ہوں ۔انتقال کا مطلب منتقلی جس طرح ہر چھ ماہ بعد ہماری منتقلی ایک سمسٹر سے دوسرے سمسٹر ہوتی رہتی ہے اس طرح انتقال سے ہماری منتقلی ایک دنیا سے دوسری دنیا میں ہونی ہے۔ اس کی بہترین مثال یہ ہے کہ یونیورسٹی میں ہماری منتقلی کلاس روم سے امتحان ہال ہو جاتی ہے اور وہاں پر ہم ان سوالات کے جوابات دینے کے پابند ہوتے ہیں جو ہم نے کلاس

روم میں پڑھے ہوتے ہیں۔ لہٰذا یہ جو فنا کا تصور ہے یہ اس دنیا کے ساتھ منسلک ہے میرے ساتھ نہیں۔ میرے اصل وجود کو فنا نہیں بلکہ اسے بقا ہے۔ فنا اس عارضی دنیا کو ہے اس کے قوانین کو ہے اس کے ساتھ منسلک اشیاء کو ہے جیسا کہ میرا یہ جسدِ خاکی۔ میرا اصل وجود تو توازن اور پائیداری(Equilibrium and stability)کی تلاش میں مصروفِ امتحان ہے اور اسی کی جانب عازم سفر ہے۔

صبر۔۔۔ صبر۔۔۔۔ لیکن ہم میں سے اکثریت تو امتحانی ہال جانے سے ہچکچاتے ہیں۔

آکاش نے عُویم کے گفتگو کے دوران تضاد کا پہلو سامنے رکھ دیا۔

صرف غیر ذمہ دار لوگ ہچکچاتے ہیں ذمہ دار نہیں۔ یاد ہے وہ جو تھرموڈائی نامکس (Thermodynamics)کا پیپر اُسی صبح احتجاج کی وجہ سے منسوخ ہوا تھا جس پر آپ اور ہم کتنے خفا تھے جب کہ عماد کتنا خوش تھا۔ وجہ کیا تھی کیونکہ آپ اور ہم نے پڑھائی مکمل کی تھی جب کہ عماد کی رہ گئی تھی۔ ذمہ دار وکمربستہ حضرات کبھی بھی سامنا کرنے سے نہیں گھبراتے اور پھر جب سامنا مشفق ورحیم ذات کا ہو جو انصاف و سخاوت میں اپنی مثال آپ ہے۔ ذمہ داری کے ضمن میں آپ کی توجہ ایک اور رخ کی طرف موڑنا چاہتا ہوں۔ علامہ اقبالؒ کی دو بہت مشہور نظمیں ہیں۔ "شکوہ اور جواب شکوہ"۔ میں نے بہت سے اہل علم کو نظم شکوہ کی داد دیتے ہوئے سنا ہے۔ اکثریت شکوہ کو جوابِ شکوہ پر ترجیح دیتے ہیں یہ اس لئے کہ شکوہ میں ساری ذمہ داری خدا پر ڈال دی گئی ہے اور مسلمانوں کو سبکدوش کیا گیا ہے۔ جبکہ جوابِ شکوہ میں مسلمانوں کو ان کی ذمہ داری یاد دلا دی گئی ہے اور ان کو ماضی کے سنہرے عہد کو استحکام نہ بخشنے پر کوسا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان ذمہ داریوں کے باب میں کمزور واقع ہوا ہے۔ وہ پُوچھ گُچھ کے بغیر آزاد منشی کو ترجیح دیتا ہے۔

عُویم کے خاموش ہوتے ہی فردان شروع ہو گیا اور عُویم کی گفتگو میں اضافی کمنٹ کرتا گیا۔

اس کے ساتھ ساتھ امتحان سے ہچکچانے کی ایک اور وجہ بھی ہے کہ ہمیں شروع سے ممتحن سے ڈرایا جاتا ہے جب آپ میرے سامنے ممتحن کو خوفناک اور غلط انداز میں پیش کریں گے تو میرا خاک دل چاہے گا امتحان دینے کے لیے۔ لہٰذا اس طالب علم کی تمام اہلِ مذاہب سے استدعا ہے کہ اس عارضی دنیا کا امتحان لینے والے ممتحن کو اسی طرح پیش کیا جائے جیسا کہ وہ ہے۔ میں بطورِ انسان اپنی بنائی ہوئی ایک چھوٹی سی چیز پر محبت کے تمام قاعدے ختم کر سکتا ہوں اور جان نچھاور کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا ہوں تو وہ اس شاہکار یعنی میں، یعنی انسان کے ساتھ محبت کی کتنی کتنی اور کیسی کیسی حدیں پار کرے گا۔ اور کیونکر نہیں کرے گا کیونکہ میری بنائی ہوئی تخلیق کوئی بھی حقیر اور عارضی سائنسی تخلیق ہو گی جبکہ اس کا شاہکار، اس کی تخلیق "میں" ہوں یعنی انسان ہے۔ میرے اس خیال کے حامی صرف وہ حضرات ہو سکتے ہیں جو انسان کی عظمت کا صحیح معنوں میں ادراک بھی رکھتے ہو اور اعتراف بھی کرتے ہو۔

یار! آپ کی باتیں بالکل عقل کے مطابق ہیں۔ امتحان ختم ہونے پر لائق طلباء کس طرح بے چینی سے نتیجے کا انتظار کرتے ہیں تو کیوں نہ انتقال کے بعد اس نتیجے کو ان واقعات کی کڑیوں کا تسلسل کہا جائے۔۔۔۔ دلچسپ، بہت ہی دلچسپ۔

آکاش نے اپنے تبصرے سے گفتگو میں اضافہ کیا۔

Exactly آکاش۔۔۔۔۔۔۔

عُویم نے حیرانگی سے آنکھیں بڑی کرتے ہوئے اور ہاتھ کے اشارے سے Exactly پر زور دیتے ہوئے کہا۔ اس دوران عُویم پانی پینے کے لئے چٹائی پر موجود بوتل کی طرف بڑھا اور گلاس میں پانی ڈال کر پینے لگا کہ کیف بول پڑا۔

ویسے یہ ہمارے سینوں میں جو خواہشات کے دریا بہتے ہیں جو ناقابل بیان و محیر العقول ہیں۔ ان کو بھی تو کنارہ چاہیئے۔ اس پر پہلے بھی ہم ہاسٹل میں گفتگو کر چکے ہیں۔ ان کا وجود د

تکمیل لازم وملزوم ہے۔ انتقال کا یہ رخ بھی بڑا دلچسپ اور معنی خیز ہے کیونکہ موجودہ دنیا میں ان خواہشات کی تکمیل ناممکن ہے۔

بے شک، انتہائی ضروری۔۔۔ کیف! آپ کی بات کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتا ہوں کہ ہم میں سے ہر ایک کی ایسی ایسی پسندیدہ شخصیات ہیں جو اب حیات نہیں اوراس فانی دنیاسے کوچ کر گئے ہیں۔ جن میں ہمارے آئیڈیلز بھی شامل ہیں۔ ان شخصیات نے ہمارے دل ودماغ میں بسیرا کر رکھا ہوتا ہےا اور نفسیاتی طور پر ہم پر قابض ہوتے ہیں۔ ان شخصیات سے ملاقات کا واحد راستہ یہی انتقال ہے بلکہ ان سب سے بڑھ کر خدائے بزرگ وبرتر سے ملاقات بھی اسی راستے کی محتاج ہے اور سب سے بڑی بات میں آپ کو بتادوں کہ جس کسی نے بھی خدا کی تلاش میں زیادہ تگ ودو کی ہو اُتنی ہی اسے ملاقات کی جلدی ہو گی اور میں نے چپہ چپہ چھان مارا ہے۔

عُویم اپنی خیالی وتصوراتی دنیا میں نہ ختم ہونے والی اطمینان اور تسکین پر نظریں گاڑے ہوئے گفتگو کر رہا تھا۔ وہ اتنے پُر تیقن اور فیصلہ کن لہجے میں گفتگو کر رہا تھا جیسا کہ مستقبل اس کے مُٹھی کی گرفت میں ہو۔ اس کی آنکھوں کی چمک دیدنی تھی اس کے چہرے پر مستقبل کی منصوبہ بندی کے گہرے تاثرات رقصاں تھے جیسا کہ وہ مستقبل میں تیر رہا ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ ہلکی سی مسکراہٹ بھی اس کے گالوں کو بوسہ دے رہی تھی۔ وہ اپنی دھن میں گم تھا کہ اس دوران آکاش نے تبصرہ کرتے ہوئے طنزاً کہا۔

ہمارا عُویم اصل میں تڑپتی اور بے چین روح ہے جس سے ہمارا واسطہ غلطی سے پڑ گیا ہے۔

اس تبصرے سے دوستوں کے چہروں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ دوستوں کے درمیان اس طرح میٹھے میٹھے طنز کی بوچھاڑ جاری تھی اور ایک دوسرے کو ہدف تنقید بنا بنا کر تنگ کر رہے تھے کہ اسی اثناء میں عُویم کا فون بجا۔ عُویم نے "Excuse me" کہہ کر فون اٹھالیا

اور فون کے ساتھ مصروف ہو گیا۔چند منٹ بعد فون بند کر کے واپس دوستوں کی طرف متوجہ ہوا۔

یار! مجھے تو کل عبد الاحد صاحب سے ملنے کے لئے جانا ہے۔ اُن کے اسسٹنٹ کا فون تھا ۔ کہا کہ عبد الاحد صاحب تین دن بعد باہر ملک کے دورے پر جا رہے ہیں اس لئے پرسوں آپ کو ملاقات کے لیے بلایا ہے۔

عُویم اس اطلاع پر خوش بھی تھا اور حیران بھی۔ عبد الاحد صاحب نے خود ملاقات کے لیے بلایا ہے اس پر خوش تھا لیکن کیا کام ہو سکتا ہے یہ حیرانگی والی بات تھی خیر اس نے آنے کے لیے "ہاں" کر دی۔

عُویم نے ایک دو دفعہ اپنے دوستوں کے سامنے عبد الاحد صاحب کا تعارف بھی کیا تھا اور تعریف بھی۔ اس لئے ان تینوں میں بھی ان سے ملاقات کی خواہش پیدا ہوئی تھی۔ اس موقع کو غنیمت جان کر کیف نے فوراً اپنی خواہش کا اظہار کیا کہ کیوں نہ میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں یہ کہنا تھا کہ فردان اور آکاش بھی بول پڑے۔ میں بھی۔۔۔۔ میں بھی

ٹھیک ہے یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے ایسا کرتے ہیں کہ کل لنچ (Lunch) کے بعد نکلتے ہیں رات وہاں ہوٹل میں آرام کر لیں گے اور پرسوں صبح ملاقات کے لیے عبد الاحد صاحب کے ادارے کا رخ کر لیں گے۔

عُویم کی گفتگو میں مشورے سے زیادہ فیصلے کی جھلک نمایاں تھی اس پر باقی دوستوں نے اِثبات میں سر ہلا دیا۔

بس آپ ایسا کریں کہ کل صبح ہمارے گھر پہنچ جانا، لنچ ایک ساتھ کر لیں گے پھر نکل جائیں گے۔ میں بس میں چار ٹکٹ ابھی سے آن لائن بک کرا لیتا ہوں۔

عُویم نے ترتیب بتا دی۔

بس (Bus) کیوں؟ آپ کی گاڑی میں کیوں نہ جایا جائے۔

آکاش نے سوال کیا۔

عُویم ابھی زبان کھولنے ہی والا تھا کہ فردان نے مسکرا کر طنزاً کہا۔

یہ بیچارہ اتنی لمبی ڈرائیونگ نہیں کر سکتا، تھک جو جاتا ہے۔

عُویم نے فردان کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر اثبات میں سَر ہلا دیا۔

باب پانزدہم

سائنسی دلائل و نظریہ تخلیق

ہوٹل میں صبح ناشتے کے بعد نہا کر چاروں دوستوں نے ٹیکسی کرالی اور عبد الاحد صاحب کے ادارے کی طرف روانہ ہوگئے۔ گیٹ کے سامنے ٹیکسی سے اتر کر وہ اندر جانے کے لیے بڑھے۔ گیٹ کیپر کے ساتھ عُویم نے بڑی دل جمعی کے ساتھ علیک سلیک کیا۔ اس نے بڑی محبت سے عُویم کا استقبال کیا کیونکہ وہ انہیں جان چکا تھا۔

استاد محترم آئے ہیں یا ابھی تک نہیں آئے؟ اُس نے گیٹ کیپر سے سوال کیا۔

نہیں جی! ابھی تک تو نہیں پہنچے۔ گیٹ کیپر نے جواب دیا۔

چاروں دوست بلڈنگ کے اندر چلے گئے وہاں پر انتظار گاہ میں بیٹھنے ہی والے تھے کہ عبد الاحد صاحب کے اسسٹنٹ جنید نے اسے دیکھ لیا۔ علیک سلیک اور تعارف کے بعد جنید نے انہیں ایک کمرے میں بٹھایا۔ وہاں پر وہ استاد محترم کا انتظار کرنے لگ گئے۔ اسی دوران عُویم کی فرمائش پر جنید نے انہیں قہوہ سَرو (Serve) کیا۔ تقریباً آدھ گھنٹہ انتظار کے بعد کمرے کا دروازہ کھلا۔ جنید نے اطلاع دی کہ استاد جی آگئے ہیں اور آپ کو بلا رہے ہیں۔ چاروں دوستوں نے اٹھ کر اپنے کپڑے سیدھے کئے، بال سنوارے، موبائل فون سائلنٹ موڈ پر لگا دیے اور جنید کے پیچھے پیچھے استاد کے کمرے میں داخل ہوگئے۔

عبد الاحد صاحب بالکل اکیلے بیٹھے تھے۔ عُویم کو دوستوں سمیت دیکھ کر انہوں نے کھڑے ہو کر بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا۔ بیٹھنے کے بعد کیف، فردان اور آکاش نے استاد

کے سامنے باری باری اپنا تعارف خود کرایا۔ اس کے بعد استاد جی نے تینوں کو مخاطب کر کے کہا۔ امید ہے میر اتعارف عُویم نے کروایا ہو گا۔

تینوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

سر جی! جنید کا فون آیا تھا کہ آپ نے مجھے حاضری کے لیے بلایا ہے۔

عُویم نے تعارف کے بعد چھائی ہوئی خاموشی کو توڑنے کی کوشش کی۔

ہاں بیٹا! میں نے بلایا تھا۔ اچھا کیا کہ آپ آ گئے اور وہ بھی سویرے آ گئے بعد میں رش بڑھ جاتا ہے۔ آپکو بلانے کی وجہ چند دن پہلے میرے ہاتھوں لگنے والی ایک رپورٹ ہے۔ اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ مغرب میں رجسٹرڈ ملحدین کی تعداد 16 فیصد سے زیادہ ہے اور اس میں بڑی تیزی سے اضافہ بھی ہو رہا ہے۔، یہ رپورٹ 2012ء کی ہے۔ الحاد کے اس خطرے نے مجھے بڑی تشویش میں ڈالا ہوا ہے۔ الحاد کے اس سنگینی کی سب سے بڑی وجہ عقلی دلائل کا نہ ہونا ہے۔ ابلاغ وارسال کا فقدان ہے کہ کس طرح جدید ذہن کو جدید علوم ہی کے ذریعے مذہب کی اہمیت بتائی جائے۔ موجودہ الحاد کے پیچھے علمی سوالات کی عمارت کھڑی ہے اور یہ عمارت اس نے سائنس، فلسفہ اور نفسیات کی اینٹوں سے تیار کی ہے۔ اسکو اہل مذہب اب تشکیک یا سوفسطائیت کہہ کر رد نہیں کر سکتے۔ لہٰذا الحاد کی اس سنگینی کو مد نظر رکھ کر اہل مذہب کو اپنے علم و دعوت کو نئے اور کارآمد اصولوں پر استوار کرنا ہو گا اور جدید علوم پر دسترس حاصل کر کے اس فائدہ اٹھانا ہو گا۔ دنیا بدل گئی ہے اور اس تغیر و تبدّل میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ لہٰذا ہمارا مولوی صاحب ہو یا پروہت ہو یا پوپ ہو سب کو اس کے مطابق بدلنا ہو گا ورنہ پیچھے رہ جائیں گے اور نہ اس جہاں میں سرخرو رہیں گے نہ اُس جہاں میں۔ مذہبی حضرات کی اس تنزلی کا ادراک علامہ محمد اقبالؒ کو اس وقت ہو چکا تھا۔

چشم بگشائی اگر چشم تُو صاحب نظر است
زندگی در پئ تعمیر جہان دگر است*

---

*ترجمہ: اگر تمہاری آنکھ صاحب نظر ہے تو آنکھ کھولو اور دیکھو ــــــ کہ زندگی اب ایک الگ ہی دنیا تعمیر کرنے کے درپے ہے۔

اس بار گراں کا بوجھ ہم سب کے کندھوں پر آتا ہے۔

تمام دوست عبد الاحد صاحب کی باتیں بڑی غور سے سن رہے تھے کہ اس دوران اس کا حلق خشک ہونے کی وجہ سے اسے پانی کی ضرورت پڑ گئی۔ عُویم نے فوراً اُٹھ کر گلاس بھرا اوراس کے سامنے رکھ دیا۔ تھوڑی سی خاموشی چھاگئی کہ اس دوران عُویم نے موقع کو غنیمت جان کر اس گفتگو کے ضمن میں اپنا تجربہ بیان کیا جو اس کو ہو چکا تھا جب وہ حق کی تلاش میں دَردَر کی ٹھوکریں کھارہا تھا۔

استاد جی! اگر اجازت ہو توالحاد کی اس سنگینی اوراس کے ساتھ وابستہ کم علمی پر میں کچھ مشاہدات پیش کر سکتا ہوں۔

عُویم نے دائیں ہاتھ کے اشارے سے استاد سے اجازت چاہی۔

ضرور۔۔۔استاد نے مختصراً جواب دیا۔

سرجی! آپ اسے افسوس یا تشویش کا نام دیں یا کچھ اور لیکن میرے خود بھی الحاد اور مذہب کے بارے میں کافی سوالات ہیں جو کافی وقت سے اٹکے ہوئے ہیں۔ اس طرح اور طلباء کے بھی ہوں گے کیونکہ حقیقت یہی ہے کہ الحاد کو ہمارے معاشرے نے خوش آمدید کہنا شروع کر دیا ہے خاص کر یونیورسٹی کے طلباء نے اوراس میں خاص الخاص وہ طلباء جو ہاسٹلوں میں رہائش پذیر ہیں۔ آپ کے ساتھ پہلی ملاقات سے پہلے میں نے فرد ان کے کہنے پر ان حضرات سے ملاقاتیں کیں ہوئی ہیں۔ یہ ملاقاتیں اس لئے تھیں کہ میں ان سے الحاد کے حق میں دلائل حاصل کر سکوں کیونکہ مجھے الحاد کو بطورِ نظریہ قبول کرنا تھا اور یہ ضروری ہے کہ کس نظریے کو اگر مِن و عَن قبول کرنا ہو تو اس کے لیے ناقابل تردید اور ٹھوس دلائل چاہیئے ہوتے ہیں لیکن شاید تقدیر کو یہ منظور نہ تھا کیونکہ مجھے وہاں سے دلائل تو دور کی بات، مزید شکوک وشبہات کے ساتھ لوٹنا پڑا کیونکہ جو طلباء الحاد کی باتیں کرتے تھے وہ باتیں علمی نہیں بلکہ جذباتی تھے اوراس سے ایک خاص قسم کی احساس محرومی بھی ٹپک رہی تھی۔

میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ تو علم کی دنیا سے کافی دوری پر واقع ہیں۔ خاص کر مذہبی ریت و رواج میں ہلکا پھلکا مذہبی علم جو عام معاشرے میں پھیلا ہوتا ہے اس سے بھی ناواقفیت تھی۔ اس کے ساتھ ان حضرات کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ یہ لوگ عام معاشرے سے وابستگی کو ناپسند کرتے تھے اور الگ تھلگ سے رہتے تھے۔ ان تمام میں سب سے دلچسپ بات ایک عجیب قسم کے طبقے کی تھی۔ وہ الحاد کو بطورِ فیشن قبول کرنا چاہتے تھے۔ ان کی نظر میں مذہب اور مذہبی لوگ قدامت پرست ہوتے ہیں اور جدید دنیا سے نابلد ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کے خیال کے مطابق معاشرے میں مقام پیدا کرنے کے لئے اہلِ مذہب پر تنقید ہی آپ کو بڑا شخصیت ثابت کر سکتی ہے۔ اسی وجہ سے یہ لوگ مذہب پر ایسی تنقید کیا کرتے تھے جس کی انہیں خود بھی سمجھ نہیں آتی تھی۔ خلافِ معمول یا خلاف فطرت بات کہنا اور مذہب یا کسی اہم شخصیت کو بغیر دلیل وبغیر وجہ کے کُریدنا ان حضرات کے سامنے فلسفیانہ فعل تھا۔ جس کے زعم نے انہیں خود کو خود ساختہ طور پر مبتلا کر رکھا تھا۔ اب آپ میری اس پوری گفتگو میں الحاد کو فیشن کہیں یا لاعلمی یا احساس محرومی لیکن حقیقت یہ ہے کہ الحاد نے ہمارے یونیورسٹی کے ہاسٹلوں کے دروازوں پر دستک دی ہے اور دوسری طرف کِواڑ مقفل بھی نہیں ہیں۔ نہتے اور معصوم طلباء ہیں۔ جن کے لیے ہلکی سی ہوا بھی طوفان ثابت ہو سکتی ہے۔

عُویم نے بڑی تفصیل کے ساتھ وہی کچھ بتا دیا جو اس کے ساتھ پیش ہوا تھا عبد الاحد صاحب نے طلباء کے اس طرزِ فکر پر آنکھیں پھاڑتے ہوئے اور پیشانی پر بَل کھاتی لکیروں سے حیرانگی کا اظہار کیا جب کہ فیشنی الحاد پر ہلکا سا مسکرا کے تبصرہ بھی کیا۔

بیچارے فیشنی ملحدین اور نا قابل فہم فلسفی۔۔۔ یہ نہیں جانتے کہ کائنات کا خدا کتنا عظیم ہے۔ اس کے بعد براہِ راست عُویم کی طرف متوجہ ہوئے۔

اس کا احساس مجھے ہوا ہے میرے پاس جو سوالات آتے ہیں وہ اکثر آپ جیسے طلباء کے ہوتے ہیں۔ لیکن ہاسٹل طلباء میں اسکی اتنی سنگینی اور اس کے مختلف زاویوں سے آج آپ نے

مطلع کر دیا۔ اسی ہی کے تدارک کے لیے میں نے آج آپ کو بلایا ہے تا کہ آپ کے ساتھ اپنا نیا آنے والا کورس (Course) ڈسکس کر سکوں کیونکہ کل مجھے باہر ممالک کے دورے پر جانا ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ ہم ابلاغ کے جدید ذرائع دین اسلام اور اثبات الٰہی کے لیے استعمال کریں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص کرم ہے کہ اس مصروف دنیا میں ہمارے لیے انٹرنیٹ، کمپیوٹر اور موبائل فون جیسی سہولتیں میسر ہیں۔ جس کو ہم ایک اچھے اور مفید مقصد کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ لہٰذا میری یہ خواہش کہ ان سہولتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم آن لائن کلاس کا اجراء کریں جس میں الحاد کا تعارف، اس کی تاریخ، اسباب وجوہات، رد الحاد پر علمی و عقلی دلائل دورِ حاضر کے علوم کی روشنی میں اور انسانی زندگی پر اس کے اثرات اور بعد ازیں اس کی روک تھام کے لیے اٹھائے جانے والے اقدامات اور دعوت پر تفصیلی گفتگو ہو۔ ردالحاد کے باب میں اثبات الٰہی پر دلائل خود بخود سامنے آتے جائیں گے کیونکہ یہ ایک دوسرے کی ضد ہیں اور اس سے وہ غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی جو الحاد کے قائل حضرات نے غلطی سے پھیلائی ہوئی ہیں غرض یہ کہ اس کورس میں ردالحاد اور اثبات الٰہی کے ہر پہلو کا تفصیلی جائزہ لیا جائے گا۔

کورس کو آسان اور پرکشش بنانے کے لیے پاور پوائنٹ(Power Point)پر سلائیڈز بنائے جائیں گے۔ جس کے لئے آپ کی مدد کسی بھی وقت لی جاسکتی ہے۔ اسی طرح آن لائن کلاس کو سنبھالنے کے لئے ادارے کی طرف سے میڈیٹر (Mediator) تو بہر صورت موجود ہو گا لیکن آپ کی موجودگی بھی ضروری ہے تا کہ کسی بھی مسئلے کا حل بروقت نکالا جاسکے کیونکہ آن لائن کلاس ایک ٹیکنیکل ایشو ہے یہ تمام امور نمٹانے کے لیے ادارے نے اپنے بندے مختص کئے ہیں لیکن آپ جیسے طالب علم کا ان سرگرمیوں میں حصہ

لینا اوران کو نمٹانا میرا ذاتی فیصلہ ہے کیونکہ جدید ذہن اور جوان شخصیت انتظامی امور میں زیادہ کارگر ہوتی ہے۔

عبد الاحد صاحب باتوں باتوں میں عُویم کے چہرے کے تاثرات سے اس کام کے لیے اس کا اقرار وانکار جانچنے کی کوشش بھی کرتا رہا جس کا جواب اسے "ہاں" میں ملتا رہا اوراسی ہی کی توقع تھی۔ عُویم بار بار اپنے سر کو اوپر نیچے ہلاتا رہا۔ دوسری طرف عبد الاحد صاحب کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ عُویم بذاتِ خود الحاد کے چنگل سے نکل جائے۔

میرے بیٹو! آپ بور تو نہیں ہو رہے ہماری باتوں سے۔

عبد الاحد صاحب نے باقی تین دوستوں کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ اس کے لہجے میں بڑے پن کے ساتھ شفقت گھلی ہوئی تھی اس پر تینوں دوستوں نے "نہیں نہیں" کا مختصر اًجواب دے کر گفتگو کو اپنی سمت میں بحال رکھنے دیا۔

اچھا! اب تھوڑا بہت آپ کے سوالات کا جائزہ لیتے ہیں۔

استاد جی نے پھر سے براہِ راست عُویم کی طرف توجہ مبذول کی۔

عُویم پہلے کچھ خاموش رہا پھر اچانک گویا ہوا۔

انسان ایک باشعور ہستی ہے اس کے شعور میں تلاشِ حق ودیعت کر دی گئی ہے وہ چاہتا ہے کہ میں حقیقت تک پہنچوں۔ اس لیے وہ کائنات کی اوراپنی ذات کی ہر شکل میں توجیہہ چاہتا ہے۔ ازل سے لے کر انسان اسی توجیہہ اور وضاحت کی کوششوں میں اپنا سر کھپاتا رہا ہے اور ہمیشہ اسی ہی کی تاک میں رہتا ہے۔ ہمارے آباد واجداد کے پاس سائنس کے عروج سے پہلے چونکہ معلومات کم تر تھیں۔ لہٰذا وہ ان حقائق کا صحیح طرح سے توجیہہ نہ کر سکے اور وہ مجبور ہو گئے کہ کسی برتر ہستی کو مانا جائے اور نتیجتاً اُسی ہستی کے ساتھ منسلک کیا جائے کہ یہ سب کچھ اسی ذات ہی کی کرشمہ سازی ہے۔ یہیں سے مذہب پُھوٹا۔ اب چونکہ سائنس نے ان حقائق کی توجیہہ بیان کر دی تو اب ہمارے پاس مذہب کو ماننے کے لیے کوئی معقول وجہ

باقی نہیں رہ گئی۔ لہٰذا اب ہم کیوں مذہب کو مانیں؟ طبیعیاتی دنیا میں نیوٹن نے یہ ثابت کر دکھایا کہ ہماری پوری کائنات ناقابل تغیر قوانین میں بندھی ہوئی ہیں اور یہ سب کچھ ایک اٹل نظام کے تحت وقوع پذیر ہو رہے ہیں۔ جس کو قانونِ فطرت(Law of Nature) کا نام دیا گیا۔ مثلاً یہ حقیقت انسان پر کھل گئی کہ سورج کس طرح طلوع ہوتا ہے اور کس طرح غروب ہوتا ہے۔ اس سے پہلے تو یہ انسان کے لیے مافوق الفطرت مظاہر تھے جس کے ساتھ مافوق الفطرت ہستی کو منتھی کرنے اور ماننے کے علاوہ انسان کے پاس کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ آج تو علت و معلول(Cause and effect) پر ہماری گرفت ہے۔ آج ہم کسی واقعے کے وقوع پذیر ہونے کے پیچھے وہ علت (Cause) معلوم کرنے کی پوزیشن میں آگئے ہیں تو ہم خدا کو کیوں مان لیں؟؟

عُویم نے گہرے فکری انداز میں اپنا سوال پورا کیا۔ اس کے بعد استاد جی کو مضطرب و متوحش انداز میں دیکھنے لگا۔

بیٹا! آپ نے مذہب اور سائنس کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا جبکہ حقیقت میں سائنس مذہب کا ساتھی ہے۔ یہ جتنی ترقی کرتی جاتی ہے اتنی ہی مذہب کی صداقت عیاں ہوتی جاتی ہے۔ کائنات کی توجیہہ کرنے سے مذہب کس طرح تردید کی زد میں آتا ہے۔ یہ تو سرے سے مذہب کا مقدمہ ہی نہیں کہ وہ انسان کو کائنات کی توجیہہ کر کے بتائے۔ یہ مسئلہ تو سائنس کا ہے بلکہ اس مسئلے کی جانچ پرکھ سے مذہب کی خوشی وابستہ ہے۔ آپ حیران ہو گئے ہوں گے کہ میں نے آپ کے بنائے ہوئے مقدمے کا الٹ رخ اختیار کیا۔ آپ کو ایک مثال دیتا ہوں۔ آپ نے علم کی دنیا میں دیکھا ہوگا کہ جب کوئی شارح کسی مصنف کے تصنیف کی شرح وبسط کرتا ہے تو مصنف اس شارح کو کتنا داد دیتا ہے اور اس کی تحسین کرتا ہے۔ یہی صورت حال مذہب اور سائنس کا ہے۔ مذہب کہتا ہے کہ یہ کائنات ایک خدا نے بنائی اور اس کو قوانین میں باندھ کر انسان کے سامنے مسخر کر کے پیش کر دیا۔ اب انسان اس کی کھوج

پرکھ کریں اور اپنے لیے فائدے کے سامان تلاش کریں اوراس میں اللہ تعالیٰ کی نشانیاں ڈھونڈ نکالیں۔ اس پر بار بار قرآن کریم حکم لگاتا رہتا ہے کہ آپ لوگ کائنات میں تدبر کیا کریں، تفکر کیا کریں، غور کیا کریں۔ اب آپ حضرات مجھے بتائیں قرآن کا یہ حکم سائنس پورا کر رہی ہے کہ نہیں۔۔۔۔۔ جی ہاں! سائنس ہی کائنات میں اس تدبر و تفکر کا نام ہے جو کہ قرآن کریم ہی کا حکم ہے اس تدبر و تفکر سے اس کائنات کی شرح وبسط ہو رہی ہے۔ سائنس ہی ہمیں بتا رہی ہے کہ کائنات کی اس کتاب میں فلاں فلاں قوانین کار فرما ہیں۔ اس استدلال سے سائنس مذہب کا ساتھی ہوا یا مخالف؟

سائنس اپنی اس کھوج پرکھ میں جو توجیہہ پیش کرتی ہے جس کا ذکر آپ نے اپنے سوال میں کیا اس میں جدید ذہن ایک بہت ہی سادہ اورآسان فہم مغالطے کا شکار ہے۔ جدید ذہن کی اکثریت میں یہ ایشو میں نے مشاہدہ کیا ہوا ہے کہ یہ معائنے اور تجزیے کے لئے پیچیدگی کو بنیاد بناتے ہیں۔ اگر کوئی چیز سیدھی سادی اورآسان ہو تو ان کے لیے اس میں کوئی خاص بات نہیں ہوتی اور توجہ کا مرکز نہیں بنتی۔ یہ آسانی میں بھی پیچیدگی تلاش کرتے ہیں۔ اسی طرح قوانین فطرت کی توجیہہ میں بھی یہ حضرات مغالطے کا شکار ہے۔ یہ آپ کے جیب میں جو موبائل فون پڑا ہے اگر مجھے کسی طریقے سے یہ معلوم ہو گیا کہ یہ موبائل فون کس طرح کام کرتا ہے۔ اس کو سگنلز کہاں سے آتے ہیں۔ یہ سگنلز کس طرح وصول کرتا ہے۔ پھر اس کو کس طریقے سے استعمال کر کے ابلاغ کا ذریعہ بناتا ہے۔ یہ تمام معلومات بشمول اور معلومات کے اگر مجھے حاصل ہو جائے تو کیا میں یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہوں گا کہ یہ موبائل فون اپنے آپ سے ہے اس کا کوئی بنانے والا نہیں کیونکہ اس کے اعضاء اور کام کرنے کے قوانین کی مجھے سمجھ آگئی ہے؟ کیا میں ایسا کر سکتا ہوں؟۔۔۔ نہیں۔۔ بالکل بھی نہیں بلکہ میں جتنا اس سے خبر دار ہو تا جاوں گا مجھے اس کے بنانے والا کا یقین پختہ ہو تا جائے گا۔ اور جتنا بھی اچھا اوراعلیٰ کوالٹی کا موبائل فون میرے مشاہدے میں آئے گا۔ اس کے

بنانے والے کی ذہانت اور کاریگری مجھے اپنی گرفت میں لیتی جائے گی کیونکہ تخلیق جتنی اچھی، پائیدار، منظم، مربوط، مترتب، باقرینہ اوردرست ہوگی اتنی ہی اس کے خالق کی ذہانت، دوراندیشی اور کرشمہ سازی اعلیٰ وارفع ہوگی۔ یہی واقعہ و قانون اگر موبائل فون پر لاگو کیا جاسکتا ہے جو کہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں تو اس کائنات پر کیوں نہیں۔۔۔۔ سائنس نے تو میرے رب کے کائنات کی تسخیر کرکے جدید ذہن پر وجود الٰہی کے دروازے واکر دیے ہیں لیکن کاش کہ کوئی جدید ذہن کی توجہ اس طرف دلائے۔ سائنس یہی بتاتی ہے کہ زمین کس طرح گھومتی ہے۔ کس طرح زمین کی گردش سے دن رات اور موسم تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ تو ایک حقیقت کی دریافت ہے جو آج سائنس کی بدولت انسان کے گرفت میں آئی ہے۔ اس سے خدا کی نفی کہاں سے ہوتی ہے؟ بلکہ حقیقتاً اس سے خدا کا اثبات زیادہ کھل کر سامنے آتا ہے کیونکہ اتنا پیچیدہ نظام چلانا اور بالکل صحیح سمت میں چلانا اور بغیر نقص کے چلانا کسی عام ذہن کا کام نہیں۔ اس کے پیچھے ضرور ایک بہت بڑی ذہانت کارفرما ہے۔ کائنات کی پیچیدگیاں ایک طرف، ایک انسانی جسم کی پیچیدگیاں اتنی ہیں کہ سائنس کی اتنی بڑی ترقی کے باوجود گننے سے باہر ہیں وگرنہ سائنس مجھے انسانی ذہن میں ہونے والی کارستانیاں سناکر دکھائے۔ اتنے پیچیدہ نظام کو ٹھیک ٹھاک اور منظم انداز میں چلانا صرف اور صرف میرے عظیم رب کی مہربانی اور عطاہے۔ یہ پیچیدگیاں جتنی انسان پر واضح ہوتی جائیں گی اتنا ہی وہ خالق کے ذہانت کی داد دینے پر مجبور ہوتا جائے گا۔ انہیں پیچیدگیوں کے اعتراف میں دنیا بھر کے سائنسدانوں کے فرمودات ومشاہدات پر مشتمل ایک مکمل سیگمنٹ (Segment) ہمارے آن لائن کورس میں شامل ہے اس موضوع پر مکمل گفتگو وہاں کریں گے اگر زندگی نے ساتھ دیا تو۔

اچھا! اب ذرا سائنس کے اس بڑے دعوے لفظ "توجیہہ" کا جائزہ لیتے ہیں جس نے بہت سے ذہنوں کو مذہب مخالف مغالطے میں مبتلا کر رکھا ہے۔ کیا سائنس یہ دعویٰ کر سکتی ہے کہ میرے پاس جو علم ہے وہ حتمی ہے۔ بالکل پرفیکٹ ہے۔ کر سکتی ہے کیا؟

عبد الاحد صاحب کے اس سوال پر تمام دوستوں نے خاموشی کے ساتھ اپنے سروں کو ہلا کر نفی میں جواب دیا۔

استاد جی دوبارہ شروع ہو گئے۔

سائنس وقتاً فوقتاً نئی نئی دریافتیں و ایجادات کرتی رہتی ہے جس سے پرانے علوم میں نقائص سامنے آکر اور اسے ٹھیک کر کے آگے بڑھ جاتی ہے۔ یہ ایک ارتقائی عمل ہے جس سے ہر علم گزرتا ہے اور ہر وقت محو سفر رہتا ہے کہ وہ بہتری کی طرف گامزن رہے۔ لیکن کوئی بھی اس سفر میں تکمیل کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ آپ ہی کے فزکس کی مثال لیجئے۔ 1905ء میں شروع ہونے والی ماڈرن فزکس نے نیوٹن کے فزکس کا کیا حشر کر دیا۔ یہ واقعہ سب کے سامنے ہے۔ حالانکہ اگر کوئی اب بھی مجھ سے پوچھے کہ سائنس کی دنیا میں سب سے بڑا نام کس کا ہے تو میں بلا تردّد نیوٹن ہی کا نام لوں گا۔ لیکن کیا اتنا بڑا نام کمانے کے باوجود اسکا علم ارتقاء سے مستثنیٰ ہے؟ بالکل بھی نہیں۔ انہوں نے سائنسی دنیا میں بہت سے علوم کی بنیاد رکھ دی۔ اب ان بنیادوں پر ڈھانچے تیار کرنا باقی سائنسدانوں کا کام ہے۔ لہٰذا جب کوئی علم اپنے بارے میں حتمی ہونے کا اعلان نہیں کر سکتی اور ہر وقت بہتری کی تلاش میں سرگرم عمل رہتی ہے تو اسکی توجیہہ کی بنیاد پر کس طرح اتنی بڑی عمارت کھڑی کر دی جاتی ہے کہ کائنات کے خالق کا انکار کر دیا جائے؟ کیا ایسا کرنا بعید از عقل نہیں؟ میرے خیال میں تو ایسا کرنا ہی عقل دشمنی ہے۔

اب آتے ہیں سائنس کی توجیہہ و وضاحت کی حیثیت کی طرف کہ وہ ہمیں کیا کیا معلومات دیتی ہے۔ سائنس ہمیں فطری واقعات کے فطری قوانین بتاتی ہے کہ یہ واقعات

کس طرح رونما ہوتے ہیں جبکہ یہ بتانے سے سائنس قاصر ہے کہ یہ قوانین اتنے منظم انداز میں تشکیل دینے والا اور چلانے والا کون ہے؟ نظام شمسی کی مثال لیجئے۔ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے جہاں پر Gravitational force اور Centripetal force کے درمیان ایک توازن قائم ہے اور اسی وجہ سے یہ شب وروز اور موسمیات کی حرکت جاری ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ قوانین کس نے بنائے۔ اس میں یہ توازن کس نے قائم کیا اور وہ بھی بغیر کسی ادنیٰ نقص کے۔ لہٰذا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ سائنس ہمیں صرف ان قوانین کی اپنی صلاحیت کے مطابق وضاحت کرتی ہے جبکہ ان قوانین کی اصل بتانے سے قاصر ہے۔ اسی طرح سائنس ان قوانین کے رونما ہونے کے پیچھے سبب بتانے سے بھی قاصر ہے۔ وہ یہ نہیں بتاتی کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے سائنس کا اصل مقصد "کیا ہونا" اور "کیسے ہونے" تک محدود ہے۔ "کیوں" کا جواب اس کے پاس نہیں۔ مثلاً ہم کھانا کھاتے ہیں۔ وہ معدے میں پہنچ کر ہضم ہونا شروع کر دیتا ہے۔ اس کے بعد انتڑیوں میں چلا جاتا ہے۔ جہاں وہ مزید تحلیل ہو جاتا ہے۔ وہاں پر انتڑیوں میں چھوٹی چھوٹی رگیں جسم کی ضرورت کے مطابق تحلیل شدہ غذا سے بننے والا ضروری مادہ اکٹھا کر لیتے ہیں جو آگے جا کر توانائی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اسی توانائی کو استعمال کر کے ہم شبانہ روز کی سرگرمیاں انجام دیتے ہیں۔ سائنسدان ہمیں یہ ساری تفصیل مکمل ترتیب کے ساتھ بتا دیں گے لیکن اگر ہم ان سے یہ پوچھیں کہ یہ کیوں ہو رہا ہے۔ کیوں یہ غذا ایک مربوط نظام کے تحت اتنے مراحل سے گزر کر توانائی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ کیوں یہ سارا عمل ایک متعین راستے پر کاربند ہے۔ تو بلاشبہ وہ عجز کا اظہار ہی کریں گے اور اسی پر اکتفا کریں گے کہ ہمارا کام یہ بتانا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کیا ہے۔ یہ نہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کیوں ہے۔

عبدالاحد صاحب ذرا سے خاموش ہو گئے جس کو غنیمت جان کر آکاش نے سوال پوچھ لیا۔

سر! آپ کی بات ٹھیک ہے لیکن سائنس کا کام اور دائرہ کار تجربہ اور مشاہدہ ہے وہ اس سے آگے بڑھ ہی نہیں سکتا۔

عبدالاحد صاحب جو اس وقت نیچے دیکھ رہے تھے آکاش کی اچانک گفتگو پر اس کی طرف ذہنی وجسمانی طور پر مکمل متوجہ ہوئے اور گہری سوچ کے ساتھ اس کے سوال کو سمجھنے کی کوشش میں مصروف ہوگئے جیسے ہی آکاش خاموش ہو گیا عبدالاحد صاحب نے مسکرا کر کہا۔

میرے بیٹے! یہ ایک بہت بڑا مغالطہ ہے کہ سائنس صرف تجربے اور مشاہدے کی گرفت میں آنے والی چیزوں کو مانتی ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ تجربہ اور مشاہدے کے ساتھ ساتھ سائنس استنباط اور استدلال پر بھی یقین رکھتی ہے۔ سائنس ایسی چیزوں کو بھی اسی اصول پر مانتی ہے جس کا تجربہ ومشاہدہ نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً ابھی ہم نے توانائی پر بات کی۔ توانائی کو کس نے دیکھا ہے۔ ہم صرف عقلی استدلال اور محسوسات کے ذریعے توانائی ثابت کر سکتے ہیں۔ کوئی چیز زیادہ گرم ہے اس کا مطلب ہے توانائی زیادہ ہے۔ کسی چیز میں کام کرنے کی صلاحیت زیادہ ہے مطلب اس کی توانائی زیادہ ہے۔ یہ توانائی جو سائنسی علوم کی جزولاینفک ہے عقلی استدلال اور احساس کے بغیر خام خیالی ہے۔ جب توانائی کو عقلی استدلال اور احساس سے ثابت کرنا ممکن ہے تو کائنات میں سب سے زیادہ محسوس ہستی خدا سے انکار کیوں؟ سب سے زیادہ عقلی استدلال اور جواز اسی ہی کے حق میں ہے تو یہ استدلال اور احساس کا قانون اس کی ذات کے لیے اندھا کیوں؟؟ اب ذرا آتے ہیں مشاہدے کی طرف۔ ہم میں سے کسی نے الیکٹران اور پروٹان کو آج تک نہیں دیکھا۔ ان ذرات کو آج تک نہ آنکھ سے دیکھا جاسکا اور نہ ہی خوردبین سے۔ لیکن یہ چھوٹے چھوٹے ذرات سائنس کی بنیاد ہے خاص کر کیمسٹری کے۔ لیکن اس کے باوجود ہم ان کو مانتے ہیں اور ان کی کارستانیوں پر مکمل وثوق کے ساتھ یقین بھی رکھتے ہیں۔ اسی قانون کا اطلاق خدا کی ذات پر کرانے میں کیا چیز مانع ہے؟ ہم نے

بھی تو خدا کو نہیں دیکھا لیکن اس کی جابجانشانیاں پوری کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں حتیٰ کہ ہمارے اپنے جسم میں ایک مکمل فیکٹری روبہ عمل ہے تو اسے ہم کیوں نہ مانیں؟

جو تتلیوں کے پروں پہ بھی پھول کاڑھتا ہے
یہ لوگ کہتے ہیں اس کی کوئی نشانی نہیں

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میرے لیے یہ سائنسی ایجادات خدائے بزرگ وبرتر پر ایمان کی پختگی کے وسیع ذرائع ہیں۔ وہی طاقتور ذات ہے جو دن کو رات میں اور رات کو دن میں تبدیل کرتا رہتا ہے۔ موسم سرما کو گرما اور گرما کو سرما میں۔ پوری کائنات اس کی نشانیوں سے بھری پڑی ہے صرف اس کی طرف توجہ کی ضرورت ہے۔

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوت حق کے لیے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

عبد الاحد صاحب پورے یقین اور جذبات کے ساتھ تفہیمی انداز میں بول رہے تھے اس کا پُر اعتماد لہجہ قابل دید تھا شعر سنانے کے بعد وہ خاموش ہوگئے تا کہ اگر سامعین بور ہو رہے ہو تو اندازہ ہو۔ لیکن چاروں دوست استاد کی گفتگو میں اتنے محو تھے کہ خود کو دنیا ومافیہا سے بے خبر کئے ہوئے تھے جب خاموشی نے طول کھینچنا شروع کیا تو عُویم نے اس سکوت کو سوال کے ذریعے توڑ دیا۔

سر! آپ نے موبائل فون کی مثال دے کر اس کے مخلوق ہونے اور اسی سے وابستہ اسی کے خالق کے موجود ہونے پر استدلال کیا۔ اسی کو اگر ہم آگے بڑھائیں تو پھر خدا کا خالق کون ہو گا؟

عبد الاحد صاحب نے چاروں دوستوں کی گفتگو میں اتنا مگن ہونے پر خوشی کا اظہار مسکرا کر کیا۔ وہ چاروں دوستوں کے چہروں کو سنجیدگی سے پڑھ رہا تھا کیونکہ اسے

احساس تھا کہ کہیں محفل تھکاوٹ کا شکار نہ ہو جائیں۔ بڑے لوگ کبھی بھی اپنے ملفوظات سامعین پر بوجھ نہیں بننے دیتے۔

عبد الاحد صاحب نے مسکراہٹ کے بعد عُویم کے سوال پر تبصرہ کرنا شروع کیا۔

آیئے اس سوال کا جواب فزکس کے طریقہ کار پر ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں آپ حضرات کوئی بھی ہستی فرض کر لیں کہ وہ خدا کا خالق ہے۔ اس فرض کی ہوئی ہستی کا کوئی نام بھی ہونا چاہیئے۔ وہ نام تو ہمیں اس وقت نہیں معلوم لہٰذا وہ بھی فرض کر لیتے ہیں سو فرض کیا وہ ہستی "x" ہے اب میں سوال کرنے کی جسارت کروں گا کہ اس "x" کا خالق کون ہے۔ امید ہے آپ یہی فرض کرنے کے قانون پر اکتفا کریں گے۔ اسی طرح ہم "x" کے خالق کو "y" فرض کر لیتے ہیں۔ پھر ہم "y" کے خالق کی تلاش میں لگ جائیں گے اور قصہ "z" کے حلقے میں آجائے گا۔ یوں ایک لامتناہی سلسلہ خالق و مخلوق کے ضمن میں شروع ہو جائے گا۔ اب کیا عقل اس بات کا تقاضہ نہیں کرتی کہ اس سلسلے کو کہیں نا کہیں رُکنا چاہیئے۔ اس کی کہیں پر کوئی نا کوئی انتہا ہونی چاہیئے اور اس انتہا کے آخر میں کوئی ایسی ہستی موجود ہو جس کے آگے کوئی خالق نہ ہو بلکہ وہ بذاتِ خود خالق ہو، مخلوق نہ ہو۔ اپنی اس امتیازی صفت میں سب سے برتر ہو جو تخلیق کے تمام اصول و قواعد پر پوری طاقت اور ارادے کے ساتھ گرفت رکھتا ہو اور یہ اس لیے کیونکہ وہ اس خالق و مخلوق کے سلسلے کی آخری کڑی ہو گی۔ ہونا چاہیئے کہ نہیں۔۔؟

عبد الاحد صاحب نے سوال پوچھ لیا۔

سب نے یک لخت ہو کر کہا۔

ہاں ہونا چاہیئے۔۔۔ ضرور ہونا چاہیے۔

اس آخری ہستی کو اہل مذہب خدا کا نام دیتے ہیں جو صرف اور صرف خالق ہے مخلوق نہیں۔ اس کو میں ایک اور مثال سے واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ فرض کریں ہم ایک بہت بڑے ہموار میدان کے ایک سرے پر کھڑے ہیں جس کا دوسرا سرا ہماری نگاہوں سے

او جھل ہے۔ اس میدان میں ڈھیر سارے میز ایک دوسرے کو سہارا دیے ایک لمبی قطار میں رکھے گئے ہیں۔ کیونکہ تمام کے تمام میز دو پایے ہیں یعنی دو پیر غائب ہے اور دو پیر موجود ہیں۔ اب دو پیروں کے ساتھ تو میز بالکل ہموار سطح پر کھڑا نہیں کیا جا سکتا لہٰذا ان میزوں کو کھڑا کرنے کے لیے ایک دوسرے کا سہارا لیا گیا ہے یعنی پہلا میز دوسرے پر، دوسرا تیسرے پر، تیسرا چوتھے اور اس طرح چوتھا اگلے پہ تکیہ / ٹیک لگائے ہوئے ایک لمبی قطار میں کھڑے ہیں۔ اس قطار کا آخری سِرا ہماری نظر کی گرفت سے باہر ہے۔ اس مظہر کا مشاہدہ کرنے کے بعد ہم جو معلومات اخذ کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ تمام میز ایک دوسرے کو سہارا دیے ہوئے ہیں جس کے بغیر ان میزوں کا کھڑا رہنا ناممکن ہے اور دوسرا یہ کہ اس سارے مظہر میں کسی دوسری قوت کی دخل اندازی نہیں ہے۔ لہٰذا اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لامتناہی سلسلہ تو اس طرح ناممکن ہے کہ کھڑا رہے کیونکہ قطار کے آخر میں کھڑی میز کو بھی سہارے کی ضرورت پڑے گی وگرنہ دو پیروں کے ساتھ اس کا کھڑا رہنا ناممکن ہے اور اگر وہ گِر گئی تو پوری قطار گر جائے گی۔ لہٰذا اس آخری میز کو دیکھے بغیر ہی عقلی استنباط و استدلال کے ذریعے ہم اس نتیجے پر آسانی سے پہنچ سکتے ہیں کہ ضرور آخری میز اپنے ہی سہارے پر کھڑی ہے اور وہ مکمل ہے یعنی وہ چار پیروں والا ہے۔ اس دلیل کو مانے بغیر ہمارے پاس کوئی اور چارہ نہیں وگرنہ اس پورے نظام کے گر جانے کا خدشہ ہے۔ یہی مثال اس کائنات میں موجود خالق و مخلوق کے سلسلے کی بھی ہے جو آخر میں موجود سب کو سہارا دیے ہوئے ہے، وہی خدا ہے جو کہ مکمل ہے اور اپنے سہارے پر موجود ہے اور اسی ہی کے سہارے نے باقی سلسلے کو قائم و دائم رکھا ہے۔ اسی مثال کو انسان کے تخلیق پر اطلاق کر کے غور و فکر کی کوشش کرتے ہیں اگر کوئی ہم سے پوچھے کہ آپ کو کس نے تخلیق کیا تو مادی لحاظ اور مادی تقاضوں کے مدِ نظر رکھ کر جواب یہ ہو گا کہ میرے ماں باپ نے مجھے تخلیق کیا ہے۔ پھر کوئی پوچھے کہ ماں باپ کو کس نے تخلیق کیا تو جواب ہو گا کہ اس کے ماں باپ نے۔ اس طرح یہ سلسلہ چلتے چلتے پہلے انسان تک پہنچ جائے گا۔ اب کیا یہ سوال پہلے انسان پر پہنچ کر ختم ہو جائے گا؟ بالکل بھی نہیں۔ انسانی عقل تقاضہ کرتی ہے کہ جس طرح باقی انسانوں کی تخلیق پر میرا سوال بنتا ہے تو

اس پہلے انسان کے بارے میں بھی یہی سوال عین عقل کے مطابق ہے کہ اس کو کس نے تخلیق کیا۔ یہ تو صرف ایک انسان کا شجرہ بیان کیا گیا۔ اس کائنات میں ہزار ہا مخلوقات موجود ہیں ان سب کے بارے میں یہی سوال کارگر ہے۔ اس مقام پر ایک سلیم الطبع، غیر متعصب اور عاقل انسان کو صرف مذہب ہی مطمئن کر سکتا ہے کہ ان ساری تخلیقات کا سببِ اول خدا کی ذات اظہر ہے۔

استاد جی نے ہلکی سے مسکراہٹ کے ساتھ خاموشی اختیار کی کہ اس دوران کیف بول پڑا۔

اس آخری کڑی کو اگر ہم کائنات مان لیں تو کیا مضائقہ ہے۔

بیٹا! کائنات کو ہم آخری کڑی مان ہی نہیں سکتے کیونکہ کائنات کا ذرہ ذرہ اپنی ذات میں پکار رہا ہے کہ اسے تخلیق کیا گیا ہے۔ کائنات بذات خود مخلوق ہونے کی گواہی دے رہی ہے۔

اس کائنات کی سب سے اعلیٰ مخلوق انسان ہے کیا اس اعلیٰ مخلوق کا وجود ببانگ دہل یہ پکار نہیں رہا کہ اسے تخلیق کیا گیا ہے۔ ہم بنائے گئے ہیں۔ ہم اپنے آپ سے نہیں ہیں۔ خالق تو اسی ہی کو مانا جائے گا جو اپنے آپ سے ہو۔ جو کسی سے بھی عاجز نہ ہو سکتا ہو۔ ہم تو پل پل دوسروں کے محتاج ہیں۔ زندگی گزارنے کے لئے ایک دوسرے کے محتاج، کھانے پینے کے لئے زمین اور جانوروں کے محتاج، سانس کے لیے ہوا کے محتاج، توانائی کے لیے سورج کے محتاج وغیرہ وغیرہ۔ یہاں پر سب سے اہم بات میں آپ کو بتادوں کہ اس قسم کا نظریہ رکھنے والا اپنی ذات میں مخمصے کا شکار ہوتا ہے۔ اس قسم کے لوگ اس بات کا اقرار تو برملا کر رہے ہوتے ہیں کہ کائنات اپنے آپ سے ہے۔ اس کا کوئی خالق نہیں۔ لیکن جب اہلِ مذہب ان کو خدا پیش کرتے ہیں تو وہ خدا کا خالق ڈھونڈنے لگ جاتے ہیں۔ جب بھی ان سے خدا پر گفتگو ہوتی ہے تو پوچھتے ہیں کہ خدا کو کس نے بنایا۔ حالانکہ وہ کائنات کو بغیر تخلیق کئے اپنا مقدمہ لڑ رہے ہوتے ہیں۔ کبھی ان حضرات نے خود سے یہ سوال کیا ہے کہ کائنات کو کس نے تخلیق کیا ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ کائنات مخلوق ہونے کی گواہی دے رہی ہے اور خدا کی

ذات اس سے پاک ہے اوراب تو سائنس نے بھی کائنات کے مخلوق ہونے کی گواہی دے دی۔ بگ بینگ (Big Bang) کیا ہے؟ سائنس کے مطابق بگ بینگ کائنات کی ابتداء ہے اور سائنس یہ بھی کہتی ہے کہ ایک وقت آجائے گا جب یہی کائنات سکڑ کے یا دھماکے کے ساتھ ختم ہو جائے گی۔ سائنسدانوں کے مطابق دونوں مظاہر کے چانسز موجود ہیں۔ اس اختتام کو سائنس بگ کرنچ (Big Crunch) کا نام دیتی ہے۔ یعنی بگ کرنچ بگ بینگ کی الٹ ہے۔ اس سے واضح ہے کہ اس موجودہ کائنات کی ابتداء بھی ہے اور انتہا بھی۔ اب آپ حضرات مجھے بتائیں کہ جس چیز کی ابتداء ہو اور انتہا ہو، وہ کس طرح خالق ہو سکتی ہے۔ خالق تو وہ ہستی ہوتی ہے جو ازل سے ہو اور جس کو زوال نہ ہو۔ یہاں تو سائنس ہی کے مطابق کائنات نہ ازل سے ہے اور نہ اس کو دوام ہے۔ ابتدائے کائنات ہی اس کے مخلوق ہونے پر دلالت کرتی ہے اور انتہا یعنی خاتمہ صرف مخلوق کو ہے تو اس لحاظ سے بھی کائنات مخلوق ہے۔ ابتداء اور انتہا کی خاصیتیں مخلوق کی ہوتی ہیں خالق کی نہیں۔

عُویم اگلے سوال کی تیاری کر رہا تھا کہ عبد الاحد صاحب نے یہ کہہ کر روک دیا۔ عُویم! آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے آپ اپنے باقی سوالات آن لائن کلاس میں پوچھ لینا۔ ابھی میں نے کسی اور کو وقت دیا ہوا ہے آپ لوگ تب تک ریلیکس (Relax) ہو کر ستالیں۔ دوپہر کا کھانا ایک ساتھ کھائیں گے پھر واپسی کی راہ لے لینا اور ہاں، بھول نہ جانا۔

جنید کے پاس آن لائن کلاس میں حصہ لینے والوں کی لسٹ ہے۔ اس میں اپنا نام، ای میل ایڈریس اور فون نمبر ضرور درج کروا دینا۔

<u>باب شانز دہم</u>

نوائے مَن زِ تاثیرِ دمِ تُست*

یونیورسٹی کے گیٹ پہ داخل ہوتے ہی عریشہ نے دیکھا بینر لگا ہوا ہے کہ آج مین ہال میں ایک شاعر و ادیب کی آمد ہے اور وہ ادب و شاعری پر گفتگو کریں گے۔ بینر دیکھتے ہی عریشہ کا چہرہ کِھل اٹھا کہ چلو اچھا ہوا آج ہوا خوری کا موقع مل جائے گا اور کچھ نئے تجربات و مشاہدات سے بھی سامنا ہو جائے گا۔ اپنے ڈیپارٹمنٹ پہنچنے پر وہ پہلے فیمیل لاونج میں چلی گئی کیونکہ کلاس شروع ہونے میں کچھ وقت رہتا تھا تاکہ سہیلیوں سے مِلا جائے۔

پروگرام 12 بجے شروع ہونے والا تھا تینوں سہیلیاں 15 منٹ پہلے اپنے ڈیپارٹمنٹ سے نکلیں تاکہ بروقت پہنچا جائے۔ سروش کو اس طرح کی ادبی محفلیں کافی پسند تھیں اس کا مزاج ویسے بھی شاعرانہ تھا اور شاعری کے اسرار و رموز سے خوب واقف تھی اس لئے اس طرح کی محفل کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔ مین ہال جاتے ہوئے فزکس ڈیپارٹمنٹ راستے میں پڑتا تھا جس کے سامنے سے گزرتے ہوئے سروش نے اسے آنکھوں کے نیچے سے دیکھا اور دل ہی دل میں سلام کیا چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ بھی چھا گئی جو صرف دائیں گال کے ابھار اور منہ کے ہلکے سے ٹیڑھے پن تک محدود رہی لیکن یہ بھی کسی پر آشکارہ نہ ہوا کیونکہ حجاب چہرے کی حفاظت کی ذمہ داری بخوبی انجام دے رہا تھا۔ کچھ ہی وقفے میں تینوں سہیلیاں مین ہال پہنچ گئیں اور سیٹوں پر براجمان ہو گئیں۔

تھوڑی ہی دیر میں ہال طالب علموں سے بھر گیا، مہمان و اساتذہ کرام بھی جلوہ گر

---

* ترجمہ: میرے نالوں میں تاثیر تیرے ہی دم (عشق) سے ہے۔

ہوئے اور پروگرام شروع ہوا۔ اسی دوران تقاریر بھی ہوئیں جس کے اہم اہم نکات اور پسندیدہ اشعار سروش اپنی ڈائری میں درج کرتی رہی۔ سروش کی یہ عادت تھی کہ جب بھی کسی علمی محفل سے مستفید ہونے کا موقع ملتا تو اپنے ساتھ اپنی ڈائری ضرور لے جایا کرتی تاکہ اچھے اچھے پوائنٹس وقت پر تحریر ہو۔ یوں اس کے لیے ہر علمی محفل ایک لیکچر ثابت ہوتا۔

جب مہمان شاعر تقریر کے لیے اٹھ کر ڈائس کی طرف بڑھا تو ہال تالیوں سے گونج اٹھا طلباء، طالبات اور اساتذہ نے اٹھ کر مہمان شاعر کے لیے آداب پیش کیے۔ پُر مغز اور ادبی تقریر جس میں مہمان شاعر کی حِس مزاح قابل داد تھی کے بعد سوال وجواب کا سیشن ہو گیا۔

سلام عرض کیے دیتا ہوں۔۔۔۔ آداب۔۔۔۔۔ میرا سوال ہے کہ آپ نے شاعری کیوں شروع کی، اکثر کہا جاتا ہے کہ شاعری کے پیچھے عشق کارفرما ہوتا ہے کیا آپ کے ضمن میں یہ خیال حقیقت پر مبنی ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شاعری کی پختگی وتاثیر عشق میں ناکامی پر مصداق ہے۔ یہ حقیقت ہے کیا؟

پیچھے بیٹھے ایک طالب علم نے سوال کیا۔ اس سوال کے ساتھ مہمان شاعر اور سٹیج پر بیٹھے اساتذہ کے چہروں پر مسکراہٹ بکھر گئی، پورے ہال میں خاموشی چھا گئی ہر ایک کی نظر مہمان شاعر پر ٹک گئی کیونکہ سوال کسی حد تک ذاتی تھا۔ شاعر کی ذاتی زندگی کے راز افشا ہونے میں سب دلچسپی لینے لگ گئے۔

مہمان شاعر مائیک کی طرف کِھسک کر پہلے تھوڑا سا مسکرائے اور پھر ہنس کر جواب دینے لگ گئے۔

میرے بھائی! ایسے ذاتی سوال کے لیے اتنی بڑی اور عوامی محفل موزوں نہیں ہوتی۔ لیکن اتنا بتادوں کہ عشق کے بغیر قلم اٹھانا ناممکن ہے، قلم اٹھانا ہی کیا جینا ہی ناممکن

ہے۔ رہا آپ کے سوال کا دوسرا حصہ تو میں اس سے اتفاق کرتا ہوں اور سختی سے اتفاق کرتا ہوں لیکن ضروری نہیں کہ ہر شاعر یا ہر ادیب اس سے متفق ہو۔

مہمان شاعر کی بات شاید ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ سٹیج سے ایک استاذ نے بیچ میں دخل دیا۔

ہم تو ہمہ تن گوش بنے ہوئے تھے کہ آپ ابھی اپنی آپ بیتی بیان کریں گے لیکن آپ نے تو چند لفظوں میں جان چھڑا دی۔ سوال کا جواب دینے کی بجائے سوال پر ہی تبصرے پر اکتفا کیا۔ یہ اندازِ جواب بلکہ یہ خاموشی کس طرف اشارہ کر رہی ہے۔

مہمان شاعر مسکرا کر مائک کی طرف بڑھے۔

شاعری اور محبوب میں کوئی فرق نہیں ہوتا دونوں اشاروں اور کنایوں میں بات کرتے ہیں ان دونوں کو سمجھنے کے لیے ان کے غمزوں وعشووں کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے اور صرف وہی شخص اس سے لطف اٹھا سکتا ہے جن کو ان غمزوں اور عشووں پر دسترس ہو اس سے آگے اگر میرے بارے میں آپ کو اور تفصیل چاہیے، تو اس کے لیے میں آپ کو احمد فرازؔ کا ایک شعر سنا دیتا ہوں۔

تم لاکھ فرازؔ اپنی شکستوں کو چھپائے
یہ چُپ تو تیرے کرب کا اظہار کرے ہے

مہمان شاعر کا جواب اور آخر میں شعر سنتے ہی ہال تالیوں سے گونج اٹھا اور داد ملنی شروع ہو گئی سروش جو کہ یہ سب کچھ پوائنٹس کی شکل میں اپنی ڈائری میں نوٹ کر رہی تھی شعر پر مزید چوکنا ہو گئی اور مسکرا گئی کیونکہ ایک ہی حال کی ترجمانی تھی۔ شعر میں اپنا عکس دیکھنے لگی۔ اس نے شعر کو ڈائری میں قلمبند کر دیا لیکن اس سے بالکل متصل علامہ اقبالؒ کا یہ شعر بھی لکھ دیا۔

باچنیں زورِ جنون پاسِ گریباں داشتم
در جنون ازخود نرفتن کارِ ہر دیوانہ نیست*

اس کے ساتھ ہی کاغذ کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر ایک سوال لکھ کر مہمان شاعر کی طرف بذریعہ قاصد روانہ کیا کیونکہ وہ بول کر سوال نہیں کرنا چاہتی تھی۔

محبت کا اظہار ضروری ہے کیا؟ چاہے بول کر ہو۔ عمل سے ثابت ہو یا چہرے پر تاثرات کی شکل میں ہو۔

عشق و محبت ایک ایسا میدان ہے جس میں ہر شخص اپنا گھوڑا اپنے ہی دُھن پر دوڑاتا ہے اس میں ایک کا تجربہ دوسرے کے لیے راہِ راست نہیں ہو سکتا کیونکہ عشق کی منزل مقصود اطمینان ہے اوراطمینان کے حصول کے راستے اتنے مختلف اوران گنت ہیں جتنے لوگوں کے مزاج۔ لہٰذا آپ کے سوال کو اگر سروے کے ذریعے معاشرے کے لوگوں سے پوچھا جائے تو مجھے یقین ہے کہ کہیں پر بھی اتفاق رائے نہیں آئے گا بلکہ میرے خیال میں اکثریت خاموشی کا سہارا لے گی۔ اس کے ساتھ ایک اور وضاحت کا اضافہ کرتا چلوں کہ بعض کم ظرف اس اطمینان کو ہَوس کا نام دیتے ہیں جو کہ اصل میں اسکی ضد ہے۔

مہمان شاعر نے قدرے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

یہ گفتگو جاری تھی کہ اس دوران عُویم اپنے دوستوں سمیت ہال میں داخل ہوا۔ وہ دائیں طرف کے دروازے سے داخل ہو گیا جہاں طالبات کے بیٹھنے کے لیے جگہ مختص تھی۔ عُویم کو دیکھتے ہی سروش کے اوسان خطا ہو گئے اس کی سِٹّی گم ہو گئی وہ سہم گئی۔

وہ پیکرِ عزت و عصمت، تصویرِ شرم وحیاء، مجسمہ اخلاق و کردار، حسن کی شہزادی، سیرت وصورت کا حسین امتزاج، مجبور و پابند قلب بالکل ہی بے بس بنی بیٹھی تھی اسکے منہ کو چپ کا تالہ لگا ہوا تھا۔ ضبط کے آنسو پی رہی تھی اوران ضبط کے آنسوؤں پر خود ہی نگران بنی

---

* ترجمہ: ایسے شدید جنون کے زور کے باوجود میں نے اپنے آپ کو قابو میں رکھا اور گریبان کا لحاظ رکھا اور چاک نہ ہونے دیا—— جنون کی ایسی کیفیت میں خود پر قابو رکھنا ہر دیوانے کے بس کی بات نہیں۔

بیٹھی تھی اس وقت اس کا حجاب مکمل حفاظت کا سامان لیے پہرہ داری کر رہا تھا وگرنہ اس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا پسینہ بھی آنا شروع ہو گیا تھا حلق بھی خشک ہو گیا تھا جسم بھی ہلکا ہلکا ارتعاش کی زد میں آنے لگ گیا تھا جس کو کنٹرول کرنے کے لیے اس نے دانستہ طور پر دائیں پاؤں کو جنبش دینی شروع کی۔

اِدھر دوسری طرف مہمان شاعر نے سوال کے جواب کے آخر میں مجمع سے خود متعلقہ سوال کے متعلق سوال پوچھ لیا۔

کیا آپ میں سے کوئی اپنی محبت کی داستان محفل کے ساتھ شریک کر سکتا ہے؟ کچھ دیر تو ہال میں خاموشی رہی پھر پیچھے کے بینچوں سے ایک طالب علم اٹھا بلکہ باقی دوستوں نے بالجبر اسے اٹھایا کہ وہ کچھ بول دے۔ پہلے ڈائس کے ساتھ کچھ فاصلے پر رکھے ہوئے دوسرے ڈائس پر آکر اس نے ٹوٹی پھوٹی انداز میں اپنی محبت کو لفظوں میں پرونا شروع کیا جس کو سمجھنا بھی مشکل لگ رہا تھا اس کے بیان کی اچانک اختتام پر ہنسی و حیرانگی کا ملا جلا ردِ عمل آیا اس کے جاتے ہوئے مہمان شاعر نے داد دی لیکن فوراً ہی دوسرا سوال داغ دیا۔

محبت کیا ہے؟

عُویم اور اس کے دوست جواب محفل کا مکمل طور پر ذہنی و جسمانی لحاظ سے حصہ بن گئے تھے دوستوں نے عُویم کو اٹھایا کہ آپ جائیں اور جواب دیں۔ عُویم کے اٹھنے پر ہال میں دادرسی کی خاطر تالیاں بھی بجنی شروع ہو گئیں لیکن وہ نہ جانے کی ضد کر رہا تھا۔

یار مجھے سٹیج پر باتیں کرنی نہیں آتیں اور وہ بھی میرے لیے اس غیر مانوس موضوع پر۔

ہمارے سامنے تو بڑے سخن دان بنے پھرتے ہو، جاؤ۔ جاؤ۔۔ کچھ نہیں ہوتا۔

کیف نے عُویم کو روانہ کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

آپ لوگوں کی بات الگ ہے، وہ سٹیج ہے۔

عُویم نے جاتے جاتے کہا۔

جیسے ہی عُویم ڈائس پر کھڑا ہوا مہمان شاعر نے اپنا سوال دہرایا۔

تو اچھا بیٹا! محبت کیا ہے ؟ محبت کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟

پہلے تو عُویم اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتا رہا اور تھوڑی دیر خاموش رہا پھر دھیرے دھیرے بند آنکھوں کے ساتھ دھیمی آواز میں شروع ہو گیا۔

"محبت زندگی ہے، محبت ہی کائنات کی ابتداء ہے، محبت ہی کائنات کی انتہا ہے، محبت ہی اس کائنات کی اساس ہے، محبت کے بغیر زندگی ادھوری ہے، ادھوری کیا محبت کے بغیر زندگی کا وجود ہی نہیں، محبت تپتی صحرا میں جوئے آب ناب ہے، محبت سپردگی ہے، محبت اپنے دل و دماغ، ہوش و حواس، خیالات و تصورات اور جذبات و احساسات کو کسی ایسی جگہ پر پٹی باندھے آنکھوں سے خوشی خوشی پڑاؤ کروا دینا ہے جس کا پتہ بھی معلوم نہ ہو، محبت اپنی انا کو کسی پر خوشی خوشی نچھاور کرنے کا نام ہے، یہ فسانہ میرے عقل و فہم سے ماورا ہے کہ اس کائنات میں کوئی ایسا شخص بھی ہو جس کو محبت کی ہوا نہ لگی ہو، ہو ہی نہیں سکتا، انسان کے لاشعور کو محبت سے بھر دیا گیا ہے، محبت ہی انسانیت کی مُرشد ہے، محبت ہٹا دو تو یہ دنیا چند پل کی مہمان ہے، انسان انسان کو کھا جائے گا، کائنات کا وجود ہی مٹ جائے گا"۔

یہ الفاظ سنتے ہی سروش کے پاؤں تلے زمین نکل گئی کیونکہ یہ وہی سروش کے الفاظ تھے جو اس نے اپنی ڈائری میں درج کئے تھے بالکل ہو بُہو وہی الفاظ اور وہی ترتیب۔

آخری فقرہ کہتے ہی عُویم سٹیج سے اتر کر اجازت لئے بغیر جلدی جلدی اپنے سیٹ کی طرف روانہ ہوا کہ اس دوران مہمان شاعر نے اٹھ کر تالیاں بجانا شروع کیں اور اس کے ساتھ پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا سروش جو مجسمہ حیرت بنی ہوئی تھی جلدی جلدی اپنی ڈائری کے اوراق پلٹنے لگی اس کی نظروں کے سامنے یہی عبارت لکھی ہوئی مسکرا رہی تھی

جس کو ابھی تھوڑی دیر پہلے عُویم گوش گزار کر چکا تھا۔ سروش نے نمناک آنکھوں کے ساتھ مُسکرا کر عبارت پر ہاتھ پھیرا جیسے وہ انگلیوں سے اس کا بوسہ لینا چاہ رہی ہو۔

عُویم کے سیٹ پر پہنچتے ہی دوستوں نے باہیں پھیلا کر اس کا خیر مقدم کیا اور گلے ملنے لگے لیکن عُویم حیران تھا اور بار بار پوچھ رہا تھا کہ "میں نے کیا کہا مجھے تو خود بھی پتہ نہیں۔ یہ داد وستائش حقیقی ہے یا میرا مذاق اُڑایا جارہا ہے"۔

باب ہفدہم

نظریۂ ارتقاء کا سائنسی و تاریخی رَدّ

عُویم! آج عصر کے وقت ہاسٹل آجانا ایک ضروری کام کے سلسلے میں کہیں جانا ہے۔ کلاس کے اختتام پر رخصتی کے دوران فردان نے عُویم سے کہا۔

کہاں جانا ہے۔ خیریت تو ہے۔

ہاں! شکر ہے خیریت ہے۔ ایک ڈاکٹر صاحب سے ملنا ہے۔

ٹھیک ہے۔ میں آجاؤنگا۔

شام کو عُویم ہاسٹل پہنچ گیا جسکے لئے باقی دوست گیٹ پر انتظار کر رہے تھے۔ اُس کے پہنچتے ہی وہ گاڑی میں بیٹھ گئے اور روانہ ہو گئے۔

اُس وقت مناسب نہیں سمجھا کہ پوچھا جائیں کہ کس ڈاکٹر صاحب سے ملنا ہے اور کیوں؟ اب بتادیں کیا مسئلہ ہے اور کونسے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔

عُویم نے روانہ ہوتے ہی فردان سے سوال پوچھ لیا۔

ہمارے فیملی ڈاکٹر ہیں اور ابو کے قریبی دوست ہیں۔ ہم انہیں انکل پکارتے ہیں۔ ماہر نفسیات ہے۔ ہفتہ پہلے اسکی اپوائنٹمنٹ لی تھی۔ فون کے ذریعے اس سے بات ہوئی تھی۔ وہ باقی پورا ہفتہ گاؤں کے ہسپتال میں کام کرتے ہیں صرف ایک دن کیلئے یہاں آتے ہیں۔ اور کلینک میں چک اپ کراتے ہیں۔ نبض شناسی کے ساتھ ساتھ کتاب دوستی کا بھی مشغلہ رکھتے ہیں۔ اُس نے فون پر بتایا کہ شام کے آخری اوقات میں آجانا۔

فردان نے آہستہ آہستہ جواب دیا۔ جس پر دوستوں نے تفہیمی انداز میں سروں کو ہلا کر ہاں میں ہاں ملا دی۔

ڈاکٹر صاحب کے کلینک پہنچنے پر فردان نے بذریعہ اسسٹنٹ اطلاع کر دی کہ فردان آیا ہے جسکے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے ہلکے سے انتظار کا کہا کہ بس چند مریض رہ گئے ہیں انکی باری ختم ہو پھر کُھل کر آرام سے گفتگو کر لیں گے۔ وقت کا بھی کوئی مسئلہ نہیں رہے گا۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے انتظار کے بعد اسسٹنٹ نے اطلاع کر دی کہ ڈاکٹر صاحب بُلا رہے ہیں۔ چاروں دوست اُٹھ کھڑے ہوئے۔ کپڑے سیدھے کئے۔ بالوں پر ہاتھ پھیرے اور فردان کی رہبری میں ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں داخل ہو گئے۔

السلام علیکم انکل!

وعلیکم السلام بیٹا !

ڈاکٹر صاحب نے اُٹھ کر بڑی گرمجوشی اور اپنائیت کے ساتھ چاروں دوستوں کو خوش آمدید کہا۔ سلام کیا اور ہاتھ ملایا۔

بیٹھ جایئے۔۔۔۔ بیٹھ جایئے

ہاں !تو کیسے ہیں آپ سب۔ پڑھائی کیسی جا رہی ہے۔ ہاسٹل اور یونیورسٹی میں کوئی مسئلہ تو نہیں۔

ڈاکٹر صاحب خیریت دریافت کرنے لگ گئے۔

بالکل ٹھیک جا رہی ہے۔ اور سب کچھ ٹھیک ہے۔ شکر ہے کوئی مسئلہ نہیں۔ فردان نے جواب دیا۔

اسکے بعد فردان نے تینوں دوستوں کا ڈاکٹر صاحب سے تعارف کرایا جسکا جواب ڈاکٹر صاحب نے شفقت بھری مسکراہٹ کے ساتھ سر ہلا کر دیا۔

اچھاتو فردان بیٹا ! تب تک چائے آجائیگی اور میں مریض کا چیک اپ کر لونگا۔ کس کے بارے میں آپ فون پر بتارہے تھے۔ وہ اِدھر آکر میرے قریب بینچ پر بیٹھ جائیں۔

ڈاکٹر صاحب نے پین اور پرچی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

عُویم۔۔۔۔

فردان نے عُویم کی طرف دیکھ کر کہا۔

عُویم اپنانام سُنتے ہی چونک گیا۔ اور تیز نظروں سے فردان کو گھُورنے لگا۔

کیا۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ میں توٹھیک ٹھاک ہوں۔

عُویم حیرت بھری نظروں میں جلدی جلدی گویاہوا۔

تمام دوست ڈاکٹر سمیت ایک دوسرے کا مُنہ تکنے لگے۔

عُویم! مجھے کئی مہینوں سے محسوس ہورہاہے کہ آپ تنہائی کا شکار ہونے لگے ہیں۔ آپ کے جسم و رُوح میں ایک عجیب سی خاموشی چھا گئی ہے۔ ہمیشہ غوروخوض میں رہتے ہو۔ فکرواندیشوں میں گم رہتے ہو۔ اداس اور بجھے بجھے سے دکھائی دیتے ہو۔ کبھی کبھار بہکی بہکی اور اُلٹی پُلٹی باتیں بھی کرنے لگتے ہو۔ اور فکر اس بات کی ہے کہ ان سب میں شدّت بھی آرہی ہے۔ سب سے بڑھ کر جس چیز نے مجھے انکل کے پاس آنے کے فیصلے پر مجبور کیا۔ وہ یہ کہ آپ نے ایک دن بتایا کہ اس تنہائی کے دوران آپ کے دل کی دھڑکن بھی تیز ہو جاتی ہے ۔ دل کُڑھنے لگتاہے اور پسینہ آناشروع ہو جاتاہے۔

فردان نے بڑے پیار اور محبت سے عُویم کو اسی ہی کا دُکھڑا سُنا دیا۔

ہم آپکی کوئی سرجری نہیں کرانے جا رہے ہیں۔ یہ عام سا نارمل چیک آپ ہے۔ بلکہ میں توجب بھی گھر جاتاہوں۔ انکل ویسے ہی میری چیک اپ کر دیتے ہیں۔ چلو اُٹھو اب اور وہاں بیٹھ جاؤ۔

فردان نے بات جاری رکھتے ہوئے اصرار کے ساتھ بولا۔

عُویم متحیر انداز میں مُنہ بنا کر اور کندھے اُچکا کر اپنی نشست سے اُٹھا اور ڈاکٹر صاحب کے قریب والی بینچ پر بیٹھ گیا۔

ڈاکٹر صاحب نے کُرسی گُھمائی اور عُویم کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے ابھی ایک شَبد بھی مُنہ سے نہیں نکالا تھا کہ عُویم خود بخود اجازت لئے بغیر شروع ہو گیا۔

فردان نے عجلت میں پوچھے بغیر فیصلہ کیا ہے۔ ہم تو سمجھ رہے تھے کہ وہ اپنے کسی مسئلے کی تشخیص اور علاج کرنے آیا ہے۔ اس نے تو مجھے حیران کیا جب اس نے علاج کیلئے میرا نام لیا۔ میں تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ فردان نے جو میرے بارے میں کہا۔ وہ کِس کے ساتھ نہیں ہوتا۔ تنہائی کسے نہیں پسند۔ غور و فکر کون نہیں کرتا۔ لیکن ان سب کے باوجود میری طبیعت بحال ہے۔ اور ڈاکٹر صاحب! مجھے دوائیوں سے ڈر لگتا ہے۔

عُویم نے بڑی معصومیت کے ساتھ اپنی بات پوری کی۔ جس میں اس نے چوری چُھپکے اپنی اضطراب کی کیفیت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔ وہ اضطراب جسے اُس کو خود بھی سمجھ نہیں آرہی تھی تو بتاتا کیسے۔ ایسا اضطراب جو الفاظ کے جامے میں نہیں سمیٹا جاسکتا تھا۔ الفاظ و معنی اس کو بیان کرنے سے قاصر تھے۔ وہ صرف آنسوؤں اور دل گرفتگی کی زبان سمجھتا تھا۔ تنہائی اسکا بچھونا تھی اور ارتعاش بدن و تذبذب فکر اس کا تکیہ۔ عُویم اس لئے جلدی جلدی اور بغیر اجازت کے بولنا چاہتا تھا تاکہ پُرسش سے پہلے اور آناًفاناً چیک اپ ختم ہو اور جان چھڑائی جائے کیونکہ وہ حالات بھانپ گیا تھا کہ سامنے تجربہ کار نفسیات دان بیٹھا ہے اور باتوں باتوں میں اُس سے باتیں نکلوا سکتا ہے۔ وہ اپنی اضطراب کی کیفیت کو کسی پر بھی آشکارہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسکا علم صرف اُسے اور اُس کے خدا کو تھا اور کسی کو نہیں۔ دوستوں کے ساتھ بھی اُس نے کبھی اس ضمن میں گفتگو نہیں کی تھی تو ڈاکٹر صاحب تو دُور کی بات ہے۔

بیٹا! اتنی جلدی کیا ہے۔۔۔۔۔ کیا چُھپا رہے ہو۔؟

ڈاکٹر صاحب نے مسکرا کر کہا۔

نہیں نہیں سر، کچھ نہیں چُھپا رہا۔ یہ تینوں دوست مجھے جانتے ہیں۔ میں کیا چھپاؤ نگا۔

عُویم نے اعصاب کو قابو کرتے ہوئے جواب دیا۔

اسی گفتگو کے دوران ڈاکٹر صاحب معمول کا چیک اپ بھی کرتا رہا کہ بیچ میں آکاش نے چھلانگ لگادی۔

سَر ! میرے خیال میں تو اور کچھ نہیں چھپا رہا بس آجکل مذہبیت اور لا مذہبیت کے بارے میں اُلجھن کا شکار ہے۔

اچھا۔۔۔ یہ تو بڑا دلچسپ اور انو کھا موضوع ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے توجہ دیے بغیر جواب دیا کیو نکہ اسکی ساری توجہ عُویم کے چیک اپ پر مرکوز تھی۔ وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ عُویم زیادہ سے زیادہ باتیں کرے۔ لیکن وہ بالکل خاموش تھا حتیٰ کہ آکاش کی رائے کے بارے میں بھی کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

چیک اپ کے بعد عُویم بینچ سے اُٹھ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ اسی دوران چائے بھی آگئی۔

اچھا تو عُویم بیٹا! مذہب کے بارے میں کیا اُلجھن ہے آپکو۔

ڈاکٹر صاحب نے براہ راست عُویم سے سوال پوچھ لیا۔

مجھے مذہب کی سمجھ نہیں آتی۔

عُویم نے مختصراً جواب دیا۔

سمجھ تو مجھے جنات کی بھی نہیں آتی تو کیا میں اسکا انکار کروں کہ وہ نہیں ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

جب انسان اپنے آپ سے ہے۔ تو کیوں وہ اپنے اوپر کسی برتر ہستی کو نافذ کر دیں اور مذہب کا دامن پکڑیں۔

کیف جو ابھی تک خاموش بیٹھا تھا، نے سوال پوچھ لیا اور بحث کی ابتدا کر دی۔

ڈاکٹر صاحب مُنہ کھولنے ہی والا تھا۔ کہ اچانک عُویم گویا ہوا۔

سر! مجھے میڈیسن کی ضرورت تو نہیں پڑیگی نا؟

اُس نے معصومیت کے ساتھ دھیمی آواز میں دریافت کرنا چاہا کیونکہ وہ محفل کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتا تھا اور خواہش تھی کہ جلد از جلد محفل برخاست ہو۔

ڈاکٹر صاحب نے عُویم کے سوال کو مسکرا کر ٹال دیا اور کیف کے ساتھ گفتگو جاری رکھی۔ وہ سوال و جواب کا سلسلہ آگے بڑھانا چاہتا تھا تاکہ حقیقت سے شناسائی بھی حاصل ہو اور عُویم کی شخصیت و مزاج کو کُریدنے کا موقع بھی مل جائے۔

اچھا تو کیف بیٹا! کون کہتا ہے کہ انسان اپنے آپ سے ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے کیف کی طرف متوجہ ہو کر سوال کیا۔

نظریہ ارتقاء۔۔۔ کیف کا مختصراً جواب آیا۔

نظریہ ارتقاء کب سے حقیقت بن گئی؟

سائنس کہتی ہے۔

سائنس کی نظر میں نظریہ ارتقاء کب سے ثابت شدہ حقیقت بن گئی ہے؟

سائنسی کتب اور نصاب میں باقاعدگی سے پڑھایا جارہاہے۔

تو نصاب کا حصہ ہونے سے اس کی حقیقت ثابت ہو جاتی ہے کیا؟

ہلکی سی خاموشی چھاگئی۔ ڈاکٹر صاحب اور کیف کے درمیان چھوٹے چھوٹے سوالات و جوابات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جس میں ڈاکٹر صاحب نہایت پُراعتمادی کے ساتھ مُسکرا کر سوال کرتا جارہا تھا۔

چلو ویسے بھی مریضوں کی تعداد ختم ہو گئی ہیں اور ہمارے ساتھ وقت بھی کافی ہے سو اس نظریہ ارتقاء پر گفتگو کرتے ہیں۔ میں چُونکہ شعبۂ طب سے تعلق رکھتا ہوں اسلئے

سائنس اور بالخصوص بیالوجی میرے مضامین میں شامل ہیں اور نظریہ ارتقاء کا تعلق اصلاً اسی سے ہے۔لہذا اس پر سیر حاصل گفتگو کی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے گفتگو کیلئے میدان ہموار کر دیا۔

نظریہ ارتقاء کی سب سے بڑی خوش قسمتی یہ رہی ہے کہ اس نے سائنس کے پیچھے اپنے آپ کو چُھپا لیا ہے۔حالانکہ ہے "نظریہ"، جبکہ پیش ایسے کیا جاتا ہے جیسے ثابت شدہ حقیقت ہو۔ سائنس آجکل اتنی متاثر کن حقیقت بن چکی ہے کہ اسکا انکار جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ سائنس نے تجربات و ایجادات سے اتنے کرشمے دکھائے ہیں کہ عوام النّاس تو کیا خواص اور تعلیم یافتہ لوگ بھی بلا کسی تُردّد کے سائنس کی اندھی تقلید میں پھنس گئے ہیں کیونکہ ایک طرف تو سائنس کی انسان کیلئے حسب خواہش و آرائش و آسائش خدمات ہیں جس سے انکار ناممکن ہے اور دوسری طرف سائنسی علوم تک ہر ایک شخص کی رسائی مشکل ترین کام ہے۔ سائنس کے پیچیدہ اور مشکل اصطلاحات عام آدمی کیلئے دہشت سے کم نہیں۔ میرا مقصد یہاں سائنسی علوم کی تردید کرنا نہیں بلکہ سائنس کے حدُود کا تعین ہے کیونکہ میں بذاتِ خود سائنس کا ایک طالب علم ہوں۔ سائنس سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن اس کی اندھی تقلید کے خلاف ہوں اور اسکے ساتھ ساتھ وہ نظریہ جو سائنس کا جھوٹا سہارا لے رہی ہے،اس کے خلاف ہوں۔ سائنس ہی اگر اسکی تردید کیلئے سامان مہیا کریں تو ضروری ہے کہ حقیقت عام انسان کی پہنچ میں آجائے اور اسکی اندھی تقلید بند کی جائے۔ نظریہ ارتقاء سب سے زیادہ فریب کی سیڑھیاں چڑھنے والا نظریہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے سائنس اور نظریہ ارتقاء کے بارے میں تمہیدی کلمات پیش کئے کہ اس دوران آکاش نے سوال پوچھ لیا۔

تو کیا نظریہ ارتقاء کو سائنس کے ذریعے غلط ثابت کیا جاسکتا ہے؟

کیا جاسکتا ہے کا کیا مطلب۔۔۔ کیا جاچکا ہے۔ صرف آپ جیسے ذہین حضرات تک وہ معلومات پہنچائی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے مُسکرا کر جواب دیا اور ساتھ میں چائے کا کپ بھی اٹھالیا۔ چائے کا گھونٹ لینے کے بعد دوبارہ گویا ہُوئے۔

نظریہ ارتقاء کا بانی ایک انگریز فطرت پرست چارلس ڈارون ہے۔ اُسے فطرت اور جاندار اشیاء کے مطالعے اور مشاہدے سے گہری دلچسپی تھی۔ اسکے لئے وہ دنیا کے مختلف خطے دیکھنے اور اسکا مشاہدہ و مطالعہ کرنے کے لئے 1832ء میں انگلستان سے روانہ ہوا اور پانچ برس تک اس میں مصروف رہا۔ اس دوران اُنہیں الجزائر میں نظر آنے والی سنہری چڑیوں نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ اس کے خیال میں انکی چونچوں کا مختلف ہونا انکے جائے پیدائش کے مختلف ہونے کی وجہ سے ہے۔ اس خیال کو ذہن میں لیتے ہوئے اُس نے یہ فرض کرلیا کہ مخلوقات کا تنوع اور تفاوت ماحول و جگہ سے مطابقت پذیری میں پوشیدہ ہے۔ اِس فرضی قیاس کو پیچھے کھینچتے ہوئے اُس نے زندگی کے آغاز اور جانداروں کی ابتداء کا بھی تعین کرلیا۔ اسکے خیال کے مطابق جانداروں کو اللہ تعالیٰ نے علیحدہ علیحدہ تخلیق نہیں کیا بلکہ ان سب کا ایک ہی مشترکہ مورث اعلیٰ یا جدِ امجد یک خلوی بیکٹیریا ہے جو سمندر کی تہہ میں پیدا ہوا اور بعد میں بڑھتے بڑھتے اور قدرتی حالات کے نتیجے میں ارتقاء کرتے کرتے تمام جانداروں کی تخلیق کا سبب بنا۔ یہ جاندار فطری انتخاب کے ذریعے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے گئے جس کی موجودہ جدید ترین ارتقاء یافتہ شکل انسان ہے۔ ڈارون نے اس سارے عمل کو ارتقاء بذریعہ فطری انتخاب کا نام دیا۔ ان خیالات کا اظہار انہوں نے 1859ء میں اپنی کتاب "جانداروں کی ابتداء بذریعہ فطری انتخاب "

(The origin of species by means of natural selection) میں کی۔

یہاں پر میں یہ بھی واضح کرتا چلوں کہ یہ سب کچھ کوئی سائنسی دریافت یا تجربے پر مبنی حقیقت نہیں تھی بلکہ ایک خیال تھا۔ ایک دعویٰ تھا۔ ایک قیاس تھا کہ ایسا ہوا ہو گا۔ ڈارون کا خیال تھا کہ آنے والے وقتوں میں فاسل ریکارڈز (Fossil Records) اس نظریے کو حقیقت ثابت کردے گی لیکن آج تک ڈیڑھ صدی سے زائد عرصہ گزرنے کے بعد بھی فاسل ریکارڈز اس نظریے کو ثابت کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ فاسل ریکارڈز پر آگے چل کر ہم گفتگو کرینگے جسکو سُن کر آپکے رونگھٹے کھڑے ہو جائینگے۔ ان فاسل ریکارڈز کے بارے میں ڈارون کو یہ احساس اسی وقت ہوا گیا تھا کہ یہ نظریہ کن کن مسائل سے دوچار ہو گا۔ اسی وجہ سے اس بات کا اعتراف انہوں نے اپنی اسی کتاب میں ایک باب سے کیا جسکا عنوان ہے "نظریے کی مشکلات"۔ ان مشکلات کے بارے میں ایک امریکی ماہر طبیعیات ایچ۔ ایس۔ لپسن (H.S.Lipson) نے یُوں تبصرہ کیا ہے۔

"جانداروں کی ابتداء کے بارے میں پڑھتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ ڈارون تو خُود اس بارے میں بہت کم یقین رکھتا تھا۔ جس طرح اسے اکثر پیش کیا جاتا ہے ایسا نہیں ہے"

نظریہ ارتقاء یا ڈارونِزم (Darwinism) کے مطابق یہ کائنات اور اس میں موجود تمام مخلوق محض اتفاق سے وجود پذیر ہوئے۔ ابتدائی جاندار یعنی بیکٹیریا ارضی حالات کے تحت اتفاق سے وجود میں آیا اور پھر ارتقائی عمل سے بڑھتا گیا اور مخلوقات ارضی بنتے گئے۔ اسکا مطلب یہ ہوا کہ ان تمام مخلوقات کی تخلیق میں خالق کا کوئی عمل دخل نہیں بلکہ محض اتفاق وارتقاء کا نتیجہ ہے۔ چلو اب نظریے کی عقلی اور سائنسی جانچ پرکھ کرتے ہیں۔

آپ سب سائنس کے طلباء ہیں۔ احتمال کا قانون یا قانون امکانیت (Law of Probability) آپ سب نے پڑھی ہو گی۔ اس قانون سے کسی واقعے کے رونما ہونے کے امکانات معلوم کئے جاتے ہیں۔ مثلاً اس قانون کے مطابق اگر لڈو کا پانسہ (Dice) پھینکا جائے تو ہندسہ "ایک" کے آنے کے امکانات چھ میں صرف ایک دفعہ ہے۔

اس طرح یہ امکان کہ لگاتار پھینکنے سے ایک اور دو بالترتیب آجائیں اسکا امکان 36 میں ایک دفعہ ہے اور یہ امکان کہ ایک، دو، تین بالترتیب آجائیں، 216 میں سے ایک ہے۔ اس طرح جاتے جاتے کہ پھینکنے سے پانسہ ایک، دو، تین، چار، پانچ اور چھ بالترتیب ظاہر کردیں۔ 46656 بار پانسہ پھینکنے سے صرف ایک بار ایسی ترتیب کے آنے کا امکان ہے۔

اب اس قانون کا اطلاق زندگی کی بنیادی اکائی خلیے کی بناوٹ پر کرتے ہیں۔ خلیے کا سب سے اہم جُز پروٹین ہوتا ہے۔ جو کہ پانچ کیمیائی عناصر سے مل کر بنتا ہے۔ کائنات میں موجود تمام دریافت شدہ اور غیر دریافت شدہ عناصر میں سے ان پانچ عناصر کا اتفاقاً ملنے اور پروٹین سالمے (Molecule) کے مطابق شکل و ترتیب پانے کے امکانات 10^{160} میں صرف ایک ہے۔ (10^{160} کا مطلب ہے 10 کو 10 سے 160 مرتبہ ضرب دیا جائے یا 1 کے پیچھے 160 صفر لگا دیے جائے) اور اگر یہ واقعہ زمین پر پیش آئے تو اسکے لئے 10^{243} سال درکار ہونگے۔ علم الحساب کی رُو سے اگر کوئی امکان $1:10^{50}$ سے کم ہوجائے تو وہ ناممکن سمجھا جاتا ہے۔ مزید براں ایک پروٹین سالمے کی ساخت میں امائنوایسڈ (Amino Acid) کا ایک لمبا سلسلہ ہوتا ہے۔ جسکی کڑیاں 10^{48} مختلف طریقوں سے جُڑ سکتی ہیں۔ ان میں صرف چند طریقے ایسے ہیں جن سے بنا پروٹین زندگی کیلئے مناسب ہوتا ہے۔ اگر کسی نامناسب طریقے سے اسکی کڑیاں جُڑ جائیں تو حیات کیلئے اُلٹا زہرِ قاتل بن جاتا ہے۔ یہ تو صرف وہ امکان اور وہ درکار وقت کا تخمینہ ہوا جس میں ایک پروٹین ایک خاص شکل و ترتیب کے مطابق تشکیل پاتا ہے۔ اس میں زندگی کا پیدا ہونا تو بعد کی بات ہے جو کہ ابھی تک ارتقاء پسندوں کیلئے ایک معمہ اور درد سر ہے۔ اس طرح یہ تو ایک قسم کی پروٹین بننے کیلئے تخمینے اور اندازے ہیں جبکہ سائنس نے ایک سادہ قسم کی بیکٹیریا میں 2000 قسم کے پروٹین کے امکانات ظاہر کئے ہیں۔ اب آپ لوگ خود ہی اندازہ لگائیں کہ اس ایک پروٹین کیلئے اتنا زیادہ وقت درکار ہے اور اتنے کم امکانات ہیں تو پورے خلیے کی بناوٹ میں کتنی

دشواری ہوگی جس میں پروٹین کے علاوہ اور بھی کافی اہم اجزاء ہوتے ہیں جیسا کہ کاربوہائیڈریٹ (Carbohydrate) اور چکنائی (lipid) وغیرہ۔ اسکے بعد پھر پُورا اور مکمل جسم بھی تو بننا ہے۔ یہ تو صرف مختلف مادی اشیاء کے ملاپ اور ترتیب کے لیے درکار وقت ہے۔ جب جسم مادی ڈھانچے کی شکل اختیار کرلیں پھر سب سے مشکل ترین مرحلہ روح کا اس ڈھانچے میں حلول کرنا ہے۔ اس کے لیے کتنا وقت اور کتنی توانائی درکار ہوگی اس پر سائنس خاموشی اختیار کئے ہوئے ہے۔

حیرت انگیز۔۔۔۔انتہائی حیرت انگیز۔۔۔۔۔

جبکہ اسکے ساتھ ساتھ دلچسپ ترین امر یہ ہے کہ زمین کی عُمر سائنس کے مطابق 4.6 بلین(4.6×10^9) سال ہے جو کہ پتھروں کی سائنسی طریقہ تابکاری (Radioactivity) سے معلوم کیا گیا ہے۔ اب کوئی صاحب عقل مجھے یہ بتائیں کہ اس 4.6 بلین سال میں ایک، صرف ایک پروٹینی سالمہ کس طرح بن سکتا ہے۔ جس کی بناوٹ کیلئے درکار وقت زمین کی عمر سے انتہائی زیادہ ہے۔ پوری کائنات کی عمر اور اسکا مادہ بھی محض ایک پروٹین کو اتفاق کے ذریعے وجود میں لانے کا سبب نہیں بن سکتا تو یہ کھرب ہا کھرب خلیے اور اس سے پھر کھرب ہا کھرب جاندار کس طرح وجود میں آسکتے ہیں۔۔۔۔۔اور یہ عرض کرتا چلوں کہ یہ تمام حساب اور گنتی سائنس نے کی ہے اہل مذہب نے نہیں۔

سچ کہوں تو مجھے کبھی کبھار اس حادثے اور اتفاق والی تعبیر پہ ہنسی آجاتی ہے اور حیران ہو جاتا ہوں کہ کس طرح بعض اعلیٰ اذہان اس خوبصورت اور پیچیدہ کائنات کو اتفاق کا نتیجہ سمجھتے ہیں جس کی نہ کوئی ریاضی کا قاعدہ طرفداری کرتا ہے اور نہ عقلی تعبیر۔ یہ تکے پہ تکے والی بات ہے۔ اگر کوئی کہے کہ فلاں کام تکے سے اتفاقاً ہو گیا تو عقل ماننے کو تیار ہو جاتی ہے۔ اس طرح دوسری بار بھی تکہ کسی حد تک مانا جا سکتا ہے۔ تیسری بار تکے پر شک اپنا کام دکھانا شروع کر دیتا ہے لیکن جب کوئی یہ کہے کہ سب کچھ تکے پہ ہی ہو رہا ہے تو یہاں پر عقل

اپنے راستے جدا کر دیتی ہیں۔ یہ صرف خالق کی تخلیق سے بچنے کی خاطر اتنے بعید البعید سہارے لئے جاتے ہیں۔

آخری فقرہ کہتے ہوئے ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر ہلکی سی مُسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی جبکہ دوسری طرف چاروں دوست ششدر اور بے حس و حرکت بیٹھے ہوئے تھے کیونکہ چاروں کے چاروں سائنس کے طلباء تھے اور سائنس و ریاضی کی زبان خُوب سمجھتے تھے۔

جب سکُوت لمبا ہونے لگا تو فردان نے دخل دیا۔

انکل! ڈارونزم کا ایک اہم نقطہ فطری انتخاب بھی ہے۔ اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ یہ تو ہماری روز مرہ زندگی کا واقعہ ہے کہ فطرت فطری اصُولوں کے مطابق انتخاب کرتی رہتی ہے اور موزوں و مناسب جاندار بچ جاتے ہیں اور باقی فنا کی زد میں آجاتے ہیں۔

فطری انتخاب سے کون انکار کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ روز مرہ کا معمول ہے۔ ڈائنوسار انتخاب کے معیار پر پُورا نہیں آنے لگا، سو فنا ہوا۔ ہرنوں کے ریوڑ کے پیچھے اگر شیر لگ جائیں تو جو ہرنی تیز نہیں بھاگے گی وہ شکار ہو جائیگی اور فنا اُسکا مقدر ٹھہرے گی۔ اعتراض ہمیں فطری انتخاب پر نہیں اور نہ ہو سکتا ہے بلکہ اعتراض فطری انتخاب کے ذریعے جانداروں کے نوع کی تبدیلی پر ہے کہ فطری انتخاب کے ذریعے فلاں جانور تبدیل ہو کر دوسرا جانور بن گیا۔ فوسل ریکارڈز میں ایسے واضح دلائل موجود ہیں کہ ایسی کوئی تبدیلی سرے سے وجود میں نہیں آئی۔ کولن پیٹرسن (Colin Patterson) جو انگلستان کے میوزیم آف نیچرل ہسٹری میں ایک سنیئر ماہر قدیم حیاتیات ہے وہ لکھتے ہیں۔ "آج تک کوئی بھی انتخاب کے میکانکی عملوں کے ذریعے جاندار پیدا نہیں کر سکا نہ کوئی اسکے قریب بھی آیا ہے"۔

ارتقاء پسند حضرات فطری انتخاب کے ضمن میں جو سب سے بڑی دلیل پیش کرتے ہیں وہ انگلستان میں صنعتی انقلاب کے دوران پروانوں کی تعداد کے بارے میں ہے۔ بیان

کردہ تفصیل کے مطابق انگلستان میں صنعتی انقلاب کے آغاز کے آس پاس مانچسٹر کے قرب وجوار میں درختوں کی چھال کا رنگ کافی ہلکا تھا۔اسی وجہ سے سیاہ رنگ کے پروانوں کو جو درختوں پر بیٹھتے تھے پرندے آسانی سے دیکھ لیتے اور انہیں اپنی خوراک بنا لیتے تھے۔ یوں ان پروانوں کے زندہ بچ جانے کا امکان بہت کم رہ جاتا تھا۔پچاس برس بعد فضائی آلودگی کے باعث درختوں کی چھال سیاہ ہوگئی اور اس مرتبہ ہلکے رنگ کے پروانے زیادہ شکار ہوئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہلکے رنگ کے پروانوں کی تعداد کم ہوگئی جبکہ سیاہ رنگ کے پروانے تعداد میں زیادہ ہوگئے۔ اسلئے کہ سیاہ رنگ کے پروانے اب آسانی سے پرندوں کو نظر نہیں آتے تھے۔ ارتقاء پسند حضرات اس مثال کو یوں پیش کرتے ہیں کہ پروانوں نے اپنا رنگ ماحول کے مطابق تبدیل کیا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ سیاہ رنگ کے پروانے صنعتی انقلاب سے قبل بہت بڑی تعداد میں موجود تھے۔ بس اس کے شکار کی وجہ سے انکی تعداد مکمل طور پر بڑھنے سے قاصر رہی۔جب حالات ان کیلئے موزوں ہوئے تو فطری انتخاب کے ذریعے سیاہ رنگ کے پروانے بڑھنے لگے اور ہلکے رنگ کے پروانے گھٹنے لگے۔ یہاں اس امکان کو بھی رد کرنا خلاف عقل ہوگا کہ ماحول کی تبدیلی کی وجہ سے بعض پروانوں نے رنگ تبدیل کیا ہوگا لیکن نوع نہیں۔ جس طرح مختلف خطوں میں بسنے والے انسان مختلف رنگوں کے ہوتے ہیں۔ لیکن ہیں سب کے سب انسان، کوئی دوسری نوع نہیں۔ اس طرح رنگ کی تبدیلی نوع کے اندر ممکن ہے لیکن پروانے کا ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہونا ناممکنات میں سے ہیں۔ اسی لئے پروانوں کی وہ نسل جو ماحول کے مطابق تھے اور کالے رنگ کے تھے بڑھتے گئے اور وہ نسل جو ماحول سے مطابقت نہیں رکھتے تھے اور ہلکے رنگ کے تھے، مٹتے گئے۔

یہی وہ چھوٹے چھوٹے پیچیدہ نکتے ہیں جسے بنیاد بنا کر ارتقاء پسند حضرات نظریہ ارتقاء کو حقیقت ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ عام آدمی کو فطری انتخاب کے جھانسے میں

ڈال کر پورے نظریے کی تائید کروائی جاتی ہے۔ فطری انتخاب سے عام آدمی انکار کر ہی نہیں سکتا جس کے نتیجے میں فطری انتخاب کے ذریعے پیش کئے جانے والے نتائج کے سامنے وہ مجبوراً سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ فطری انتخاب ایک فطری اَمر ہے لیکن اسکے نتیجے میں نئے جاندار کا وقوع پذیر ہونا خلاف عقل وخلاف ریکارڈ ہے۔ کائنات کی سب سے اشرف مخلوق انسان نے اگر خود کو فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق تیار نہیں کیا تو فطرت اس کی نسل کو مٹا دے گی اور یہی وہ قانون ہے کہ جو قوم حالات کے سانچوں میں مکمل طور پر نہیں ڈھل سکتی رہبری اور اقتدار اسکے ہاتھ سے چھین لی جاتی ہے۔

سر! یہ بار بار آپ فوسل ریکارڈز کی بات کرتے ہیں اس پر بھی ذرا روشنی ڈالیئے۔

آکاش نے ہلکے سے وقفے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سوال کیا۔

ڈاکٹر صاحب پانی کے گلاس سے ایک گھونٹ لینے کے بعد دوبارہ شروع ہو گئے۔

نظریہ ارتقاء کے مطابق ہر جاندار کسی پہلے جاندار کی تبدیلی سے وجود میں آیا ہے اور یہ تبدیلی اچانک نہیں ہوئی بلکہ رفتہ رفتہ ہوئی ہے۔ اس دوران بہت سے جاندار ناپید ہوئے ہیں جو کہ موجودہ زندہ جانداروں کی درمیانی کڑیاں تھیں۔ اس کی مثال کچھ یوں ہے۔ کہ اعداد میں ایک کے بعد دو آتا ہے۔ ایسا نہیں کہ ایک بعد فوراً دس آجائیں۔ اگر کہیں پر ایک کے بعد دس لکھا ہوا ملے تو دو سے نو تک تمام گم شدہ کڑیاں ہیں۔ جسکی تلاش فاسل ریکارڈز میں ڈھونڈنی پڑیگی۔ جانداروں میں ان گمشدہ کڑیوں کو جو دو جانداروں کے درمیان پُل کا کام کرتی ہیں عُبوری اشکال (Transitional forms) کہتے ہیں۔ ڈارون اپنی کتاب "جانداروں کی ابتداء بذریعہ فطری انتخاب "میں لکھتے ہیں۔ "اگر میرا نظریہ صحیح نکلا تو ثابت ہو جائیگا کہ وسطی عرصے کے لاتعداد قسمیں جو ایک ہی گروہ کے جانداروں کو ایک دوسرے کے بہت قریب لاتی ہیں، یقیناً وجود رکھتی تھیں۔ بعد ازاں انکی سابقہ موجودگی کا ثبوت صرف باقیات فاسل میں تلاش کیا جائیگا"۔ ڈارون کو یہ توقع تھی کہ ایسی عبوری اشکال

مستقبل میں فاسل ریکارڈز میں مل جائیگی جو گمشدہ کڑیوں کا کام کریگی اور جانداروں کو باہم ملا دے گی لیکن اس کے باوجُود اِن کی عدم موجودگی کا احساس بھی ڈارون کو ستا رہا تھا۔ اس لئے وُہ اس کتاب کے باب "نظریے کی مشکلات" میں لکھتے ہیں۔

"ایسا کیوں ہے کہ اگر کچھ جانداروں کا وجود دوسرے جانداروں کا مرہونِ منت ہے اور ایسا عمدہ مدارج ارتقاء سے ہوا ہے تو ہم ہر کہیں لا تعداد عبوری شکلیں کیوں نہیں دیکھتے؟ تمام فطرت جانداروں کی بجائے جیسا کہ ہم انہیں دیکھتے ہیں کہ انکی خوب تشریح ہوئی ہے، ایک ابتری اور پراگندگی کا شکار کیوں نہیں ہے؟ لیکن جیسا کہ اس نظریے کے ذریعے لا تعداد شکلوں میں موجود ہونا چاہیے تھا مگر ہم انہیں ان گنت تعداد میں زمین کی بالائی سطح کے اندر پاؤں گاڑے کیوں نہیں دیکھتے؟ لیکن درمیانی خطے میں، جس میں زندگی کی درمیانی حالتیں پائی جاتی ہیں، ہم درمیانی انواع کو ایک دوسرے میں پیوست کیوں نہیں پاتے؟ میں ایک طویل عرصے تک اس مشکل کا سامنا کرتا رہا"۔

یہ تو ہوا ڈارون کا احساس اور پیشنگوئی۔ اب ذرا اِن عبوری اشکال کی بات کرتے ہیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلا سوال یہ بنتا ہے کہ کیا ضروری ہے کہ اتنے سارے جاندار ناپید ہوئے ہونگے۔ اگر گمشدہ کڑیوں کا موازنہ کیا جائے تو یہ موجودہ جانداروں سے بھی اقسام اور تعداد میں زیادہ بنتے ہیں۔ لہٰذا ہونا چاہیئے کہ انکی تعداد کروڑوں میں نہیں بلکہ اربوں میں ہو۔۔ اسلئے سب سے پہلا اعتراض تو عقلی لحاظ سے یہ بنتا ہے کہ اتنی زیادہ تعداد میں اتنے زیادہ جاندار ناپید کیوں ہوئے؟ چلو موجودہ بحث کی خاطر اس اعتراض سے قطع نظر یہ بات مان لیتے ہیں کہ اتنے زیادہ جاندار ناپید ہوئے ہونگے۔ تو پھر یہ تو قطعی بات ہے کہ انکے باقیات فاسلز کی شکل میں دُنیا بھر میں پھیلی ہونی چاہیئے اور قدم قدم پر گمشدہ کڑیوں کی مثالیں ہونی چاہیئے۔ جبکہ فاسل ریکارڈز میں جو جاندار کھودنے سے سامنے آئیں ہیں۔ اُن میں عبوری اشکال کا کچھ اتہ پتہ نہیں بلکہ موجودہ زندہ جانداروں کے فاسلز ہیں۔ ایسے فاسلز کی مثالیں

موجود ہیں۔ جو کئی ملین سال پرانے ہیں لیکن آج بھی انکی اولاد اُن سے مختلف نہیں ہیں۔ جیسا کہ سٹار فش جو کہ 400 ملین سال پُرانے فاسل ریکارڈ میں سامنے آیا ہے۔ ٹڈا401 ملین سال، چیونٹی100 ملین سال، لال بیگ 320 ملین سال پُرانے فاسل ریکارڈز میں سامنے آئے ہیں۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ یہ جاندار عمل ارتقاء کے نتیجے میں وجود میں نہیں آئے۔ بلکہ بطور خاص تخلیق کئے گئے ہیں۔ اس بارے میں برطانوی ماہر حیاتیات ڈیرک ایگر(Derek Ager) ارتقاء پسند ہونے کے باوجود اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ "فاسل ریکارڈ ثابت کرتا ہے کہ زندگی کی عبوری اشکال کبھی موجود تھی ہی نہیں۔ ارتقاء سرے سے ناپید رہا اور زندگی اپنی تمام انواع میں علیحدہ علیحدہ اور کامل ترین صورتوں میں تخلیق کی گئی"۔

اب آتے ہیں ان فاسلز کی طرف جو سب سے پُرانے ہیں۔ سائنسدانوں نے زمین پر زندگی کی ابتداء کے بارے میں جو تخمینہ لگایا ہے وہ500 سے 550 ملین سال پُرانا کیمبری دُور ہے۔ اس دور سے پہلے زندگی کے کوئی آثار موجود نہیں تھے۔ اب مزے کی بات یہ ہے کہ اس دور سے تعلق رکھنے والے بحری جانداروں کے فاسلز سائنسدانوں کے ہاتھ لگ گئے ہیں جنہیں سہ لختہ دار بحری جاندار(Trilobites) کہا جاتا ہیں۔ کیمبری دور میں موجود اس بحری جاندار کا پیچیدہ نظام اور شکل اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ یہ کوئی ارتقائی عمل سے ہوتے ہوئے نہیں گزرا بلکہ تخلیق کیا گیا ہے۔ اور اس پیچیدگی پر مستزاد یہ کہ اس کی انکھیں، گلپھڑوں اور دوران خون کا نظام اور اسکے ترقی یافتہ عضویاتی ڈھانچے ان کی جدید مماثل شکلوں سے مختلف نہیں ہیں۔ انکی پیچیدہ آنکھ شہد کے چھتے جیسی ہے جس کی مثال آج بھی شہد کی مکھی اور کابلی مکھی میں ملتی ہے اور اس میں کوئی تبدیلی بھی نہیں آئی۔ یہ صورتحال ارتقاء کے اس مفروضے کو رد کرتی ہے کہ جاندار چیزیں ارتقائی عمل کے ذریعے قدیم سے ترقی کرتے کرتے موجودہ مکمل شکلوں تک پہنچی ہیں۔ اِن پیچیدہ بے ریڑھ جانداروں کا نہ کوئی

عبوری شکل ہے اور نہ ہی یک خلوی بیکٹیریا کے ساتھ کوئی سلسلۂ ربط۔ یہ سہ لختہ دار بحری جاندار اتنی بڑی تعداد میں اچانک کیسے نمودار ہوگئے۔ یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب آج تک ارتقاء پسند نہ دے سکے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کا ماہر علم حیوانات اور نظریہ ارتقاء کی موجودہ دور میں سب سے بڑی آواز رچرڈ ڈاکنز(Richard Dawkins) اس حقیقت پر کچھ یوں تبصرہ کرتے ہیں۔

"چٹانوں کا کیمبری طبقہ جو 600 ملین سال قبل کے عہد سے تعلق رکھتا ہے اس کی چٹانیں سب سے قدیم ہیں جن میں ہمیں بے ریڑھ جانوروں کے بڑے گروہ ملتے ہیں۔ ہم انکے پہلی بار نمودار ہونے پر ان میں سے بہت سے جانوروں کو پہلے ہی ارتقاء کی ترقی یافتہ شکل میں پاتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ابھی ابھی وہاں پیوست ہوئے ہیں اور انکی کوئی ارتقائی تاریخ نہیں ہے"

گفتگو آگے جاری رکھتے ہیں یا اکتاہٹ طاری ہونے لگی۔

ڈاکٹر صاحب نے مُسکرا کر چاروں دوستوں کی آنکھوں میں جھانک کر سوال کیا کیونکہ سب انگشت بدنداں بنے بیٹھے تھے اور حیرت سے لرزاں نظروں میں ڈاکٹر صاحب کی گفتگو کے ہر ایک لفظ کے پیچھے عقل کے گھوڑے دوڑا رہے تھے۔ خاموش ترین عُویم لفظوں کے معنی اور مفہوم کے پیچھے دیوانہ وار لپکتا جارہا تھا۔

نہیں، نہیں، سر۔۔۔ جاری رکھیں پلیز۔

سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

ڈاکٹر صاحب نے "ٹھیک ہے" کے ساتھ گفتگو دوبارہ شروع کی۔

ارتقاء پسندوں کا خیال ہے کہ یہی کیمبرائی دور میں پائے جانے والا سہ لختہ دار بحری جاندار آگے ارتقاء کرتے کرتے مچھلی کی شکل اختیار کرگیا جس میں اس نے ارتقاء کے بہت سے مراحل طے کئے ہونگے اور بہت سے عبوری شکلیں بنی ہو گی لیکن ارتقاء پسندوں کی

شومئ قسمت کہ ابھی تک ان بے ریڑھ جانداروں اور مچھلیوں کے لاکھوں فاسلز مل چکے ہیں لیکن کوئی ایک بھی فاسل ایسا دریافت نہ ہوسکا جسے ان دونوں کی درمیانی کڑی تصور کی جاسکے۔

یہ ارتقائی منظر نامہ آگے بڑھ کر ایک اور داستان پیش کرتی ہے کہ مچھلیاں آگے بڑھ کر ارتقائی عمل کے ذریعے جل تھلیوں (رینگنے والے جانور مثلاً مگرمچھ، سانپ وغیرہ) میں تبدیل ہوگئے۔ یہی وہ مرحلہ تھاجب زندگی پانی سے نکل کر خشکی پر آگئی۔ کہانی کے اس موڑ پر بھی عبوری اشکال کا ہوناضروری سمجھا گیا کہ اتنی بڑی تبدیلی کیلئے گمشدہ کڑیاں ضرور ہونی چاہیئے۔عقل کا تقاضہ بھی یہی ہے۔ لہٰذا ارتقاء پسند محققین نے سی لاکینتھ (Coelacanth) مچھلی کو عبوری شکل کے طور پر تصور کرکے پیش کیا۔ یہ 410 ملین سال پُرانی ناپید مچھلی تھی جس کے فاسلز سے اندازہ لگایا گیا کہ یہی وہ عبوری شکل تھی جو پانی سے خشکی کی طرف منتقلی کی نمائندگی کرتی ہے۔ تاہم قدرت کا کرنا ایساہوا کہ 22دسمبر 1938ء کو بحیرۂ ہند میں ایک بے حد دلچسپ تحقیق ہوئی۔ نایاب مچھلیوں کے خاندان کی ایک زندہ مچھلی پکڑی گئی۔ یہ وہی مچھلی تھی جیسے ماضی میں عبوری شکل کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ اسکا تعلق مچھلی کے خاندان سے ہونے کی وجہ سے ارتقاء پسند ماہر قدیم حیاتیات جے ایل بی سِتمھ (J.L.B Smith) نے کہا۔ کہ "وہ اگر کسی زندہ ڈائنوسار کو دیکھ لیتا تو اسے اس قدر حیرت نہ ہوتی جس قدر اس موقع پر ہوئی تھی"۔ آنے والے برسوں میں یہ مچھلیاں کئی بار دُنیا کے مختلف حصوں میں پکڑی گئی۔ پس ارتقاء پسندوں کا یہ دعوی بھی باطل ٹھہرا کہ وہ ناپید مچھلی جسے وہ چھپکلی کی شکل کے ایک ایسے جاندار کے طور پر متعارف کرارہے تھے جو سمندر سے خشکی پر آگیا تھا، وہ تحقیق میں چھپکلی نما ہونے کی بجائے خالص مچھلی ہی ثابت ہوئی جو سمندر کی تہہ میں رہتی تھی اور 180 میٹر سے کم سطح کے اندر تک کبھی نہیں آئی تھی۔

جل تھلیوں کے بعد ارتقاء پسند فرماتے ہیں کہ یہ ارتقائی عمل سے گزر کر چھپکلی نما جانوروں میں تبدیل ہوگئے۔ لیکن یہاں بھی عبوری اشکال کا کوئی ثبوت موجود نہیں۔ اس ضمن میں قدیم حیاتیات پر اتھارٹی ماناجانے والا رابرٹ ایل کیرل (Robert.L.Carroll) لکھتے ہیں کہ "ابتدائی دور کے چھپکلی نما جاندار جل تھلیوں سے بہت مختلف تھے۔ اور انکے آباؤ واجداد کا اب تک پتہ نہیں چل سکا"۔

مزے کی بات تو اب آتی ہے جب ارتقاء پسند حضرات اِن چھپکلی نما جانداروں کو پَر لگا کر اُڑانا شروع کر دیتے ہیں کہ ان کی ارتقائی عمل سے یہ پرندے بن گئے۔ یہ اتنی بڑی تبدیلی ہے جتنی تری اور خشکی کے جانداروں کے درمیان پائی جاتی ہے۔ اس خلاء کو اور اتنے بڑے فرق کو پُر کرنے کیلئے ہزاروں عبوری شکلیں تو کیا لاکھوں بھی کم پڑ جائینگے کیونکہ پرندوں کی خاصیتیں یکسر مختلف ہیں۔ یہ بالکل ہی عام فہم اور معمولی سُوجھ بُوجھ کا معاملہ ہے۔ پرندوں کی سب سے استثنائی خاصیت پَر (Feathers) ہے۔ یہ ارتقاء پسندوں کیلئے ایک بہت پیچیدہ مسئلہ رہا ہے۔ اسکے ساتھ ساتھ پرندوں کی ہڈیاں خشکی پر رہنے والے جانداروں کی نسبت ہلکی ہوتی ہیں اور کھوکھلی ہوتی ہیں۔ ان کے پھیپھڑے مختلف طریقے سے کام کرتے ہیں۔ ان کا باقی نظام بھی الگ ہوتا ہے۔ لہذا اتنی بڑی تبدیلیوں نے ارتقاء پسندوں کو الجھاؤ کا شکار کئے رکھا۔ اس الجھاؤ کو قابو کرنے کیلئے انہوں نے آرکیوپ ٹیریکس (Archaeopteryx) کے فاسلز کو عبوری شکل میں پیش کیا جس کی عمر 150 ملین برس ہے۔ لیکن 1992ء میں ملنے والی ساتویں آرکیوپ ٹیریکس کے فاسلز کے مطالعے نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ کوئی عبوری شکل نہیں تھی بلکہ پرندہ ہی تھا۔ لہذا یہاں بھی ارتقاء پسندوں کا دعویٰ باطل ٹھہرا۔

اس طرح ایک اور فاسل ریکارڈ نے ارتقاء پسندوں کے اِس نظریے کی قلعی کھول دی۔ 1995ء میں ایک چینی ادارے نے ایک اور پرندے کنفیوشیوسارنس کے فاسلز

دریافت کئے جسکی شکل و صورت اور ساخت آج کے جدید پرندوں سے مماثل تھی۔ یہ پرندہ آرکیوپ ٹیریکس کا ہم عصر تھا یعنی 150 ملین سال پُرانا۔۔ اس دریافت سے وہ مفروضہ ہر لحاظ سے غلط ثابت ہوا کہ آرکیوپ ٹیریکس جل تھلیوں اور پرندوں کی درمیانی کڑی ہونے کے ناطے پرندوں کا جدامجد تھا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ فاسلز کے دریافت کے مطابق اُسی ہی دور میں کنفیوشیوسارنس جیسے پرندے موجود تھے۔ آرکیوپ ٹیریکس بھی بذات خود ایک پرندہ تھا نہ کہ درمیانی شکل۔

اسکے بعد باری آتی ہے کیڑے مکوڑوں اور مکھیوں کی جن کی ڈیزائن انتہائی نازک، لطیف اور خوبصورت ہے۔ اس ضمن میں بھی کوئی فاسل ریکارڈ دریافت نہ ہوسکا جو مکھیوں کے تصوراتی ارتقاء کا ثبوت پیش کرسکے۔ اسی کا ذکر ممتاز فرانسیسی ماہر حیوانیات گریس (Grasse) نے یوں کیا ہے۔ "کیڑے مکوڑوں کی ابتداء کے بارے میں ہم ابھی تک اندھیرے میں ہیں"۔

اب ذرا ممالیہ جانوروں (Mammals) کا ذکر چھیڑتے ہیں۔ انکے بارے میں نظریہ ارتقاء کا موقف ہے کہ چھپکلی نما جاندار پرندوں کے ساتھ ساتھ ممالیہ کے بھی آباواجداد ہیں۔ اس کہانی میں بھی عبوری اشکال ابھی تک پردہ اخفاء میں ہیں۔ ایسا کچھ نہ مل سکا جو چھپکلی نما جانداروں اور ممالیہ کی درمیانی کڑی ہوکر انکو باہم ملاسکے۔ چھپکلی نما جانوروں اور ممالیہ کے ساختیاتی مطالعے سے پتہ چلتاہے کہ انکے ساخت کے درمیان بہت بڑا خلاء موجود ہے جو اس قیاس کی نفی کرنے کیلئے کافی ہے کہ ممالیہ چھپکلی نما جانوروں کی ارتقائی شکل ہیں۔ ارتقاءپسندوں میں سے ایک شخص جو بڑا معتبر سمجھا جاتا ہے اور نظریہ نو ڈارونیت (New Darwinism) کے بانیوں میں سے تھا۔ اسکا نام جارج سمپسن (George Simpson) تھا۔ وہ اس حقیقت پر یوں تبصرہ کرتاہے جس سے ارتقاء پسند حیران و پریشان ہوجاتے ہیں۔ "اس زمین پر تاریخ حیات کا سب سے زیادہ پریشان کردینے

والا واقع میان حیاتی عہد چھپکلی نما جانور کا وہ عہد ہے جو ممالیہ جانوروں کے عہد میں تبدیل ہو گیا۔ ایسا لگتا ہے جیسے سٹیج ڈرامے کے وقت اچانک پردہ گرا دیا گیا ہو۔ جہاں اب تک تمام بڑے کردار چھپکلی نما جانوروں نے سنبھال لئے ہو بالخصوص ڈائنوسار نے، جو ایک بڑی تعداد میں اور حیران کن تنوع کے ساتھ موجود ہو اور وہ فوراً دوبارہ اُٹھ کھڑے ہوئے ہوں تاکہ اسی پُرانی ترتیب کو دکھا سکیں مگر اس مرتبہ ڈرامے کے سارے کردار مختلف ہو۔ ایسے کردار جن میں ڈائنوسار بالکل سٹیج پر نہ آئیں ، اور دوسرے چھپکلی نما جانور بھی خاموش اداکار ہو جائیں۔ اور تمام بڑے کردار اس قسم کے ممالیہ جانور ادا کر رہے ہو جنکا ڈرامے کے اس سے پہلے کے باب (ایکٹ) میں سرسری سا تذکرہ ہوا تھا"۔

ان گمشدہ عبوری اشکال کی عدم دستیابی کے علاوہ ممالیہ جانوروں کا آپس میں بھی ساخت و شکل کے لحاظ سے نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ یہ بھی ایک الگ داستان کی نشاندہی کرتا ہے۔ جیسا کہ چمگادڑیں، گھوڑے، وہیل اور چُوہے وغیرہ۔ گھوڑے کے بارے میں ارتقاء پسندوں کا اپنا ہی بیان کردہ ارتقائی منظرنامے کے غلط ہونے کا اعتراف فاسل ریکارڈز کی وجہ سے منظر عام پر آ چکا ہے۔

اب اگر میری باتیں بوجھ نہیں بن رہی تو کائنات کی سب سے افضل مخلوق حضرت انسان کے بارے میں ارتقاء پسندوں کی تخیّلاتی پرواز کا معائنہ کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے چاروں دوستوں کے وقت اور ذہنی وسعت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سوال کیا۔

سر! جام پلانا ہے تو پورا کا پورا پلا دیجئے۔ آدھی ہوش اور آدھی جوش سے بگڑنے کا خدشہ ہے۔ ایسی علمی و ادبی محفل سے ہمارا روز روز کا واسطہ کہاں پڑتا ہے۔ اسکے لئے تو بچوں جیسی ضِد بھی کرتے ہیں کیونکہ اسے اپنا حق جو مانتے ہیں۔

تا گردش فلک ہو، یُونہی صبح و شام ہو
ساقی کی چشم مست ہو اور دور جام ہو

عُویم جو بالکل خاموش بیٹھا تھا اچانک گویا ہوا اور اپنی دلچسپی ظاہر کر دی۔

واہ! بہت خوب، ٹھیک ہے۔ جاری رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے دوبارہ گفتگو کا آغاز کیا۔

سب سے پہلے آپ کے سامنے وہ تخیلاتی شجرہ رکھتا ہوں جو ارتقاء پسندوں کے فرضی خیالات کے مطابق انسان کے آباواجداد پر مشتمل ہے۔ اس کے مطابق انسان بوزنے (بندر) سے ترقی کرتے کرتے انسان بنا ہے۔ یہ بھی ایک الگ کہانی ہے کہ یہ بندر کہاں سے ارتقاء کر کے وجود پذیر ہوا کیونکہ کڑیاں گم ہی گم ہیں۔ انسان کا یہ ارتقائی منظر نامہ صرف اِن بندروں کے ساتھ مشابہت کی بنیاد پر بنایا گیا ہے۔ اِن مشابہات کا ہم آگے جائزہ لیں گے کہ یہ حقیقی ہیں یا جعلی لیکن ابھی وہ ترتیب پیش کئے دیتا ہوں جسے ارتقاء پسند شجرۂ انسان مانتے ہیں۔

سب سے پہلے باری آتی ہے آرڈی پیتھی کَس (Ardipithecus) کی جو کہ تقریباً 5.8 ملین سال پہلے سے لیکر 4.4 ملین سال پہلے تک زندہ رہے۔

دوسرا نمبر آتا ہے آسٹرالوپیتھی کَس (Australopithecus) کی جو کہ 4.2 ملین پہلے سے لیکر 1.98 ملین سال تک خطہ زمین پر موجود رہے۔ یہ جنوب افریقی بوزنے ہیں۔ ارتقاء پسند آسٹرالوپیتھی کَس کو انسان اور بوزنوں کے مشترک نام نہاد آباواجداد مانتے ہیں۔ اِن کے مطابق آسٹرالوپیتھی کَس سے ارتقاء کر کے انسان کی درجہ بندی شروع ہو جاتی ہے۔ جس کو یہ لوگ ہومو (Homo) کے خانے میں رکھتے ہیں۔ ہومو تقریباً 2.8 ملین سال پہلے وجود پذیر ہوا۔ اس سے پہلے اسکا کوئی وجود نہیں تھا۔ ویسے تو ہومو کی کئی شکلیں بتائی جاتی

ہیں لیکن بنیادی طور پر یہ چار ہیں۔ باقی چند اشکال جو ہیں وہ انہی چار سے مشابہت اور ہلکے سے اختلاف کے ساتھ وجود رکھتے ہیں۔

ہومو میں سب سے پہلے باری آتی ہے ہوموہیبیلس(Homo Habilis) کی جو کہ 2.4 ملین سال پہلے سے لیکر 1.4 ملین سال پہلے تک موجود رہا۔

اسکے بعد ہے ہوموایریکٹس(Homo Erectus) جو کہ 1.89 ملین سال پہلے سے لیکر 110000 سال پہلے تک زندگی بسر کرتا رہا۔

پھر آتا ہے ہومو نینڈرتھلینسز (Homo Neanderthalensis) جو کہ چار لاکھ سال پہلے سے لیکر 40 ہزار سال پہلے تک خطہ زمین میں پایا گیا۔

آخری باری ہومو سیپیئنز(Homo Sapiens) کی آتی ہے جسے آج کا انسان کہا جاتا ہے۔ یہ سب سے ترقی یافتہ شکل ہے جو کہ 30 ہزار سال پہلے سے آج تک موجود ہے۔

تو جناب یہ ہوا ارتقاء پسندوں کا بنایا ہوا تخیلاتی شجرہ انسان اور تخمینہ عمر۔ اب اِن میں سے ہر ایک پر الگ الگ گفتگو کرتے ہیں۔

آرڈی پیتھی کَس پر تو کسی گفتگو کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ سب اس پر متفق ہیں کہ یہ بوزنے(بندر) ہی تھے۔

آسٹرالوپیتھی کس کے بارے میں چند ارتقاء پسند یہ خیال کرتے ہیں کہ جسم کی طبیعیاتی ساخت کی رو سے یہ بوزنوں جیسے ہی تھے لیکن چلنے کا انداز مختلف تھا اور انسانوں کی طرح سیدھا کھڑے ہو کر چلتے تھے۔ یہ سیدھا کھڑے ہونے کا دعویٰ کئی دہائیوں تک رچرڈ لیکے (Richard Leakey) اور ڈونلڈ جانسن (Donald Johnson) جیسے ماہرین حیاتیات کی طرف سے پیش کیا جاتا رہا۔ مگر بعد کے بہت سے سائنسدانوں نے اسکی کھوپڑی پر تحقیق کی اور اس دلیل کو باطل ثابت کیا۔ اِن سائنسدانوں میں لارڈ ذکر مین (Lord Zuckerman) اور پروفیسر چارلس(Prof Charles) سر فہرست ہیں۔ انہوں نے

پندرہ برس اِن فاسلز پر تحقیق کیں۔ اس تحقیق میں برطانوی حکومت کا تعاون بھی حاصل رہا۔ اس تحقیق میں وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ آسٹرالوپیتھی کس عام نوع کے بوزنے تھے۔ اور یقیناً چارپائے تھے۔ انکی نقل و حرکت آج کے دور کے بوزنوں جیسے ہی تھی۔

اس طرح برطانیہ کی لیورپول یونیورسٹی کی تحقیق کا نتیجہ بھی یہی ہے کہ آسٹرالوپیتھی کس چارپایہ جاندار تھے۔ مختصراً یہ کہ اس جاندار کا انسان کے ساتھ کوئی رشتہ و تعلق نہیں بنتا۔

اب باری آتی ہے ہوموہیبیلس کی۔ اس تمام سلسلے میں متنازعہ جاندار یہی ہے کیونکہ ارتقاء پسندوں میں سے بعض اسے انسانوں اور بوزنوں کی درمیانی کڑی سمجھتا ہے۔ یہ درجہ بندی 1960ء سے 1964ء تک لیکے (Leakey) اور اسکی ٹیم کو ملنے والے فاسلز کی بنیاد پر لیکے نے کی۔ اور اسکی بڑی وجہ یہ پیش کی کہ اسکی کھوپڑی نسبتاً آسٹرالوپیتھی کس سے بڑی ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اِن محققین کو جو پہلا فاسل 1960ء میں ملا تھا وہ صرف نچلا جبڑا تھا۔ جسکو بنیاد بنا کر انہوں نے اسکے کھوپڑی کا تخمینہ لگایا کہ یہ آسٹرالوپیتھی کس سے بڑی ہوگی اور تقریباً 674 مکعب سینٹی میٹر ہوگی۔ یہاں یہ اضافی بات بتانا ضروری ہے کہ انسان کی کھوپڑی کا سائز اوسطاً 1350 سے 1400 مکعب سینٹی میٹر کا ہوتا ہے۔ اور آسٹرالوپیتھی کس کی کھوپڑی کا سائز 380 مکعب سینٹی میٹر سے 530 مکعب سینٹی میٹر ہوتا ہے۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ بعد میں ملنے والے چند فاسلز کے کھوپڑیوں کے سائزز آسٹرالوپیتھی کس سے بڑے تھے لیکن کیا ہلکے سے اس سائز میں فرق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کیا وہ بوزنے نہیں تھے۔ کیا بوزنوں کی صرف ایک ہی قسم ہے۔ تاریخ میں بوزنوں کی 6000 سے زائد انواع زندہ رہی ہیں۔ جس میں 120 آج بھی کرۂ ارض پر موجود ہیں۔ انسانوں کی ایک ہی نوع میں چھوٹے اور بڑے کھوپڑیوں کے لوگ موجود ہیں، تو بوزنوں کے اتنے زیادہ انواع میں چھوٹے اور بڑے کھوپڑیوں والے بوزنے کیوں نہیں

ہونگے۔ خیر تحقیق آگے بڑھی اور 1980ء میں نئے فاسلز مل گئے جس پر محققین برنارڈ ووڈ(Bernard Wood)اور لورنگ بریس(Loring Brace)نے تحقیقات کیں اور یہ ثابت کیا کہ ہومو ہیبیلس آسٹرالو پیتھی کس سے مختلف نہیں تھا۔ اِن فاسلز کی بنیاد پر ان محققین نے ہومو ہیبیلس کو آسٹرالو پیتھی کس ہیبیلس کا نام دیا جسکا مطلب تھا ہُنر مند جنوبی بوزنے۔

اِسی طرح ایک اور محقق ٹم وائٹ(Tim White)کو ملنے والے فاسلز پر ہونے والی تحقیق یہ بتاتی ہے کہ یہ نوع کھوپڑی کا چھوٹا حجم رکھتی تھی اور اسکے لمبے بازو اور چھوٹی ٹانگیں تھیں جن کی مدد سے یہ درختوں پر چڑھنے میں جدید بوزنوں کی مانند آسانی محسوس کرتے تھے۔

ایک اور امریکی ماہر بشریات ہولی سمتھ(Holy Smith)نے 1994ء میں یہ دلیل پیش کی کہ ہومو ہیبیلس ہومو نہیں تھا، بلکہ بوزنہ تھا۔ یہی بات اس سے پہلے فاسلز کی بنیاد پر برنارڈ ووڈ اور لورنگ بریس کہہ چکے تھے۔

تین اور ماہرین علم التشریح الاعضاء (Anatomy)فریڈ سپور(Fred Spoor) برنارڈ ووڈ(Bernard Wood)اور فرانز زون ویلڈ(Frans Zonneveld)نے انسانوں اور بوزنوں کے کانوں پر الگ الگ طریقوں سے تحقیق کی۔ یہ تحقیق تقابلی جائزوں پر مشتمل تھی۔ جس میں انسانوں اور بوزنوں کے کانوں کے اندر اُن رگوں کا جائزہ لیا گیا جو توازن برقرار رکھنے میں مدد دیتی ہے۔ ان جائزوں کا آپس میں موازنہ کیا گیا۔ اس تحقیق سے یہ ثابت ہوا کہ ہومو ہیبیلس اور آسٹرالو پیتھی کس کی کان کی رگیں بالکل ویسی تھیں جیسے جدید بوزنوں کی ہیں اور یہ انسانوں اور ہومو ایریکٹس کے کان کی رگوں سے یکسر مختلف تھیں۔

اِن بیان شدہ تحقیقات سے یہ منطقی نتیجہ آسانی سے نکالا جاسکتا ہے کہ ہومو ہیبیلس کا ہومو گروپ سے دور دور کا کوئی واسطہ نہیں بلکہ یہ بوزنوں ہی کی ایک قسم تھی۔

اب باری آتی ہے ہوموایریکٹس کی۔

ہوموایریکٹس سیدھے کھڑے ہو کر چلنے والے انسان تھے۔ اِن کے تمام دستیاب فاسلز اس خاصیت کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ یہ خاصیت ہومو ہیبیلس اور آسٹرالوپیتھی کس میں موجود نہ تھی۔ ہوموایریکٹس کا مطلب بھی یہی ہے "ایک سیدھا کھڑا ہو کر چلنے والا انسان"۔ سیدھا کھڑا ہو کر چلنا تمام جانداروں میں صرف انسانوں کی استثنائی خاصیت ہے۔اور کوئی جاندار مکمل طور پر سیدھا کھڑا ہو کر نہیں چل سکتا۔ بوزنے صرف ہلکے سے سیدھے کھڑے ہو کر چھلانگیں لگا کر چلتے ہیں۔

ارتقاء پسند ہوموایریکٹس کو عام انسان اسلئے نہیں گردانتے کہ انکی کھوپڑی عام انسانوں سے چھوٹی ہوتی ہے جو کہ 900 مکعب سینٹی میٹر سے 1100 مکعب سینٹی میٹر تک ہے اور اسکے ساتھ انکی بھنویں گھنی اور اُبھری ہوئی ہیں۔ یہ دونوں خاصیتیں انسان کو انسانیت کے خانے سے نکالنے کیلئے ناکافی ہیں۔ کیونکہ کھوپڑی کا تھوڑا سا فرق اتنے وسیع پیانے پر پائے جانے والے انسانوں میں کوئی بڑی بات نہیں۔ آج بھی موجودہ دور میں بونوں (dwarf) کی کھوپڑیوں کا حجم عام انسانوں سے کم ہوتا ہے تو کیا وہ انسان نہیں ہے؟ اس طرح اسٹریلیا کے قدیم باشندوں کی بھنویں آج بھی اُبھری ہوئی اور گھنی ہیں۔ یہ روزمرہ کے مشاہدے ہماری آنکھوں کے سامنے روزانہ عیاں ہوتے رہتے ہیں۔ اس دور کا نامور ارتقاء پسند محقق لیکے (Leakey) بھی ہوموایریکٹس اور جدید انسان میں اِس فرق کو صرف نسلی عدم اتفاق کا فرق سمجھتا ہے۔ آگے کہتا ہے کہ ایسا فرق تو جدید انسانوں میں بھی علیحدہ علیحدہ جغرافیائی نسلوں میں نمایاں نظر آتا ہے۔ یونیورسٹی آف کنیکٹیکٹ (University of connecticut) کے پروفیسر ولیم لافلن (William Laughlin) نے آج کے انسانوں

کی تشریح الاعضاء(Anatomy) پر وسیع تجربات کئے اور اس نتیجے پر پہنچا کہ جدید انسانوں اور ہوموایریکٹس میں کوئی فرق نہیں۔

14 مارچ 1998ء کو نیو سائنٹسٹ(New Scientist) جرنل(Journal) میں یہ خبر چھپی کہ "ابتدائی زمانے کے انسان ہمارے اندازے سے کہیں زیادہ چاق و چوبند تھے"۔ ارتقاء پسندوں نے بتایا کہ یہ لوگ سات لاکھ سال قبل جہاز رانی کے کے پیشے سے وابستہ تھے۔ لہذا انہیں بمشکل "قدیم" کہا جا سکتا ہے۔

اِن سب تحقیقات کے ساتھ ساتھ ایک اور خاصیت جو ہوموایریکٹس کو بوزنوں سے ممتاز کرتی ہے وہ انکے لمبے پاؤں اور مقابلتاً چھوٹے ہاتھ ہیں جیسا کہ انسانوں کے ہیں جبکہ بوزنوں میں یہ خاصیت اُلٹ ہے۔

لہٰذا ہم بآسانی فاسل ریکارڈز اور اِن پر کی جانے والی تحقیقات کی بنیاد پر کہہ سکتے ہیں کہ ہوموایریکٹس عام انسانوں جیسا انسان تھا اور ہوموہی تھا۔ بوزنوں کے ساتھ اسکا کوئی تعلق نہیں تھا۔

اب گفتگو کارخ اگلی قسم یعنی ہومو نینڈر تھیلینسز کی طرف موڑتے ہیں۔ اس پر آج تقریباً سب کو اتفاق ہے کہ نینڈر تھل ایک انسانی نسل تھا جو یا تو غائب ہو گیا یا دوسری اقوام میں گھل مل گیا۔ اس موضوع پر میکسیکو یونیورسٹی کا ایک ماہر قدیم حیاتیات ایریک ٹرینکاس (Eriktrinkaus) لکھتا ہے۔

"نینڈر تھل کے پنجر کی باقیات کا جدید انسانوں کے پنجر کے باقیات کے ساتھ جزئیات کی حد تک جا کر موازنہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ نینڈر تھل میں تشریح الاعضاء کے حوالے سے کچھ بھی نہیں ہے جو یہ نتیجہ ظاہر کر دیں کہ حرکت پذیری، سلیقہ مندی اور ذہانت یا لسانی صلاحیتوں کی بنیاد پر وہ جدید انسانوں کی ان صلاحیتوں سے مقابلے میں کمتر ہو"۔

مزے کی بات یہ ہے کہ نینڈر تھل کی کھوپڑی کا حجم عام انسانوں سے بھی بڑا ہے جو کہ 1200 سے 1750 مکعب سینٹی میٹر تک ہے۔ اگر آپ کو یاد ہو تو اسی کھوپڑی کے چھوٹے ہونے کو بنیاد بنا کر ہومو ایریکٹس کو عام انسانوں سے ارتقاء پسندوں نے جدا کیا ہوا تھا۔ لہٰذا یہ اس بات کی ثبوت کے لئے کافی ہے کہ صرف اور صرف کھوپڑیوں کے حجم میں اتنے چھوٹے فرق کی بنیاد پر انسانوں کو مختلف خانوں میں بکھیرنا خلافِ عقل ہے۔ ہاں، انسانوں ہی میں مختلف نسلیں ہو سکتی ہیں اور ہیں بھی کیونکہ اتنے لاکھوں سالوں میں اتنی بڑی دنیا میں اتنی زیادہ جغرافیائی اور موسمی تبدیلیوں کے ساتھ کھوپڑی کا یہ فرق نمایاں ہونا کوئی بعید از عقل نہیں۔ بلکہ اب تو سائنسی اندازے ہیں کہ آنے والے وقتوں میں انسان کی کھوپڑی کا سائز کم ہو سکتا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو خدا نہ کرے ارتقاء پسند یا تو ہماری اس نسل کو انسانیت کے زُمرے سے اتار پھینکیں گے یا آنے والی نسل کو۔

آخری باری ہے ہومو سیپئنز کی۔ یہ موجودہ دور کے انسان ہیں اور اسی طرح ہی کے انسان ہیں جیسا کہ قدیم دور کے انسان تھے۔

اس سارے تقسیم اور درجہ بندی میں آپ حضرات پر قطعی طور پر عیاں ہوا ہو گا کہ ارتقاء پسندوں نے خوامخواہ خیالات و قیاسیات کے بنیاد پر اتنی زیادہ درجہ بندیاں کیں ہیں حالانکہ دو الگ قسم کے انواع کے لیے دو ہی درجہ بندیاں کافی ہیں۔ ایک بندر اور دوسرا انسان، جو کہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ پھر آگے چل کر ان دونوں انواع کی اپنے اپنے ذات پات ہو سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ اس بات کی وضاحت بھی کرتا چلوں کہ یہ ساری قیاس آرائیاں کھینچ تھان کر چند فاسلز کی بنیاد پر کی گئیں ہیں۔ کیا لاکھوں کروڑوں بلکہ اربوں انسانوں اور بندروں کی مختلف گروپوں میں درجہ بندی کے لیے دو، چار یا دس، بیس فاسلز کافی ہیں؟ کیا کروڑوں، اربوں پر استنباط (Infer) کے لیے دس، بیس کا سامپل (Sample) کافی ہوتا ہے؟ علمِ شماریات (Statistics) کیا کہتا ہے؟۔۔۔۔۔ ہر گز نہیں۔۔۔

سَر! یہ تقسیم تو پورے وضاحت کے ساتھ آپ نے بیان کی لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیااپ ارتقاء کو بالکل مانتے ہی نہیں؟

کیف جو ڈاکٹر صاحب کے سائنسی انکشافات کے سحر میں مبتلا ہو چکا تھا نے معصومانہ سوال کیا۔

سوال پر ڈاکٹر صاحب نے مسکرا کر توجہ دی۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں ارتقاء کو نہ مانوں۔ ارتقاء تو ایک حقیقت ہے بلکہ ہر آئے دن ہماری نظروں کے سامنے رونما ہوتی رہتی ہے۔ میں پوری طرح ارتقاء کا قائل ہوں لیکن اس سے نوع (Specie) میں تبدیلی آئے اس کے خلاف ہوں۔ یعنی میں ارتقاء کو 100 فیصد مانتا ہوں لیکن ڈارون کے نظریہ ارتقاء کو حقائق ہی کی بنیاد پر نہیں مانتا۔ ارتقائی تبدیلی نوع کے اندر ہوتی رہتی ہے یہ نوع کی تبدیلی کا باعث ہر گز نہیں بنتی اور یہی میں نے فاسل ریکارڈز کی گفتگو میں ثابت کیا ہے۔ نوع کے اندر کی تبدیلی کا مشاہدہ کس نے نہیں کیا ہو گا؟ سب جانتے ہیں کہ ایسی تبدیلی موجود ہے۔ آج سے پہلے کے انسان لمبے، چوڑے اور چیٹے ہوا کرتے تھے جبکہ آج کی نسل انسانی مقابلتاً کم لمبے چوڑے اور چیٹے ہیں۔ یہ ارتقائی تبدیلی نہیں تو اور کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود انسان وہی انسان ہے۔ یہ انسان تھا، انسان ہے اور انسان ہی رہے گا اور اسی نسل سے رشتہ ہے جو حضرت آدمؑ اور بی بی حواؑ سے پروان چڑھی ہے۔ ارتقاء پسندوں کا سب سے بڑا فریب اور مغالطہ یہی ہے کہ اسی نوع کے اندر کی تبدیلی کو بنیاد بنا کر تمام مخلوقات پر چسپاں کر دیتے ہیں جو کہ غیر علمی و عقلی و تاریخی رویّہ ہے۔

دو تین اور دلچسپ فاسل ریکارڈز رہ گئے ہیں جنہیں آپ تک پہنچانا ضروری ہے تاکہ ارتقائی نظریے کی حقیقت اور ان کے مغالطے آپ پر پوری طرح کھل سکیں لیکن اس سے پہلے محفل سے اکتاہٹ بھگانے اور آپ حضرات کی بذلہ سنجی کی خاطر ارتقاء پسندوں کے ایک

دو لطیفے سناتا ہوں یہ کہانیاں ہیں تو حقیقت لیکن ایک ذی شعور بندے کے لئے لطیفوں سے کم نہیں۔

ہوا یوں کہ 1922ء میں امریکی میوزیم آف نیچرل ہسٹری کے منیجر ہنری فیئر اوسبارن (Henry Fair Osbarn) نے اعلان کیا ہے کہ اسے ممالیہ جانور کا ایک دانت ملا ہے اوراس میں انسان اور بوزنے کی مشترک صفات پائی جاتی ہیں اس پر بڑے بڑے سائنسی دلائل دیے گئے۔ کئی صاحب الرائے افراد نے اوسبارن کی حمایت کی۔ اس واحد دانت کی بنیاد پر پورے آدمی کے جسم اور سر کی تصویر بنائی گئی۔ بات یہی ختم نہیں ہوئی بلکہ ایک قدرتی پسِ منظر میں اس فرضی آدمی کی بیوی اور بچوں کی تصاویر کا نقشہ بھی کھینچا گیا اور اسے ایک خاندان کی شکل میں پیش کیا گیا۔ اس فرضی آدمی کا نام بھی رکھا گیا جو کہ نیبراسکا آدمی (Nebraska Man) کہلایا گیا۔ اس کا سائنسی نام بھی تجویز کیا گیا۔ یہ تمام کارنامے ایک دانت سے تخیل کی مدد سے کئے گئے۔ قدرت کا کرنا ایسا ہوا کہ 5 سال بعد 1927 میں اسی کھوپڑی کے اور حصے تلاش میں مل گئے جس کے مطابق یہ دانت نہ تو انسان کا نکلا اور نہ بوزنے کا بلکہ ایک سُوّر (Pig) کا دانت تھا جس کی نسل اب ناپید ہو چکی تھی۔ یہ پورے پانچ سال ارتقاء پسند اس ایک دانت کو انسان اور بوزنے کے درمیان کڑی کے طور پر پیش کرتے رہے۔

اس پر ڈاکٹر صاحب کے کلینک میں ہنسی گونج اٹھی۔ ڈاکٹر صاحب خود بھی ہنس رہا تھا۔ چاروں دوست اس تذبذب میں مبتلا ہو گئے کہ ہنسا جائے یا حیران ہوا جائے کیونکہ اس کہانی نے تو حیرانگی اور ہنسی کا گڈمڈ امتزاج پیدا کیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب ہنستے ہنستے گویا ہوئے۔

تو یہ ہے میرے پیارو! ان ارتقاء پسند محققین کے تخّیل کی پروازیں۔ اب ذرا دوسری کہانی سنو۔

1912ء میں ایک اور محقق چارلس ڈاسن (Charles Dawson) کی طرف سے برطانیہ میں دعویٰ کیا گیا کہ انہیں ایک گڑھے میں سے ایک جبڑے کی ہڈی اور کھوپڑی کا ایک ٹکڑا ملا ہے۔ جبڑا بوزنے کے جبڑے سے مشابہت رکھتا ہے جب کہ اُس جبڑے میں موجود دانت اور کھوپڑی انسانی دانتوں اور کھوپڑی جیسے ہیں۔ اس جبڑے اور کھوپڑی کی بنیاد پر اس کی تخیلاتی شکلیں اور مجسمے بنائے گئے۔ اس فرضی آدمی کا نام بھی رکھا گیا جو کہ پلٹ ڈاون (Piltdown man) کہلایا گیا۔ دعویٰ کیا گیا کہ پلٹ ڈاون آدمی 5 لاکھ برس پرانا ہے۔ انہیں بہت سے عجائب گھروں میں نمائش کے لئے رکھا گیا اوراس کو انسانی ارتقاء کے مکمل ثبوت کے طور پر پیش کیا گیا کہ انسانوں اور بوزنوں کے درمیان گمشدہ کڑی یہی پلٹ ڈاون آدمی اور اسی کا نسل ہے۔ چالیس سال سے زائد برسوں تک اس پر سائنسی مقالات لکھے جاتے رہے۔ حتیٰ یہاں تک کہ اس موضوع پر 500 سے زائد ڈاکٹریٹ کے مقالات لکھے گئے۔ 1912ء سے 1949ء تک دنیا اس فریب میں مبتلا رہی۔ 1949ء میں پرانے فاسلز کا زمانہ اور عہد کا پتہ لگانے کا ایک سائنسی طریقہ تجزیۂ فلورین ایجاد ہوا۔ جب یہ تجزیۂ فلورین اس پلٹ ڈاون آدمی کے فاسلز پر کیا گیا۔ تو نتیجہ بڑا ہی حیران کن نکلا۔ نتیجہ یوں تھا کہ "پلٹ ڈاون آدمی کا یہ فاسل دفن ہوئے چند برسوں سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے اور کھوپڑی چند ہزار برس پرانی ہے، زیادہ نہیں۔ جبڑے کی ہڈی میں سے دانت مصنوعی طریقے سے نکالے گئے ہیں"۔ اس نتیجے کے بعد ایک محقق ویز (Weiner) نے اس کا مفصل تجزیہ مکمل کر کے بتایا کہ 1953ء میں اس جعلسازی کا علم عام لوگوں کو ہو گیا تھا۔ کھوپڑی ایک 500 برس پرانے دور کے آدمی کی تھی اور جبڑے کی ہڈی حال ہی میں مرنے والے ایک بوزنے کی تھی۔ دانتوں کو خاص طور پر ایک قطار میں ترتیب دیا گیا تھا اورانہیں جبڑے کے ساتھ مصنوعی طریقے سے جوڑا گیا تھا پھر جوڑوں کو پُر کر دیا گیا تھا تاکہ وہ انسانی دانت دکھائی دیں۔

اس جعلسازی کے آشکارہ ہونے پر اس جعلی فاسل کو برٹش میوزیم سے ہٹا دیا گیا۔ جہاں پر وہ گزشتہ 40 برس سے زیادہ عرصے سے نگاہ خاص وعام کا مرکز بناہوا تھا۔

تو میرے پیارو! کچھ ایسی ایسی حقیقتیں ہیں اس نظریے کی تعمیر میں۔

ڈاکٹر صاحب ہلکے ہلکے سے مسکرا رہے تھے۔

اب کچھ اور ایسی حقیقتیں انہیں فاسل ریکارڈز سے بتانا چاہونگا جس سے اس نظریے کی دیواریں ہل جائینگی اور ہلکا سا عقل استعمال کرنے والا بھی تردید نہ کرپائے گا۔ ویسے تو اس نظریے کی تردید کے لئے بیان کردہ حقائق ہی کافی ہیں۔ لیکن یہاں صرف آخری مہر ثبت کرنا چاہونگا۔

ڈاکٹر صاحب پانی کا گلاس میز پر رکھنے کے بعد گویا ہوئے۔

اس سے پہلے ہم نے موجودہ انسان جسے ارتقاء پسندوں نے ہیوموسیپئنز کا نام دیا ہے کی عمر بتائی تھی۔ ارتقائی محققین کے حیاتیاتی اعداد وشمار کے مطابق موجودہ انسان کی عمر 30 ہزار سال ہے لیکن سپین (Spain) میں 1995ء میں ایک فاسل زمین کھود کر نکالا گیا۔ جو کہ گیارہ سالہ لڑکے کا چہرہ تھا اور بالکل جدید انسانوں جیسا تھا، مگر اس کو سائنسی تحقیق کے مطابق مَرے ہوئے آٹھ لاکھ سال ہوچکے تھے۔ اس فاسل سے ایک محقق کی حیرانگی کے انتہا کا اندازہ اس کے اِس تبصرے سے لگایا جاسکتا ہے۔ "یہ ایسا ہے جیسا اتنے پرانے دور میں ہمیں کوئی ٹیپ ریکارڈ مل جائے جسکی بالکل توقع نہیں کی جاسکتی"۔

اس طرح 1970ء کی ابتدائی دہائیوں میں مشہور محقق لوئس لیکے (Louis Leakey) کو 1.7 ملین سالہ پرانی جھونپڑی کے باقیات ملے۔ ان باقیات نے ارتقاء پسند محققین کو ہلا کے رکھ دیا اور اس سے بھی دلچسپ بات یہ ہے کہ ایسی جھونپڑیاں آج بھی افریقہ کے کچھ حصوں میں بنائی جاتی ہیں۔ یعنی وہی تعمیر آج جدید دور میں بھی دنیا کے کچھ حصوں میں بنائی جاتی ہے۔

ایک اور تحقیق جو 1977ء میں تنزانیہ میں میری لیکے(Marry Leakey)نے کی۔ اس میں 3.6 ملین سال پرانی نقشِ پا دریافت ہوئی جو کہ ایک جدید انسان کے نقشِ پا سے مختلف نہ تھی۔ اسکا جائزہ لینے کے بعد مشہور محقق ٹم وائٹ لکھتا ہے۔

"اس کے بارے میں کوئی غلطی مت کیجئے۔ یہ جدید انسانی نقوشِ پا جیسے ہیں۔ اگر کسی نقشِ پا کو آج کیلیفورنیا کے ساحل پر ریت پر چھوڑ دیا جائے اور کسی چار سالہ بچے سے بھی پوچھا جائے کہ یہ کیا ہے تو وہ بے ساختہ کہہ اٹھے گا کہ کوئی وہاں چل کر گیا ہے۔ ساحل پر ایک سو نقوشِ پا اور بھی ہوں گے تو وہ اسے ان سے علیحدہ کر کے نہیں بتا سکے گا نہ ہی ایسا آپ کر سکیں گے"۔

ان باقیات سے پتہ چلتا ہے کہ ہومو(Homo)یعنی انسان ان ارتقاء پسندوں کے اندازے سے زیادہ قدیم ہے۔ یہ تمام تحقیق انہی ارتقاء پسندوں کی ہیں لیکن یہ پھر بھی اپنے ضد پر اڑے ہوئے ہیں اور ایک غیر ثابت شدہ بلکہ رد شدہ نظریے کو گلے لگا بیٹھے ہیں۔

لیکن سر! جب اتنی واضح اور کھلے حقائق فاسل ریکارڈز کی شکل میں سامنے آگئے ہیں تو یہ لوگ کیونکر نظریہ ارتقاء کو منوانے پر تُلے ہوئے ہیں؟ کیف نے معصومانہ سوال کیا۔

بہت خوب! یہ سوال تو ارتقاء پسندوں ہی سے پوچھنا چاہیئے کہ یا تو وہ ان فاسل ریکارڈز کا جواب دیں یا حقیقت کو تسلیم کریں۔ کب تک تضادات کا مرجع بنے بیٹھے ہوں گے۔ یہ بیچارے ارتقاء پسند ملحدین خود تذبذب کا شکار ہیں۔ موجودہ دور کا سب سے بڑا ملحد اور نظریہ ارتقاء کی سب سے توانا آواز رچرڈ ڈاکنز کا جب آرچ بشپ روون ویلیمز (Rowan Willams) سے حال ہی میں مناظرہ ہوا تو رچرڈ ڈاکنز نے اعتراف کیا کہ " میں یہ وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ خدا کا وجود نہیں ہے، میں ملحد نہیں بلکہ لا ادری ہوں"۔ اور آپ جانتے ہونگے کہ لا ادری کیا ہوتا ہے۔ شک اور تذبذب میں مبتلا شخص کو لا ادری کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہی نکلتا ہے کہ ان حضرات کو خود بھی اپنے نظریے پر یقین نہیں ہے۔

خیر یہ تو جب جب موقع ملے گا ہم ان سے پوچھتے رہیں گے لیکن میری نظر میں اس ضد اور انا کے چند وجوہات ہیں۔

سب سے پہلی توجہ تو یورپ میں اہل کلیسا کے خلاف سائنسی بغاوت کے نتیجے میں بننے والی روِش کی اندھی اور بے جا تقلید ہے۔ اہلِ کلیسا نے دور ظلمات میں اپنی انتہائی اجارہ داری قائم کی ہوئی تھی اور عوام الناس پر ظلم و ستم ڈھائے ہوئے تھی۔ جس کو سائنس نے چیلنج کر دیا۔ اس چیلنج کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہر وہ بات جو سائنس کے لبادے میں پیش کی جائے، چاہے سائنسی ہو یا نہ ہو وہ حقیقت گردانی جائیگی۔ ایسا اس لئے ہوا کہ سائنسی نظریات و ایجادات نے عوام الناس کو اہلِ کلیسا کے چُنگل سے آزاد کر دیا تھا جس کی وجہ سے سائنس ہر صورت اور ہر شعبے میں نجات دہندہ کے طور پر پیش کی جانے لگی۔ کلیسا اور سائنس کی اس جنگ کو مذہب اور سائنس کی جنگ سمجھا جانے لگا۔ کلیسا کا ظلم مذہب کا ظلم مانا جانے لگا۔ یہی وہ غلط رویہ تھا جو ایک دوسری انتہا کو چھو رہا تھا جس سے الحاد نے جنم لیا اس دوران ایک اور حقیقت نے اس نقطہ نظر کے ماننے والوں کے لئے سونے پہ سہاگہ کا کردار ادا کیا۔ چند فلاسفر اور سائنسدان جو اپنے شعبوں میں بڑے بڑے نام تھے ایسے ابھر آئے جنہوں نے نظریہ ارتقاء کی تائید کی۔ ایسے سائنسدانوں کی مخالفت اُس زمانے میں عقل کی مخالفت سمجھی جاتی تھی۔ ہر ایک کی خواہش ہوتی تھی کہ اپنا وزن ان کے پلڑے میں ڈالا جائے۔ ان کے خلاف بات کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ نظریہ ارتقاء کو بھی سائنسی نظریے کا درجہ دیا گیا جو کہ ایک خام خیالی کے سوا کچھ نہ تھا کیونکہ ایک تخیلاتی پرواز کا سائنس سے کوئی سروکار نہیں اور نظریہ ارتقاء ایک تخیل کی پیداوار تھی جس پر ہم نے ابھی ابھی کافی بحث کی۔ اس موقع پر برطانیہ کا ایک نامور سائنسدان لارڈ سولی ذکر مین (Lord Solly Zuckerman) کو پیش کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہو گا۔ وہ برسوں تک فاسل ریکارڈز کا مطالعہ کرتا رہا اور کئی تحقیقی مقالات مکمل کئے اسے لارڈ کا خطاب سائنسی خدمات کے

اعتراف میں ملا۔ ذکرمین نے ایک دلچسپ سائنسی طیف Spectrum of the) (Science بنایا جو سائنسی اور غیر سائنسی کے درمیان پھیلا ہوا تھا۔یعنی انہوں نے علوم کی درجہ بندی کی جو کہ سائنسی علوم سے شروع ہو کر درجہ بدرجہ چل کر غیر سائنسی علوم پر ختم ہوتی ہے۔ اس طیف کے مطابق سب سے زیادہ سائنسی علوم کیمسٹری اور فزکس ہیں جو کہ ٹھوس اعداد و شمار پر منحصر ہیں۔ اس کے بعد حیاتیاتی علوم کی باری آتی ہیں اور پھر سماجی علوم کی۔ اس طیف کے آخری سرے پر جسے نہایت غیر سائنسی تصور کیا گیا اضافی حسی ادراک کو رکھا گیا جیسا کہ ٹیلی پیتھی اور چھٹی حِس۔ اس کے بعد سب سے آخر میں انسانی ارتقاء کو رکھا گیا۔ نظریہ ارتقاء کتنا سائنسی ہے اور کتنا نہیں اسکا اندازہ ذکرمین کے اس درجہ بندی سے لگایا جا سکتا ہے۔وہ کہتا تھا کہ انسانی ارتقاء کے منظر نامے میں کوئی حقیقت نہیں۔

نظریہ ارتقاء کو ارتقاء پسندوں کی طرف سے سائنسی انداز میں پیش کرنا اوراس کو عقیدہ بنانا ایک خاص پسِ منظر رکھتا ہے۔ارتقاء پسند حضرات کی نظر میں سائنس کے پروان چڑھنے کے بعد ان کے لئے یہ گوارا کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ کوئی مافوق الفطرت ہستی انسان پر حکمرانی کریں اور تخلیق کے لئے انسان اُس ذات کا محتاج ہو۔ کیونکہ ان کے خیال میں یہ انسانی تعظیم کے خلاف ہے۔ اس تخلیقی عقیدے سے بچنے کی خاطر انہوں نظریہ ارتقاء کا کمزور ترین سہارا لیا۔ اس جھوٹی تعظیم دینے کی خاطر انہوں نے انسان کا شجرہ بالجبر کھینچ کر جانوروں سے ملایا اور تعظیم کی دھجیاں بکھیر دیں۔ ایک ذی شعور اوراشرف المخلوق ہستی کے آباواجداد کو جانور گردانا گیا۔ اس کو جانور سے ارتقاء دے کے انسان بنایا گیا اور پھر کائنات کی آساس مانا گیا۔ اس رویّے کی وجہ سے معاشرہ خدا مرکزی (Theocentric) سے انسان مرکزی(Anthropocentric) کی طرف روانہ ہوا۔ یوں اس نظریے کو سائنسی لبادہ پہنا کر عقیدے کی شکل میں عوام الناس پر تھوپا گیا۔

یہ تو ہو گئی پہلی وجہ۔ اس نظریے کے تائید کی ایک دوسری وجہ بھی ہے وہ یہ کہ انسان کی اکثر اوقات یہ کوشش رہتی ہے کہ کس طرح ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جائے اور اس سے اس کے کئے ہوئے اعمال کے بارے میں پوچھ گچھ نہ ہو۔ وہ جو بھی کریں اس کے لئے آزادی ہو۔ الحاد اس ضمن میں انسان کو ایک اساس مہیا کرتا ہے اور نظریہ ارتقاء خالق کو درمیان سے نکال کر مادہ پرستی کی بنیاد رکھتا ہے کہ مادہ خود سے بن گیا اور اس سے تمام مخلوقات وجود میں آ گئیں۔ اس مادہ پرستی کا لازمی نتیجہ احساس ذمہ داری سے سبکدوشی ہے کیونکہ جب خالق نہ ہو تو انسان سوال وجواب سے بری الذّمہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس احساس ذمہ داری سے جی چُرانے کے لئے نظریہ ارتقاء کو نہ چاہتے ہوئے بھی مانا گیا۔ تعجب ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ رویہ بھی قابل تعجب ہے کہ نظریہ ارتقاء کی حقیقت اور تمام ریکارڈز اور اس کی تفصیل و تشریح کتابوں کی شکل میں چَھپی ہوئی موجود ہیں چھُپی ہوئی نہیں ہی بلکہ موجودہ ماڈرن دور میں انٹرنیٹ کے سنگل کلک (Single Click) پر دستیاب ہیں لیکن کوئی تحقیق کر ہی نہیں رہا۔ تحقیق کے لئے کوشش اور لگن چاہیئے۔

اسی کے ساتھ ہی گفتگو ختم کرتے ہیں کہ انسان انتہائی ذمہ دار ہستی ہے جو کہ ہمارا شبانہ روز کا مشاہدہ و تجربہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ایک معزز اور اشرف مخلوق ہے جس کو باقی تمام مخلوقات کی طرح الگ سے تخلیق کیا گیا ہے۔ اس کو صرف اسی لئے پیدا نہیں کیا گیا ہے کہ بس کھاؤ، پیو اور مر جاؤ۔ یہ تخلیق انتہائی اعلیٰ مدّبر اور ڈیزائنر خالق کی تخلیق ہے جس کو ہم خدا کہتے ہیں۔

یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر صاحب اپنی کرسی سے اُٹھ گئے جس کے ساتھ چاروں دوست بھی اپنی اپنی نشستوں سے اٹھ گئے۔

کھانا تیار ہونے میں آدھا گھنٹہ رہ گیا ہے ہوٹل تک بھی پہنچنا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے جانے کی تیاری کرتے ہوئے گھڑی دیکھ کر کہا۔

کیسا کھانا انکل۔۔۔فردان نے تعجب سے سوال کیا۔

کیوں بیٹا! ڈنر۔۔۔اور کیسا کھانا۔

میں نے ہوٹل میں کھانے کا آرڈر پہلے سے دیا تھا۔ آپ کے والد صاحب کیا کہیں گے کہ میرا بیٹا اپنے دوستوں کے ہمراہ کلینک آیا تھا اور میں نے کھانا نہیں کھلایا۔ کھانے کے انتظار میں ہماری خوب جی بھر کے گفتگو بھی ہوئیں۔ چلو اب نکلتے ہیں۔

یہ کہتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے عُویم کی پرچی فردان کے ہاتھ میں تھمادی اور روانہ ہو گئے۔

باب ہجدہم

بے مِثل خالق و عظیم مُدبّر

زندگی تلاش کا نام ہے اور یہ ایک ایسی تلاش ہے جس کی منزل خوداسی کا سفر ہے۔ایک ایسا سفر جس کی انتہا اسی ہی سفر کے دوسرے رخ کی ابتداء ہے۔ ہر انسان اس تلاش میں اپنی سانسیں گِن گِن کر قبر کے دہانے پہنچ جاتا ہے۔ اسی تلاش میں اصل امتحان حساس اور عقل پرست لوگوں کا ہوتا ہے جو ہر آن سوچنے اور دل و دماغ کھَپانے کے عادی ہوتے ہیں۔ یہ کٹھن تلاش اپنی ساری لذت انہی لوگوں سے اٹھاتی ہے تبھی تو اسی تلاش کی راہ اتنی کڑوی، مشکل اور ساتھ میں لذت بھری ہوا کرتی ہے کیونکہ اس میں حساس اور عاقل لوگوں کالہو شامل ہوتا ہے۔ اس راہ پر چلنے کے لئے ہمالیہ جتنا حوصلہ و جگر چاہیئے۔ یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اس راہ کے متلاشیوں کی فہرست کے ایک کونے میں عُویم کا نام بھی درج ہے جو کہ حقیقت کی تلاش میں نکلا تھا اور ابھی تک اسی کی تلاش جاری تھی۔ ایک طرف وہ خدا کے اِثبات و نفی کی تلاش میں سرگرداں تھا تو دوسری طرف روح اور جسم کے محاذ پر اطمینان واضطراب کی جنگ بھی لڑ رہا تھا۔ لیکن جب سے اسکی ملاقات عبدالاحد صاحب سے ہوگئی تھی اُس کے ذہن سے الحاد کی کجیاں، تصنّع اور اندھیرے ہٹنے لگے تھے۔ وہ خدا کے احساس پر سوچنے لگا تھا۔ اس کی موجودگی کو محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ کثافت سے لطافت کے مراحل طے کرنے پر گامزن تھا۔ وہ محسوساتِ حواسِ خمسہ سے تصّور و تخیّل کی وادی میں قدم رکھ رہا تھا اور تفکر و خرد پروری کی تخت پر تو وہ پہلے سے تخت نشین

تھا۔اس لیے وہ جب بھی اکیلا ہوتا تھا عبد الاحد صاحب کی باتیں اپنے ساتھ دہرایا کرتا تھا۔ لیکن ابھی تک وہ اس سرسبز و شاداب وادی میں نوزائیدہ تھا جس کی پختگی اور پرورش کا بخوبی اہتمام عبد الاحد صاحب نے کر رکھا تھا۔اس کی آن لائن کلاسز جاری تھی۔ جس میں عُویم بڑی دلچسپی سے حصہ لیتا تھا۔شام کو جیسے ہی کلاس کے شروع ہونے کا وقت ہوا کرتا وہ وقت سے پہلے اپنے کمرے میں پہنچ جاتا اور بذریعہ لیپ ٹاپ کلاس میں شامل ہو جایا کرتا۔

عُویم لیپ ٹاپ کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیڈ فون کانوں کو لگائے ہوئے کلاس کے شروع ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ جیسے ہی مقررہ وقت پہنچ گیا۔ عبد الاحد صاحب سکرین پر حاضر ہوگئے ۔ اس کا مائیک کھول دیا گیا۔ استاد کو دیکھتے ہی عُویم کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔استاد نے اپنے مخصوص انداز میں سب کو سلام کیا اور شرکاء کے احوال دریافت کیے۔

عزیزانِ من! تمام معزز شرکاء کو اللہ تعالیٰ کے اس عاجز بندے کی طرف سے السلام علیکم! امید ہے سب خیریت سے ہوں گے۔ میں آپ سب کی عافیت کے لئے دعاگو ہوں اور ساتھ میں دعاجُو بھی۔۔۔

پچھلی کلاس میں ہونے والی گفتگو میں جو سوالات موصول ہوئے ہیں۔وہ حسبِ معمول کلاس کے آخر میں ڈسکس کریں گے۔ ابھی نئی کلاس کی ابتداء کرتے ہیں۔

آج کی کلاس کا ٹاپک کائنات میں خدا کی نشانیاں ڈھونڈنا ہیں۔۔۔انسان جب اپنی کائنات میں کسی بھی چیز کا مشاہدہ کرتا ہے تو سب سے پہلے اس میں نظم و ترتیب کی تلاش کرتا ہے کیونکہ یہ ہماری عقل کا خاصہ ہے۔ اسی لئے وہ اسی چیز کے ڈیزائن پر اپنی توجہ مرکوز کر دیتا ہے اس کے حسن و جمال پر عقل و وجدان کے گھوڑے دوڑاتا ہے۔اس عمل کے لازمی نتیجے پر وہ اس منطقی انجام پر پہنچتا ہے کہ اس ڈیزائن کو کسی ڈیزائنر سے منسلک کئے دیتا ہے یعنی ڈیزائنر کے بغیر کسی بھی ڈیزائن کا وجود ناممکن ہے۔مثال کے طور پر اگر میں کسی خوبصورت محل کو دیکھتا ہوں تو سب سے پہلے اس کے انجینئر کو داد دیتا ہوں۔ میرے اس داد

وتحسین میں انجینئر کی جمالیاتی حس زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ اسطرح جب میں کسی ایسے محل یا سٹرکچر (Structure) کا مشاہدہ کرتا ہوں جو اپنی نظم وترتیب میں پیچیدہ ہو اوراس کی تعمیر عام فہم نہ ہو تو میں اس کے انجینئر کی ذہانت کو داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ اسی طرح کی ہزاروں مثالوں سے اس دنیا میں روزوشب ہماراواسطہ پڑتا رہتا ہے۔ غرضیکہ جہاں بھی کوئی ڈیزائن ہوگا اس کے پیچھے ڈیزائنر کا ہونالازمی اَمر ہے۔ اب یہ ڈیزائن جتنا پیچیدہ، خوبصورت اور نقص سے خالی ہوگا اتناہی اس کاڈیزائنر اعلیٰ پائے کاڈیزائنر گردانا جائے گا۔ تو کیاوجہ ہے کہ کائنات کے اس حسین وجمیل، مکمل اور پیچیدہ ترین ڈیزائن کو بغیر ڈیزائنر کے مانا جائے؟ کیا ایسی کوئی منطق انصاف پر مبنی ہو سکتی ہے؟ جب ذہانت ہے تو ذہن سے انکار کی کیاوقعت؟

چلواب اس ذہانت اور ڈیزائننگ کی چند مثالوں سے وضاحت کرتے ہیں۔

اس زمین کی سب سے اشرف مخلوق انسان کی ذات ہے۔ اسی ہی کی ذات میں اتر کر ڈیزائنر کے کمالات کامشاہدہ کرتے ہیں۔

سب سے پہلے عصبی مواصلاتی نظام (Nervous System) کی بات کرتے ہیں۔۔۔۔

جب ہم فون پر بات کرتے ہیں تو ساؤنڈ انرجی (Sound Energy)کا الیکٹرک پَلس میں اور پھر دوبارہ ساونڈ انرجی میں منتقل ہونے سے ایک عام ذہن تعجب کا شکار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ بجلی کے تار کے ذریعے آوازوں کی صحیح اور ٹھیک ٹھاک منتقلی سائنس کا ایک بہت بڑا کرشمہ ہے۔ لیکن اس کرشمے سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور مکمل نظام ہمارے جسم کے اندر قائم کر دیا گیاہے جس میں کروڑوں قسم کی معلومات ہر وقت کنٹرول روم سے کنٹرول ہوتی رہتی ہے۔ دل کو الگ معلومات ملتی ہیں کہ اس نے کس رفتار سے خون مہیا کرنا ہے اور کتنی مقدار میں مہیا کرنا ہے۔ پھیپھڑوں کو الگ سے معلومات ملتی ہیں جس کے مطابق وہ

آکسیجن اور کاربن ڈائی اکسائیڈ کا اندراج واخراج صحیح انداز سے کرتی ہیں۔ معدے کو مختلف معلومات حاصل ہوتی ہیں کہ کونسا کھانا ہضم کرنا ہے اور کونسا ضائع کرکے فاضل مادے میں منتقل کرنا ہے۔ اسی طرح زبان تقریباً تین ہزار خلیوں کے ذریعے دماغ تک ذائقے کے بارے میں معلومات فراہم کرتا ہے۔ کان معلومات کی یہی ارسال وترسیل تقریباً ایک لاکھ خلیوں کے پیچیدہ عمل کے ذریعے ہمارے دماغ تک آواز کی صورت میں پہنچاتے ہیں۔ ہر آنکھ تقریبا 13 کروڑ متحرک خلیوں کے ذریعے دماغ تک تصویر کی معلومات دیتی رہتی ہے یہی حال جلد کا بھی ہے کہ کن چیزوں سے جسم کی حفاظت کرنی ہے اور کن سے نہیں۔ ہماری جلد میں حسیاتی ریشوں کا جال بچھا ہوا ہے اگر ایک گرم چیز جلد کے سامنے لائی جائے تو تقریبا 30 ہزار خلیے اس کو محسوس کرکے دماغ تک خبر کرتے ہیں اسی طرح سرد چیز کو دولاکھ پچیس ہزار خلیے محسوس کرکے دماغ تک اطلاع پہنچاتے ہیں۔ غرضیکہ جسم کے ہر حصے کو ہر پل الگ الگ معلومات ملتی رہتی ہیں اور جس کے جواب میں جسم کے ہر عضو کا جواب بھی واپس کنٹرول روم منتقل کیا جاتا ہے جس پر کنٹرول روم بروقت کاروائی بھی کرتا ہے۔ یہ تمام سرگرمیاں ایک ساتھ سرانجام پاتی ہے۔

یہ تو صرف اس نظام کی بات ہوئی جو کنٹرول روم یعنی دماغ تک معلومات پہنچانے اور پھر دماغ سے حکم کی واپسی کراتے ہیں۔ اب ذرا کنٹرول روم پر نظر دوڑاتے ہیں۔ میری نظر میں انسانی مشاہدے میں جو سب سے پیچیدہ اور ناسمجھ جُز ہے وہ انسانی دماغ ہے۔ اس سے انسانی نفسیات اور علوم وابستہ ہے سائنس تو یہ تجزیہ کرا سکتی ہے کہ دماغ کی شکل وشُباہت کیسی ہے، یہ کس طرح کام کرتا ہے، یہ کس قسم کے خلیوں سے بنا ہوا ہے۔ لیکن یہ دماغ علم وعقل اور تصور وتخیل کی دنیا میں جو کارنامے سرانجام دیتا ہے، جو کرشمے دکھاتا ہے، یہ سائنس کی گرفت سے باہر ہے۔ سائنس کے مطابق انسانی دماغ کے اندر ایک ارب خلیے (Nerve Cells) ہوتے ہیں۔ جن سے کروڑوں کی تعداد میں نکلنے والے تاربدن میں

پیغام رسانی کے کام سرانجام دیتے ہیں۔ ان خلیوں سے نکلنے والی عقل و تخیل کی لہریں جو ہمیں مختلف انسانوں میں مختلف شکل میں ملتی ہیں، وہ ایک عظیم شاہکار ہے۔ ایک ہی جگہ بسنے والے لوگ، ایک ہی طرح کی دماغی ساخت رکھنے والے لوگ فکر و خیالِ و تصور میں الگ الگ انتہاوں کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ انسانی دماغ کی عجیب الفطرت کارستانی نہیں تو اور کیا ہے؟ ہر ایک کے دماغ میں ہزار ہا دنیائیں سموئے ہوئے ہیں۔ ایک ہی وقت میں ہزار ہا فکری لہروں کا منبع بنا ہوتا ہے۔ دنیا کی سب سے زیادہ مُناقشات انسانی دماغوں میں رونما ہوئی ہیں اور ہوتی رہتی ہیں۔

یہ سب کچھ ایک عظیم ڈیزائنر اور ساتھ ساتھ بہترین کنٹرولر کی مرہونِ منت نہیں ہے کیا؟ کیا یہ ایک عظیم خالق کی کاریگری نہیں ہے؟ کیا یہ سب کچھ ایک عظیم خالق کے بغیر صرف اتفاق سے وقوع پذیر ہوا ہے؟

آخری فقرہ کہتے ہوئے عبد الاحد صاحب وفُور جذبات سے معمور تھے جس کے بعد ہلکا سا خاموش ہوگئے۔ اسی دوران کمنٹ باکس (Comment Box) میں "عظیم خالق ہی کی کاریگری ہے" کے کئی کمنٹس دیکھنے کو ملے۔ چند حضرات نے "اللہ اکبر" کے کمنٹ سے اپنے دل کے جذبات ظاہر کر دیے۔

ہلکی سی خاموشی کے بعد استاد محترم دوبارہ گویا ہوئے۔

یہ تو ہم نے صرف عصبی مواصلاتی نظام کی بات کی۔ اسی طرح نظامِ تنفس ہے، نظام انہضام ہے۔ ہضم شدہ خوراک انتڑیوں میں موجود چھوٹی چھوٹی باریک رگوں کے ذریعے خلیوں تک پہنچ جاتی ہے۔ جس کی ترسیل خون کے ذریعے ہوتی ہے۔ خلیوں تک پہنچ کر عمل نفوذ کے ذریعے پروٹوپلازم میں داخل ہو جاتی ہے۔ ان مرکبات میں موجود توانائی کے حصول کا پورا نظام ہر ایک خلیے میں موجود ہوتا ہے جس میں عمل تنفس کے ذریعے مہیا کی گئی اکسیجن

اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اس عمل تنفس کے ذریعے خلیے اس خوراک سے توانائی کشید کر لیتی ہے اور یہی توانائی ہم روز مرہ افعال کو سرانجام دینے لئے استعمال کرتے ہیں۔

یہ ساری ترتیب و تنظیم اوران اعمال میں یہ ربط کون پیدا کرتا ہے؟

اس طرح آنکھ، کان اور جلد وغیرہ کے افعال ہیں، خون کی گردش ہے، اعضاء کی حرکتیں ہیں۔ یہ سب ایک متعین نظام کے تحت کارفرما ہیں۔ مجال ہے کہ ایک رکن بھی قدرت کے قانون کی خلاف وزری کرے۔ ہمارا پورا جسم قدرت کے قانون کے تابع ہیں۔ ہر ایک مقررہ وقت پر اپنا فعل بخوشی سرانجام دے رہا ہے باوجود اس کے کہ نظام کتنا ہی پیچیدہ ترکیوں نہ ہو۔ یہ تو وہ سائنسی معلومات ہیں جو ہماری علم کی گرفت میں آگئی ہیں پتہ نہیں مائیکرولیول پر ربِّ کائنات اور کیا کیا کرشمہ سازی کر رہا ہو گا۔ جن تک ہماری رسائی نہیں ہے۔مائیکرولیول پر انسانی جسم کے ایک جُز ڈی این اے(DNA)تک سائنسدان پہنچ گئے ہیں جس کی کارستانیاں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ڈی این اے خلیے کے نیوکلئیس میں پائی جانے والی سیڑھی نما توارثی مرکب ہے جو کہ چار چھوٹی چھوٹی اکائیوں کا مجموعہ ہے جنہیں نیوکلیو ٹائیڈز کہا جاتا ہے ۔ یہ نیوکلیوٹائیڈز ایڈی نین(Adenine)، تھائی مین (Thymine)،سائیٹوسین(Cytosine)اور گوانین(Guanine)پر مشتمل ہے۔ یہ چار ارکان ڈی این اے کو ایک طویل لڑی کی صورت مہیا کرتی ہے۔ جنکی تعداد ڈی این اے کے ایک لڑی میں لاکھوں میں ہوتی ہیں۔ والدین سے بچوں میں جو خاصیتیں منتقل ہوتی ہیں اس کی وجہ ڈی این اے میں موجود یہی نیوکلیوٹائیڈز ہیں۔ ان چار ارکان کی مخصوص ترتیب اور تعداد انسانی خاصیتوں اور شکل و شباہت کی بنیاد ہے۔ اس مخصوص تعداد اور ترتیب کو سائنسی زبان میں جین(Gene) کہتے ہیں۔ اب تک کی تحقیق کے مطابق ایک انسان میں جینز کی تعداد ایک ہزار تک بتائی جاتی ہیں۔ ڈی این اے میں نیوکلیوٹائیڈز کی تعداد تین ارب تک دریافت ہوئی ہیں۔ اس پیچیدہ ترین عمل اور کردار کو صرف اور صرف بیان

کردہ چار حروف تہجی کے ذریعے ایک دوسرے سے الگ اور مختلف رکھنا کس کا کمال ہو سکتا ہے؟ کیا یہ سارا عمل کڑی اور چوکس نگرانی کے بغیر ممکن ہے؟ تبھی تو انگلستان کے ایک فاضل ڈاکٹر ایبر سولڈ لکھتے ہیں۔

"اس کائنات میں نظم و ترتیب اور حکمت و صناعی کے یہ حیرت انگیز مظاہر کسی حادثے یا اتفاق کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ ایک بے مثل خالق اور عظیم مدبر کی تخلیق ہے۔ جب میں نے سائنس کا مطالعہ شروع کیا تو آغاز میں یہ خیال تھا کہ سائنس بہت جلد زندگی اور عقل و شعور کے سرچشموں کے متعلق علم حاصل کرلے گی لیکن جوں جوں میرے علم میں اضافہ ہوتا گیا یہ حقیقت مجھ پر منکشف ہوتی گئی کہ انسانی علم ان ماورائی حقائق کی ابجد سے نا آشنا ہے"۔

یہ کہنے کے بعد استاد محترم نے ایک دفعہ پھر وقفہ لیا اور خاموشی اختیار کی۔ لیکن بہت جلد ہی اپنی خاموشی توڑدی اور کلاس کو جاری رکھا۔

اب ذرا انسان کے باہر کی کائنات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اپنی پیاری زمین کا جائزہ لیتے ہیں جس پر ہم اپنی زندگی کے شب و روز گزارتے ہیں۔

زمین اپنی جسامت کے لحاظ سے کائنات میں ایک ذرے کے برابر حیثیت بھی نہیں رکھتی۔ یہ کائنات ہماری سوچ سے بھی زیادہ بڑی ہے اور مسلسل بڑھتی جارہی ہے لیکن اس کے باوجود اس چھوٹی سی زمین پر ہم انسانوں کے لئے خالق نے جو سازگار ماحول اور حالات مہیا کئے ہیں وہ سائنس کے معلوم علم کے مطابق کائنات میں کہیں نہیں پائے جاتے۔

سب سے پہلے زمین کی جسامت اور وزن کا معائنہ کیجئے۔ زمین کا وزن تقریباً 6 ارب ٹریلین ٹن ہے۔ اگر یہ موجودہ جسامت اس سے کم یا زیادہ ہوتی تو اس پر زندگی محال ہوتی۔ مثلاً اگر کم ہوتی تو اس کے نتیجے میں کشش ثقل بھی کم ہو جاتی اور نتیجتاً یہ اپنے اوپر ہوا اور پانی کو نہ روک سکتی جیسا کہ چاند کے ضمن میں ایسا ہے۔ چاند کے اوپر نہ پانی ہے اور نہ ہوائی کرہ۔ ہوا کا غلاف نہ ہونے کی وجہ سے چاند رات کے وقت بے حد سرد ہو جاتا ہے اور دن کے

وقت تنور کے مانند گرم۔ اسی طرح اگر یہ جسامت زیادہ ہوتی تو کشش ثقل زیادہ ہو جاتی جس کے نتیجے میں زمین زیادہ ہوا کو اپنی طرف کھینچنے لگتی اور نتیجتاً ہوائی کرے کی کثافت زمین کے نزدیک بڑھ جاتی۔ یوں ہوا کے دباؤ میں اضافہ ہو جاتا۔ جس کے نتیجے میں انسانی جسم گھٹ کر گلہری جتنا چھوٹا ہو جاتا جس میں کوئی اعلیٰ ذہنی نشوونما اور زندگی ممکن نہ رہ جاتی۔ اور بالفرض یہ جسامت اگر سورج کے جتنا بڑھا دیا جائے تو ہوا کی کثافت اتنی بڑھ جائے گی کہ زندگی محال ہو جائے گی۔ لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ جسامت سے اگر کم یا زیادہ ہوتا تو زمین پر زندگی بے حد متاثر ہو جاتی۔ اس اعتدال کو دیکھ کر ایک عاقل شخص ہی یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ ایک عظیم خالق، ڈیزائنر اور تھنکر ہی کا کرشمہ ہے۔

اب ذرا زمین کی گردش پر روشنی ڈالتے ہیں۔

زمین اپنے محور پر چوبیس گھنٹوں میں ایک چکر پورا کر لیتی ہے جس کی رفتار تقریباً سولہ سو کلومیٹر فی گھنٹہ ہے۔ اگر یہ رفتار اس سے گھٹ جائے تو ہماری زمین کی دن اور راتیں لمبی ہو جائینگی۔ جس کی وجہ سے گرمیوں کا سخت سورج دن کے وقت زمین سمیت تمام مخلوقات کو انتہائی حد تک متاثر کرے گا۔ حتیٰ کہ نباتات کو جلا دے گا اور جو کچھ بچ جائینگے اس کی کسر لمبی رات کی ٹھنڈک پوری کر لے گا۔ غرضیکہ زندگی ناممکن ہو جائیگی۔ فرض کریں اگر یہ رفتار دس گنا کم کر دیا جائے تو شب وروز دس گنا لمبے ہو جائینگے۔ جس کی وجہ سے جون، جولائی میں 140 گھنٹے کا گرم دن زمین کو جھلس کر رکھ دے گی اور جنوری کی 140 گھنٹے کی طویل رات ہر شے کو منجمد کر دے گی۔ اسکے برعکس اگر یہ رفتار موجود رفتار سے بڑھا دی جائے تو دن رات اتنے چھوٹے ہو جائینگے کہ تقریباً ایک دوسرے میں ضم ہو جائینگے۔ تب بھی زندگی کے لئے خطرے کی گھنٹی ہے۔ دن رات کی اس کمی وزیادتی کے خدشے کے ساتھ ساتھ رفتار کی افراط و تفریط ایک بہت بڑے اور مستقل آندھی کا پیش خیمہ بھی ہو سکتی ہے جس کا ہر وقت زمین کو سامنا کرنا پڑے گا۔

اسی طرح اگر ہم زمین کا سورج سے فاصلے پر غور کریں تب بھی خالق کی بہت بڑی کاریگری ہماری آنکھیں کھولنے کا انتظار کر رہی ہیں۔ اس فاصلے کو کائنات کے خالق نے بڑے اہتمام سے ناپ کے رکھا ہے کیونکہ اگر یہ فاصلہ اس سے کم ہو جائے تو ہماری زمین سورج کے قریب آجائے گی جس کے نتیجے میں زمین پر گرمی کی وجہ سے اکثر چیزیں جل جائیں گی اور زندگی محال ہو جائیگی۔ اسی طرح اگر یہ فاصلہ بڑھا دیا جائے تو اس کے برعکس واقعہ پیش آنے کا خدشہ ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ سورج کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ اگر اس کا ٹمپریچر اس کے موجودہ ٹمپریچر سے زیادہ یا کم کیا جائے تب بھی زمین پر اسکے ویسے اثرات پڑیں گے جو زمین اور سورج کے درمیان فاصلے کے بڑھنے یا گھٹنے سے پڑتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ ہماری زمین کی ایک الگ خصوصیت یہ ہے کہ یہ 23 درجے کا زاویہ بنا کر فضاء میں جھکی ہوئی ہے۔ ہمارے سال کے موسم اسی جھکاؤ کی مرہونِ منت ہیں۔ اس کے بغیر زمین صرف صحرا اور برف کے میدانوں پر مشتمل ہوتی۔

اب آپ حضرات مجھے بتائیں کہ یہ اتنی بڑی کاریگری کون کر رہا ہے؟ یہ نپی تُلی حساب کس کی جلوہ فرمائی ہے؟ کیا یہ سب کچھ ایک اتفاق اور حادثے کا نتیجہ ہے؟ کم از کم ایک عاقل اور باشعور شخص اتنی بڑی کاریگری اور اس پر ہر پل نظر رکھنے اور سو فیصد صحیح چلانے اور کنٹرول کرنے کو محض اتفاق نہیں کہہ سکتا۔ تبھی تو فزکس کے عظیم سائنسدان آئن سٹائن نے جب کائنات میں اس قدر حیرت انگیز معنویت دیکھی تو یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ "عالم فطرت کے بارے میں سب سے زیادہ ناقابل فہم بات یہ ہے کہ یہ قابل فہم ہے"۔

“The most incomprehensible fact about nature is that it is comprehensible”

عُویم گُم سُم بیٹھا استاد کی باتیں سن رہا تھا اور ساتھ ساتھ زمین کی ہیئت اور ساخت کو بھی اپنے تصور میں لئے ہوئے تھا۔ وہ زمین کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک تخیل کے

گھوڑے سے چکر کاٹ رہا تھا۔ اسی دوران راستے میں کبھی کبھار خوبصورت اور دلنشین وادی میں پڑاؤ بھی کر جاتا۔ ٹھنڈے چشمے سے پانی پی جاتا۔ منہ ہاتھ دھو کر اور معطر فضاؤں کے لَمس سے محظوظ ہو کر دوسری وادی میں پہنچ جاتا۔ کبھی فلک بوس پہاڑوں پر چڑھ جاتا۔ کبھی صحراؤں میں مٹر گشت کرتا۔ کبھی جھیلوں اور چشموں میں غوطے لگاتا۔ کبھی گھنے گھنے جنگلوں میں خیمہ زن ہو جاتا۔ کبھی ہرے ہرے کھیتوں کلیانوں میں چہل قدمی کرتا۔ کبھی ہاتھوں کو اطراف میں پھیلائے ہوئے اور گھومتے ہوئے بارش میں بھیگ جاتا۔ کبھی کبھار قطبین پر جمی ہوئی برف پر خود کو چلتے چلتے گرا دیتا اور مسکراہٹ اسکے لبوں کو چوم جاتی۔ کبھی باغات میں رقص کرتا اور گنگناتا ہوا دکھائی دیتا۔ غرضیکہ وہ اپنی حسین زمین کی پر کیف اور مسرور کن خوبصورتی سے مزے لے رہا تھا کہ بے ساختہ اسکے منہ سے نکل پڑا۔

"یقیناً یہ سب کچھ، یہ اتنی حسین و جمیل اور حیرت انگیز دنیا اتفاق نہیں ہو سکتی۔ اسکے پیچھے

ضرور کسی کا ہاتھ ہے جس نے اسے بنایا ہے اور چلا بھی رہا ہے اور وہ جو بھی ہے وہ ایک بہت بڑی اور بے نقص جمالیاتی حس کا مالک ہے"۔

عبد الاحد صاحب نے پانی پینے اور سستانے کے لئے ہلکا سا وقفہ لیا تھا۔ اب زمین کے اوپر تھوڑا سا چکر لگاتے ہیں۔ استاد کے اس فقرے نے عُویم کو چونکا دیا اور تصوراتی دنیا سے واپس کلاس کی طرف لے آیا۔

زمین کے اوپر مختلف گیسوں نے تہہ بنائی ہوئی ہے۔ جس میں زیادہ حصہ نائٹروجن اور آکسیجن کا ہے جبکہ باقی گیسیں بہت کم مقدار میں پائی جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس ہوائی کُرّے میں گرد کے ذرات اور آبی بخارات بھی موجود ہوتے ہیں۔ یہ تمام مل کر زمین کے گرد ایک متعین اور مناسب کثیف تہہ بنا دیتے ہیں جو کہ آسمانی پتھر یعنی شہاب ثاقب کی راہ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ یہ شہابیے 6 سے 40 میل فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر کرتے

ہیں اورایک اندازے کے مطابق 2 کروڑ شہابیے روزانہ کی بنیاد پر زمین کا رخ کرتے ہیں۔ اگر یہی تہہ راستے میں ان شہابیوں کو جلا کر راکھ نہ کر دیتی تو ہماری زمین روزانہ پتھروں کی بارش کی زد میں آتی۔ اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ہوائی کُرّے کا اتنا صحیح اور بہترین تناسب کس نے متعین کیا ہے؟؟ کون ہے جو گیسوں کی اتنے صحیح حساب کتاب سے پتھروں کی بارش کو روک رہا ہے اوراس کو جلا کر راکھ کر رہا ہے؟ بے شک وہ ایک بہترین ڈیزائنر اور حساب کنندہ ہے۔

اب ذرا آکسیجن کی مثال لیجئے۔ ہماری فضا میں اس کی تناسب 21 فیصد ہے۔ فرض کریں اگر یہ تناسب اس سے زیادہ ہو جاتا تو تمام آتش گیر مادے سورج کی تپش سے بھی آگ پکڑ لیتے۔ ہلکی سی چنگاری پورے علاقے کو زیر آتش کرنے کے لئے کافی ہوتی۔ اس کے برعکس یہ تناسب اگر کم ہوتا تو ہمارا نظام تنفس متاثر ہو جاتا۔ ہم صحیح طرح سے سانس لینے کے قابل نہ رہتے۔ کون ہے جس نے صدیوں سے آکسیجن جیسی اہم گیس کا بالکل صحیح تناسب مہیا کیا ہے؟ اور کس طرح مہیا کیا ہے یہ بھی اپنی ذات میں ایک حیران کن کہانی ہے کہ خالقِ کائنات نے کس طرح ایک ناچیز اور نظر نہ آنے والی مخلوق سے مقررہ مقدار کی آکسیجن بنانے کی ڈیوٹی لی۔

سائنسدانوں کے مطابق آج سے ساڑھے تین ارب سال پہلے زمین کے فضائی کرے میں آکسیجن موجود نہیں تھی یا اگر موجود تھی تو بہت ہی قلیل مقدار میں تھی۔ لہٰذا جب آکسیجن نہ ہو تو زندگی کا وجود ہی ممکن نہیں۔ نہ پودے، نہ جانور اور نہ انسان۔ صرف ان جانداروں کے زندہ ہونے کا امکان ہے جو آکسیجن کے بغیر اپنی زندگی بحال رکھ سکتے ہیں جیسا کہ بیکٹیریا وغیرہ۔ لہٰذا اس دوران زمین جنگلات و حیوانات سے خالی تھی اور بالکل چٹیل میدان کا نظارہ پیش کر رہی تھی۔ اس دوران کائنات کے عظیم ڈیزائنر نے اس ناچیز مخلوق بیکٹیریا کو آکسیجن پیدا کرنے کا حکم دیا اور اس نے ضیائی تالیف کے عمل کے ذریعے آکسیجن

پیدا کرنا شروع کیا جو کہ مستقبل میں باقی جانداروں کی زندگی کی وجہ بنی۔ اس طرح حیات وبقا کی یہ سب سے بڑی ضرورت بڑھتے بڑھتے 21 فیصد پر پہنچ گئی۔ اب اس کے بعد سے ابھی تک اس کے صحیح تناسب کی ضرورت تھی جو کہ خالق نے آکسیجن کا کاربن ڈائی اکسائیڈ کے ساتھ عجیب توازن اور باہمی انحصار قائم کر کے رکھ دیا ہے۔ حیوانات آکسیجن استعمال کرتے ہیں اور کاربن ڈائی اکسائیڈ خارج کرتے ہیں اسی کاربن ڈائی اکسائیڈ کو نباتات اپنی خوراک بنانے کے لئے استعمال کرتے ہیں اور بدلے میں آکسیجن خارج کرتے ہیں۔ لہٰذا ان دونوں کے صحیح تناسب کا براہِ راست اثر حیوانات اور نباتات دونوں پر پڑتا ہے۔

اب آتے ہیں نائٹروجن کی طرف۔ ہماری فضاء میں سب سے زیادہ مقدار نائٹروجن کی ہے جو کہ 78 فیصد ہے۔ یہ نائٹروجن نباتاتی حیات کا لازمی جز ہے۔ پودے اس کو مرکبات کی صورت میں استعمال کرتے ہیں لہٰذا پودوں کے براہِ راست استعمال کے لئے اسکا زمین میں داخلہ ضروری ہے۔ یہ دو طریقوں سے زمین میں داخل ہوتی ہے ایک بجلی کے کڑکنے سے اور دوسرا بیکٹیریا کے ذریعے۔۔۔۔۔۔ جب بجلی کڑکتی ہے تو فضاء میں موجود نائٹروجن آکسیجن کے ساتھ مل کر مرکب کی صورت اختیار کر جاتی ہے اور بارش کے پانی کے ذریعے زیرزمین چلی جاتی ہے۔ اس طرح بیکٹیریا بھی اس کو پودوں کے لئے قابل استعمال بناتی ہے۔ بیکٹیریا ایک ایسا ذِی حیات جاندار ہے جو کہ تھوڑی سی جگہ میں اربوں کھربوں کی تعداد میں سما جاتے ہیں۔ یہ کھاد وغیرہ کھا کر ایک ایسا رَس خارج کرتے ہیں جس میں نائٹروجن کی وافر مقدار موجود ہوتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق زراعت کی دنیا میں بیکٹیریا بارہ کسانوں کے برابر کام سرانجام دیتے ہیں۔

اب آپ حضرات مجھے بتائیں کہ بیکٹیریا کی یہ تربیت اور ٹریننگ کس نے کرائی؟؟ اس طرح ہماری کھیتی باڑی میں ہمارا کتنا حصہ ہے اور قدرت کے اس مخفی لشکر کا کتنا حصہ ہے؟ تبھی تو قرآن کریم میں خالق ورازق نے ارشاد فرمایا ہے اور انسانیت سے سوال پوچھا ہے۔

"کیا تم نے کبھی اپنی کھیتی پر غور کیا ہے؟ زراعت کون کرتا ہے تم یا ہم"*

گیسوں کے بعد اب تھوڑا پانی پہ غور و فکر کے گھوڑے دوڑاتے ہیں جو زندگی کا ایک اور انمول اور انتہائی ضروری جز ہے۔ سائنسدانوں کے اندازے کے مطابق زمین سورج ہی سے جدا ہوئی ہے۔ جدا ہونے کے وقت اسکا درجہ حرارت سورج جتنا تھا یعنی بارہ ہزار ڈگری فارن ہائیٹ۔ اس کے بعد وہ آہستہ آہستہ ٹھنڈی ہونے لگی۔ جب یہ درجہ حرارت چار ہزار ڈگری فارن ہائیٹ پر پہنچا تو آکسیجن کی ایک خاص مقدار ہائیڈروجن کے ایک خاص مقدار کے ساتھ ملنا شروع ہو گیا اور پانی کا وجود ممکن ہو گیا۔ ان گیسوں کو کس نے اس مخصوص تناسب میں یکجا کیا؟ کون تھا جو اس پر کڑی نگرانی رکھے ہوئے تھا؟ اور پھر پانی بھی اتنا پیدا کیا جتنی ضرورت تھی، نہ کم نہ زیادہ۔ اس کے ساتھ آکسیجن اور ہائیڈروجن بھی اسی مقدار میں باقی چھوڑ دیے جتنی حیات کو ضرورت تھی۔۔۔۔ کیا یہ کسی عظیم مفکر و مدبر کے بغیر ممکن ہے؟؟ کوئی بھی باشعور آدمی اس کا جواب "ہاں" میں نہیں دے سکتا۔۔۔۔ ضرور اس کے پیچھے ایک مفکر و مدّبر ہی کی کرشمہ سازی ہے۔

اسی پانی کی ایک اور خصوصیت پر غور کرتے ہیں۔ پانی جب جم جاتا ہے اور ٹھوس شکل میں برف کی صورت اختیار کرلیتا ہے تو اس کی کثافت کم ہو جاتی ہے یہ وہ واحد معلوم مادہ ہے جو جمنے کے بعد کم کثیف ہو جاتا ہے یعنی دوسرے لفظوں میں ہلکا ہو جاتا ہے۔ تبھی تو برف پانی کی سطح پر تیرتی ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو برف سمندروں اور دریاؤں کے نچلے سطح میں بیٹھ جاتی اور سخت سردیوں میں تمام سمندر اور دریا آہستہ آہستہ برف بن جاتے۔ لیکن قدرت ایسا کرنے نہیں دیتی۔ برف ہمیشہ پانی کے اوپر ہی رہتی ہے اور اس کے نیچے پانی اپنے اندر موجود آبی حیات کو زندگی کا سامان مہیا کرتی رہتی ہے۔ یہ سب میرے رب کے احسانات نہیں تو اور کیا ہے؟۔

---

* سورہ واقعہ 63، 64۔

اسی پانی کے آبی چکر(Water Cycle)پر اگر سوچا جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ کس طرح استعمال شدہ پانی کو دوبارہ قابل استعمال بنایا جاتا ہے۔ پانی کو ہم روزانہ وافر مقدار میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ استعمال شدہ پانی ندی نالوں کے ذریعے دریاؤں اور سمندروں میں چلا جاتا ہے۔ اس سفر کے دوران بھی اور دریاؤں اور سمندروں سے بھی یہی پانی بخارات میں منتقل ہوتا رہتا ہے اور دوبارہ بارش کی شکل میں ہمارے لئے قابل استعمال پانی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ کچھ قابل استعمال پانی ہمارے لئے زیر زمین میں ذخیرہ کیا جاتا ہے۔ اس چکر کے دوران انسان کو کبھی بھی پانی کی کمی یا گندگی کی شکایت کا موقع نہیں ملتا۔ یہ مکمل اور مرتب نظام کون چلا رہا ہے۔ کیا اس کے پیچھے عظیم ذہن کار فرما نہیں ہے؟

لیکچر کا یہ حصہ ختم ہونے کے بعد عبد الاحد صاحب نے پھر سے وقفہ لیا۔

اب اس کے بعد کہکشاؤں کی سیر کریں گے اور زمین سمیت پوری کائنات کو انسانی عقل و فہم کی گرفت میں لانے کی کوشش کریں گے۔ لیکن اس سے پہلے مجھے اجازت کے ساتھ حسبِ معمول تین چار منٹ کا وقفہ چاہیئے تاکہ چند گھونٹ چائے پی لوں۔ اِسی دوران آپ صاحبان اپنی تیار کردہ نوٹس کا جائزہ لیں اور اسے درست کریں۔

اس کے بعد عبد الاحد صاحب کا کیمرہ اور مائیک عارضی طور پر بند کر دیا گیا۔

وقفے کے بعد عبد الاحد صاحب نے دھیمے لہجے میں پھر سے بولنا شروع کیا۔

اچھا تو فلکیات کی طرف اڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عام انسانی مشاہدے و معائنے کی رسائی تو صرف زمین تک ہے اور بصارت کی حد تک صرف ان ستاروں اور سیاروں تک جو انسانی آنکھ سے دیکھے جاسکتے ہیں لیکن علمائے فلکیات کے اندازے کے مطابق کائنات میں تقریباً 50 کروڑ کہکشائیں ہیں اور ہر کہکشاں میں تقریباً ایک کھرب چھوٹے بڑے ستارے اور سیارے ہیں۔ ان میں کروڑوں ستارے اور سیارے اتنے بڑے ہیں کہ ان کے اندر لاکھوں زمینیں رکھی جاسکتی ہیں۔ مثلاً سورج زمین سے بارہ لاکھ گنا بڑا ہے یعنی سورج میں بارہ

لاکھ زمینیں سمائی جاسکتی ہیں۔ یہ تمام کہکشائیں اتنی بڑی ہیں کہ اس کو ناپنے کے لئے فاصلے کی اکائیوں کی نہیں بلکہ سورج کی روشنی کی رفتار سے مدد لی جاتی ہے۔ مثلاً ہمارا سورج جس کہکشاں میں واقع ہے اس کا قطر بیس لاکھ نوری سال پر مشتمل ہے۔ اسکا مطلب یہ ہوا کہ اگر ایک ہوائی جہاز روشنی کی رفتار کے برابر جو کہ ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ($3x10^5km/sec$) ہے، سے اس کہکشاں کے ایک سرے سے اڑنا شروع کرے تو وہ بیس لاکھ نوری سال میں دوسرے کونے تک پہنچ سکے گا لیکن تب بھی نہیں پہنچ پائے گا کیونکہ یہ کائنات مسلسل پھیل رہی ہے۔ لہٰذا اس سفر کے دوران کہکشاں اس سے کہیں زیادہ پھیل چکی ہوگی۔ اس پھیلاؤ میں کسی کے بھاگنے کی رفتار آٹھ میل فی سیکنڈ، کسی کی 33 میل فی سیکنڈ، کسی کی 84 میل فی سیکنڈ اور اس کے علاوہ بھی ہیں۔ ہمارا سورج 12 میل فی سیکنڈ کی رفتار سے اپنی مرکز سے دور بھاگ رہا ہے۔ غرضیکہ تمام ستارے وسیارے متحرک ہیں اور اپنے مرکز سے دور بھاگ کر کائنات کو وسعت دے رہے ہیں۔ یہی ہی ایک خالق کی پہچان ہے کہ اسکی تخلیق کو کوئی نہیں روک سکتا بلکہ مسلسل آگے بڑھتی جاتی ہے۔ جس طرح روئے زمین پر ہم دیکھتے ہیں کہ تخلیق کے ہزارہا کرشمے روزانہ ہماری آنکھوں کے سامنے رونما کرواکر خالقِ کائنات اپنی پہچان کرارہے ہیں۔ لاکھوں کروڑوں مختلف انواع کے بچوں کی پیدائش سے خالق ثابت کر رہا ہے کہ انہوں نے کائنات کی تشکیل کر کے ایک کونے میں بیٹھنے کو ترجیح نہیں دی بلکہ ہر پل اپنی تخلیقی صلاحیت نمایاں کر رہا ہے اور کڑی نگرانی رکھے ہوئے ہیں ۔ اسی طرح کہکشاؤں کی دنیامیں بھی یہی عمل جاری وساری ہے۔ اس وسیع و عریض کائنات کااندازہ اس بات سے لگالیں کہ ہماری نزدیک ترین کہکشاں جس کا نام اینڈرومیڈا (Andromeda) ہے تک سورج کی شعاع پہنچنے میں 20 لاکھ نوری سال لگتے ہیں جبکہ بعید ترین کہکشاں انڈرومیڈا کہکشاں کے مقابلے میں سوگُنا زیادہ دور ہے۔ یہ تو صرف وہ معلومات ہیں جو ماہرین فلکیات کے اندازوں سے ہم تک پہنچی ہیں جبکہ ماہرینِ فلکیات اس

ضمن میں اپنی عجز کا اظہار کر چکے ہیں۔ تو کیا بعید ہے کہ یہ کائنات انسانی سوچ سے بھی زیادہ بڑی ہو۔

یہ تو ہو گئی کائنات کی وسعتیں اوراس کی کشادگی، اب آتے ہیں اسکی حرکت کی طرف۔ کائنات میں موجود ہر ستارہ اور ہر سیارہ حرکت میں ہے۔ ہر کوئی اپنے مدار میں گھوم رہا ہے۔ سب سے قریبی حرکت جس سے ہم واقف ہے وہ چاند کی حرکت ہے جو کہ تقریباً4لاکھ کلو میٹر زمین سے دور ہے اور یہ مسلسل زمین کے گرد گھوم رہا ہے۔ اس طرح زمین سورج کے گرد گھوم رہی ہے۔ زمین کے علاوہ باقی آٹھ سیارے بھی سورج کے گرد گھوم رہے ہیں۔ ان سیاروں کے ارد گرد ان کے اپنے اپنے چاند بھی ہیں جو مختلف سیاروں کے گرد مختلف تعداد میں موجود ہیں۔ وہ بھی متعلقہ سیاروں کے گرد گھوم رہے ہیں۔ ان سب سیاروں کے علاوہ ہمارے نظامِ شمسی میں تیس ہزار چھوٹے سیارے جنہیں ایسٹرائیڈز (Asteriods) کہا جاتا ہے اور ہزاروں دم دار سیارے بھی سورج کے گرد گھوم رہے ہیں۔ ان سب کے ساتھ ساتھ سورج بھی حرکت میں ہے اوروہ ان تمام سیاروں کو ساتھ لے کر اپنی مدار میں چھ لاکھ میل فی گھنٹہ کے حساب سے گھوم رہا ہے۔ ان تمام گردشوں کے ساتھ ساتھ ایک اور حرکت بھی جاری ہے اور یہ کہ ساری کائنات چاروں اطراف میں پھیلتی بھی جا رہی ہے۔ سائنس ان ستاروں اور سیاروں کی حرکت کو آج سمجھ گئی جب کہ قرآن نے اس کا ذکر آج سے چودہ سو سال پہلے کیا ہوا ہے۔ یہ تمام نظام حیرت انگیز طور پر مکمل کنٹرول اور باقاعدگی کے ساتھ محوِ سفر ہے اور یہ حرکت کوئی عام رفتار میں نہیں ہو رہی بلکہ انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ تمام ستارے اور سیارے حرکت کر رہے ہیں لیکن اس کے باوجود اس میں کسی قسم کی بے قاعدگی اور ٹکراؤ دیکھنے کو نہیں ملا۔ کسی بھی ستارے اور سیارے کی حرکت میں ایک سیکنڈ کا فرق بھی نہیں آیا۔

ان سب کا بغور مشاہدہ کرنے کے بعد انسانی عقل حیرت میں ڈوب جاتی ہے اور سلیم الفطرت انسان خود سے چند سوالات کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اول۔۔ یہ کہ کیا یہ سب کچھ خود بخود ہو رہا ہے؟ کیا یہ مکمل، مربوط اور منظم نظام محض اتفاق اور حادثے کا نتیجہ ہے؟ یا اس کے پیچھے کوئی عظیم ذہن کار فرما ہے؟

دوئم۔۔ افلاک کی ان بلندیوں پر جہاں انسان کا وہم بھی نہیں پہنچ سکتا، یہ اربوں کھربوں ستاروں کے قمقمے کس نے فروزاں کئے ہیں۔ اسکو روشنی کس نے دی ہے؟ بتی میں تیل نہ ڈالو تو وہ بجھ جاتی ہے لیکن یہ ستارے بجھنے کا نام ہی نہیں لے رہے۔

سوئم۔۔ ہمارے ہاں بے شمار انتظامات اور سائنسی آلات کے باوجود روزانہ ٹریفک حادثات ہوتے رہتے ہیں۔ گاڑیاں آپس میں ٹکرا جاتی ہیں۔ لیکن ہماری گاڑیوں کی رفتار سے لاکھوں گنا زیادہ رفتار پر چلنے والے اربوں کھربوں ٹن وزنی ستاروں اور سیاروں میں تصادم کیوں نہیں ہوتا؟ ان سب کا انتظام کس کے ہاتھ میں ہے جو ان کو صحیح سمت میں چلا رہا ہے؟

یہ سوالات بیان فرمانے کے بعد عبد الاحد صاحب نے خاموشی اختیار کی تا کہ طلباء و طالبات خود ہی سوالات پر غور کریں۔

خاموشی توڑنے کے بعد دوبارہ گویا ہوئے۔

اس عظیم اور منظم کائنات کا ہُو بہُو عکس مادے کی بنیادی جز ایٹم میں بھی موجود ہے۔ نیوٹران اور پروٹان ستارے کی مانند ایٹم کے مرکز میں موجود ہوتے ہیں اور الیکٹرانز سیاروں کی طرح مرکز کے گرد انتہائی تیز رفتاری سے گھوم رہے ہوتے ہیں۔ یعنی بڑی دنیاؤں کے ساتھ چھوٹی دنیاؤں میں بھی خالقِ کائنات اپنی کاریگری کا احساس دلا رہا ہے۔ یہ دونوں دنیائیں انسانی بصارت سے باہر ہیں لیکن عظیم ڈیزائنر اور کنٹرولر کی مکمل گرفت میں ہے۔

کیا یہ سب کچھ دیکھ کر، سُن کر سائنس نے خدا کے اثبات میں دلائل مہیا نہیں کئے؟ میری نظر میں تو سائنس آہستہ آہستہ خدا کی ذات کو ثابت کر رہا ہے اور اس کی موجودگی کا

احساس دلا رہا ہے لیکن کاش کہ کوئی اس مُرتّب اور منظّم نظام کے پیچھے ناظم کے کرشموں اور ناظم کے احساس پر بھی غور کریں۔ستاروں اور سیاروں کا صرف مادی اور طبیعیاتی رخ نہ دیکھے بلکہ ما بعد الطبعیاتی اور فکری رخ کا بھی معائنہ کریں۔ اگر ایسا ہو تو ضروری ہے اس کے تحقیق کے اختتام پر لازمی طور پر خدا اسکا منتظر ہو گا۔

علامہ اقبالؒ نے زمانہ حاضر کے مادہ پرست انسان پر تنقید کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

اسی شعر کے ساتھ ہی آج کی کلاس ختم کرتے ہیں۔ آج ہم نے پوری کلاس میں صرف اور صرف سائنسی مشاہدات کا تجزیہ کیا۔ لہٰذا اگلی کلاس اسی ہی کے ذیل میں ہو گی اور اسی کلاس کا تسلسل گردانا جائے گا جو کہ آپ لوگوں کی اسائنمنٹ پر مشتمل ہو گا۔

اسائنمنٹ نوٹ کرلیں۔

"ہر ایک نے کسی بھی سائنسدان کے تجربات و مشاہدات اور اس پر اس کا تجزیہ بیان کرنا ہے"۔

شُکریہ

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ

وبرکاتہ

باب نوزدہم

سائنسدانوں کے مشاہدات و تجزیات

حسبِ معمول عُویم کلاس شروع ہونے سے پہلے لیپ ٹاپ کھولے ہوئے کمرے میں اکیلے بیٹھا تھا اور وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ جیسے ہی مقررہ وقت پہنچا عبد الاحد صاحب سکرین پر نمودار ہوئے اور مخصوص انداز میں سلام و دعا کیا۔ اسی دوران عُویم نے اپنی اسائنمنٹ اپنے سامنے رکھ دی تاکہ جیسے ہی اجازت ملے اسے بیان کیا جائے۔ پچھلے کلاس میں استاد نے سائنسدانوں کے مشاہدات اور تجزیات بیان کرنے کا اسائنمنٹ دیا تھا۔

تو پیارے سامعین! آج آپ تمام اساتذہ بنیں گے اور میں شاگرد۔ آج آپ سنائیں گے اور میں سنوں گا۔ امید ہے ہر ایک نے ہوم ورک پہ کام کیا ہو گا۔ بس اب ایک ایک کر کے اپنا ہوم ورک سناتے جائیں۔ ہم خوب دلجمعی کے ساتھ سنیں گے۔ ناموں کے حروفِ تہجی کے ترتیب سے اپنی اپنی باری لیں۔ لیکن آپ کے شروع ہونے سے پہلے میں فزکس کی دنیا سے ایک بڑے جرمن سائنسدان وارنر ہیزن برگ (Warner Heisenberg) جو کہ کوانٹم فزکس کا بڑا نام ہے اور 1932ء کا نوبل انعام یافتہ بھی ہے اس کا قول سنانا چاہتا ہوں وہ کہتا ہے "فطری سائنسز کے جام سے پہلا گھونٹ آپکو دہریت (الحاد) کی طرف لے جائے گا لیکن جام کے اختتام پر خدا آپ کا انتظار کر رہا ہے"۔ مزید گفتگو میں کلاس کے آخر میں کروں گا۔ اب آپکی باری شروع ہوئی ہے۔۔۔۔بسم اللہ۔۔۔شروع کیجئے۔

طلباء و طالبات میں جس کے بولنے کی باری آتی۔ کلاس ماڈریٹر (Moderator) اس کا مائیک کھول دیتا۔ اسی طرح ہر ایک نے اپنے اپنے اقتباسات جو انہوں نے سائنسدانوں کے تجزیات و مشاہدات سے اخذ کئے تھے بیان کرنے شروع کئے۔

کینیڈا کے پروفیسر ڈاکٹر فرینک ایلن لکھتے ہیں کہ:

کائنات کے موجود ہونے کی کوئی نہ کوئی توجیہہ پیش کرنی پڑتی ہے۔ کیونکہ کائنات ایک وجود رکھتی ہے اور ایسی وجود کا تقاضا ہے کہ اس کی وجہ معلوم ہو۔ لہٰذا عام طور پر چار توجیہات پیش کی جاتی ہیں۔

1. ایک یہ کہ دنیا کا وجود محض ایک فریب نظر اور ایک وہم ہے اسکی اصل حقیقت کچھ بھی نہیں۔
2. دوسری یہ کہ یہ کائنات ازخود عدم سے وجود میں آگئی ہے۔
3. تیسری یہ کہ یہ ازلی وابدی (باصطلاح فلسفہ "قدیم") ہے۔اس کا کوئی آغاز و انجام نہیں ہے۔
4. چہارم یہ کہ ایک خالق کی شاہکار ہے۔

پہلی توجیہہ کو اگر تسلیم کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ یہاں انسانی شعور کے لئے طبیعی تعبیر کوئی حل طلب مسئلہ ہی نہیں۔ لہٰذا یہ توجیہہ بذات خود ایک واہمہ قرار دیا جا چکا ہے۔

دوسرا تصور یہ کہ مادے اور توانائی کی یہ دنیا ازخود پردۂ عدم سے وجود میں آگئی ہے یہ بھی اسی طرح ایک ایسا لغو مفروضہ ہے جسے کسی طرح قابل غور نہیں قرار دیا جا سکتا۔

تیسرا خیال یہ کہ کائنات ازلی وابدی ہے۔ یہ نظریہ تخلیق سے کم از کم اس پہلو سے میل کھاتا ہے کہ یا تو یہ جامد مادہ اپنی مستور توانائی کے ساتھ ازلی وابدی وجود رکھتی ہے یا پھر اس کے خالق کی ذات ازلی و ابدی ہے۔ اس پہلو سے ان دونوں تصورات کے دلائل بھی

تقریباً یکساں ہیں۔ لیکن حرکیات حرارت(thermodynamics) کے قوانین سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کائنات بتدریج انحطاط پذیر ہے اور ایک وقت آنے والا ہے جب تمام موجودات اپنی تمام حرارت کھو بیٹھیں گی توانائی و قوت فنا ہو جائے گی اور زندگی ناممکن ہو جائے گی۔

لٰہذا صرف یہ چوتھی توجیہہ رہ جاتی ہے جو کہ قرینِ قیاس ہے۔ اور دلیل پر مبنی ہے۔

یہ دہکتا ہوا سورج، یہ جھلملاتے ہوئے تارے اور زندگی کے ہنگاموں سے بھرپور یہ زمین اس حقیقت کے جامع شواہد ہیں کہ اس کائنات کا کوئی نہ کوئی نقطہ آغاز ضرور ہے اور ایک معین و مقرر ساعت میں یہ کائنات وجود میں آئی ہے اور یہی حقیقت اس اَمر کی طرف رہنمائی کرتی ہے کہ یہ کائنات خود بخود وجود میں نہیں آئی بلکہ یہ کسی قوتِ تخلیق کا کرشمہ ہے۔ یہ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ علتِ اولیٰ کی حیثیت سے ایک ازلی و ابدی ذات اور ایک علیم و قدیر ہستی کا وجود لازماً ہونا چاہیئے جس نے اس کائنات کو پیراہن وجود بخشا اور اس کی صورت گری کی۔

ڈاکٹر میرٹ سٹینلے کان ڈان کے آرٹیکل کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

کائنات میں موجود ہر ایک شے میں خواہ وہ چھوٹی سطح پر ہو یا بڑی سطح پر ایک مخصوص قسم کی یکسانیت اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ان کے نظم کو چلانے کے لئے فطری قوانین کے ہونے اور اس کے ماننے کے سوا ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں۔ خواہ ہم اس کا براہِ راست کوئی مشاہدہ کریں یا نہ کریں۔ جیسا کہ سالمے کے اجزائے ترکیبی کا آج تک ہم براہِ راست مشاہدہ نہ کر سکے لیکن اس کے باوجود اُن کے ان غیر مرئی اجزائے ترکیبی کی ہئیت اور ان کے اثرات کے بارے میں ہمارے نظریات ایٹم بم کے عملی تجربے سے بالکل صحیح ثابت ہو چکے ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ چاہے مختلف غیر مرئی ذرات سے وجود پانے والا ایک سالمہ ہو یا ان گنت اجرام فلکی پر مشتمل کہکشاں ہو جو اگرچہ دیکھی جا سکتی ہو لیکن اس تک رسائی ممکن نہ ہو، دونوں کا حسابی عمل کے ذریعے تجزیہ ممکن ہے اور تجربات سے اخذ شدہ نتائج کے بل پر

اس حسابی عمل کی منطقی طور پر تصدیق و تصویب بھی کی جا سکتی ہے۔ کائنات کے اس ڈھانچے کے مختلف اجزاء میں ایسی مناسبت اور ہم وجودیت پائی جاتی ہے جس کے اجتماع و اشتراک کی بنیاد پر ایک وحدت تشکیل ہوتی ہے۔ اس لئے ناگزیر ہے کہ مابعد الطبیعیات اور مافوق الفطرت نظام کا سہارا لیا جائے اور اس کائنات میں یک رنگی اور ہم آہنگی کو اس مافوق الفطرت نظام اور طاقت کی کارفرمائی قرار دی جائے۔

میں نے اپنے شاگردوں سے اکثر یہ سوال کیا ہے کہ وہ مجھے ۔"خیال" کا کیمیائی تجزیہ کرکے اس کے اجزائے ترکیبی بتائیں، اس کی لمبائی ناپیں، اس کا صحیح صحیح وزن نکالیں، اس کا رنگ اس کی شکل و صورت ، اس کے مضمرات اور اس کی وسعتیں، اس کا میدانِ کار اور اس کا محل وقوع یا اس کی رفتارِ حرکت اور اس کی سمت کا تعین کریں لیکن وہ ایسا کچھ پیش کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جسے محض ایک مذاق سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اگر نظام کائنات میں مادہ اور اس کو ضبط میں رکھنے والی ایک کارفرما روحانی اور مافوق الطبیعیاتی قوت کا وجود نہ تسلیم کیا جائے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی ذہن اور اس کی قوتِ متخیلہ کی حقیقت پر کبھی سنجیدگی سے سوچا ہی نہیں گیا۔ اگر دنیا کو محض مادے کے ارتقائی عمل کا کرشمہ اور "خیال" کو خالصتاً ایک مادی جوہر قرار دینے پر اصرار کیا جائے تو پھر ہم یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ "خیال" یا "ذہن" کا مادی اصطلاحات میں ایک خاکہ پیش کیا جائے اور یہ وہ کام ہے جو آج تک نہ کوئی کر سکا اور نہ آئندہ کسی کے بس کی بات ہے۔

عقل و شعور کی اس دنیا میں جہاں ہر چیز پر عقل و حکمت کی حکمرانی ہے ہمیں یہ ماننے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیئے کہ اس مادی دنیا سے ماوراء عالمِ آفاق میں بھی اس طرح شعور وادراک کی حکمرانی ہونی چاہیئے۔ یہ کاربن ڈائی اکسائیڈ کا نظام، یہ پانی کا نظام، یہ حیرت انگیز

حیاتیاتی عمل، یہ زمین پر آفتابی حرارت کا انجذابی عمل جو یہاں زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے انتہائی ضروری اور ناگزیر ہے اور اسی طرح بے شمار دوسرے انتظامات اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتے ہیں کہ اس کے پیچھے بھی ضرور کوئی ایسی حکمت اور کوئی ایسا دماغ کار فرما ہے جو ان انتظامات کو حسن و خوبی سے چلا رہا ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ یکسانیت، عمومیت، باہمی تعامل، بقاء و تحفظ اور توازن واعتدال کے فطری ضوابط اس ہر لمحہ تغیر پذیر کائنات میں قرن ہا قرن قائم و برقرار چلتے چلے آئیں اور ان تمام ضوابط پر کائنات کے ہر گوشہ میں عمل بھی ہوتا رہے لیکن یہ سب کچھ کسی محسوس کار فرما قوت و ہستی کے بغیر ہو۔ ایک ایسے حکیم وقدیر خالق کے بغیر جو اپنے ہی تخلیق کردہ کائنات میں اپنے ہی تخلیق کردہ عناصر و عوامل سے کام لے کر نظم جہاں کو قائم و دائم رکھے ہوئے ہو ؟ بالکل بھی ناممکن ہے۔اس کے پیچھے ضرور حکیم وقدیر خالق کا ہاتھ ہے۔

اس عجیب وپراسرار اور پیہم متحرک و رواں کائنات میں آج تک ایسے کوئی حقائق سامنے نہیں آسکے جو اس حسن ورعنائی سے بھرپور کائنات کے پسِ پردہ زمان و مکان کی تمام حدود و قیود سے آزاد ہستی۔۔۔۔۔۔خُدا۔۔۔۔۔کے تصور کی کسی درجے میں نفی کرتے ہو بلکہ اس کے برعکس جب اس عالم طبیعیات کی معلومات کا ہم سائنسدان پوری توجہ و احتیاط سے تجزیہ و تحلیل کرتے ہیں تو ہم اس غیر مرئی ذات کے مظاہرِ قدرت اور اس کے دستِ قدرت کی کارِ فرمائیاں چہار طرف دیکھتے ہیں۔ جسے محض سائنسی طریقِ تجسس سے تلاش کرنا بے سود ہے لیکن جس نے انسان کی تخلیق کرکے خود کو بڑی حد تک بے نقاب اور نمایاں کر دیا ہے اس کا وجود سائنس کا محتاج نہیں۔ سائنس کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ خدا کے مظاہر قدرت کے مطالعے اور مشاہدے کا دوسرا نام ہے۔

ماہر ریاضی و کیمیاءڈاکٹر جان کلیوی لینڈ کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

دنیا کے نامور ماہرین طبیعیات میں سے ایک ممتاز شخصیت لارڈ کیلون کا ایک بڑا معرکۃ الآراء قول ہے کہ "آپ جتنا زیادہ غور و فکر سے کام لیں گے اتنا ہی سائنس آپ کو خدا کے ماننے پر مجبور کرے گی"۔ مجھے اس قول سے سو فیصد اتفاق ہے۔

گزشتہ صدی میں علمِ کیمیاء سمیت تمام علوم طبیعی میں جو ترقی ہوئی ہے اس کی بنیاد ہی مادہ اور توانائی کے اس مطالعے اور تحقیق پر ہے جو سائنٹیفک طریقوں سے کی گئ ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جہاں تک اس مطالعہ و تحقیق کے تجرباتی پہلو کا تعلق ہے اس میں ہر ممکن طریقے سے یہ کوشش کی جاتی ہے کہ ان تجربات سے حاصل ہونے والے نتائج میں اتفاقات کا کوئی امکان باقی نہ رہنے دیا جائے۔ اگر مادہ اور توانائی کے عمل میں کوئی نظم اور کوئی ضابطہ نہ ہوتا اور اس عالم مادہ و توانائی پر محض اتفاقات کی حکمرانی ہوتی تو ماہرینِ کیمیاء کبھی اتنے یقین سے یہ نہ کہہ سکتے کہ فلاں حالات میں فلاں طریق عمل سے لازماً فلاں نتیجہ برآمد ہوگا۔ جب کسی ضابطہ فطرت کے بارے میں یہ تفصیلات بھی معلوم ہو جاتی ہیں کہ اس کی علت وجود اور اس کا طریقہ عمل کیا ہے تو پھر گویا اس بات کا کوئی بعید ترین امکان بھی باقی نہیں رہتا کہ یہ کائنات اتفاقات کا کرشمہ ہے۔ کوئی بھی باخبر اور استدلالی ذہن یہ باور نہیں کرا سکتا کہ یہ کائنات از خود وجود میں آگئی ہے اور بلا کسی کارفرما قوت کے خود بخود ایک نظام میں ڈھل گئی ہے اور محض اتفاق سے اس نظام کی پابندیاں بھی شروع ہو گئی ہیں۔

اب اس بات کو لیجئے کہ اگر یہ عالم مادی از خود وجود میں نہیں آسکتا اور اگر اس وجود کو برقرار رکھنے کے لئے ایسے ہمہ گیر اور دائمی قوانین بھی از خود وضع نہیں کر سکتا۔ تو پھر یہ کارنامہ یقیناً کسی غیر مادی وجود اور ہستی ہی نے انجام دیا ہے جو عقل کُل رکھتا ہے اور علیم و حکیم ہے اور قادر مطلق ہے اور اس کارخانۂ عالم کے نظم کو قائم و دائم رکھ سکتا ہے۔

اور جو حاضر وناظر ہے۔ ہر جگہ موجود اور ہر چیز پر نگران ہے۔ یعنی ہم یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ خدا ہے اور وہی اس کائنات کا خالق، مالک، ناظم اور مقتدر اعلیٰ ہے۔

ماہر ریاضیات وطبیعیات ڈونلڈ ہنری پورٹر کا تجزیہ آپ کے سامنے ہے۔

علمِ طبیعیات میں مختلف مسائل پر تحقیق و تجسّس اس بنیاد پر ہوتی ہے کہ یہ "کیسے ہوا" لیکن آج تک علم طبیعیات اپنی ساری ترقیوں کے باوجود یہ بتانے سے قاصر ہے کہ یہ "کیوں ہوا"۔ کیسے کے جواب میں جو کچھ کہا جاتا ہے وہ انسان کو حقیقت کے آس پاس پہنچا دیتا ہے۔ مثلاً یہ بات کہ دو وجود کس طرح ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں، نیوٹن کے شہرہ آفاق قانون "کشش ثقل" میں واضح کر دی گئی۔ لیکن اس بات کی وضاحت کوئی نہیں کر سکا کہ دو وجود ایک دوسرے کو اپنی طرف کیوں کھینچتے ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں تو اس کائنات اور اس کے مظاہر میں خدا کے دستِ قدرت کی کار فرمائی کو تسلیم کرتا ہوں کیونکہ میرے نزدیک عقل و منطق کا یہی تقاضہ ہے۔ آپ فطرت کے قوانین کے بارے میں جو رائے بھی قائم کریں اور اس کائنات کی جو اساس و بنیاد بھی متعین کریں ایک سائنسدان کی حیثیت سے میرے نزدیک وہ تصور اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس میں ناظم و محرک کی حیثیت سے خدا کے وجود کو تسلیم نہ کیا جائے۔ یہ خدا ہی کی قدرت ہے جو اس کائنات کی ہر شے میں جلوہ گر نظر آتی ہے اور ان تمام سوالات کا واحد جواب بن جاتی ہے جن کا ہم کوئی جواب دینے سے قاصر ہیں۔

ماہر حیوانات وحشرات ڈاکٹر ایڈورڈ لوتھر کیسل لکھتے ہیں۔

قریب کے زمانے میں سائنسی تحقیقات نے تصور وجود باری تعالیٰ کے روایتی فلسفیانہ دلائل میں نئے دلائل وشواہد کا اضافہ کیا ہے۔ ان شواہد نے اس کارخانۂ عالم کے لئے ایک خالق کی ضرورت کو ناگزیر حقیقت ثابت کیا ہے۔ سائنس اصل میں کارخانۂ قدرت کے نظام

کی تفصیلات سے بحث کرتی ہے اوراس بات کو نظر انداز کرتی ہے کہ اس کارخانۂ قدرت کو بنایااور چلایا کس نے ہے؟ لیکن غیر ارادی طور پر سائنس کی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس کائنات کا کوئی نہ کوئی نقطۂ آغاز ضرور ہے۔ اگر یہ ثابت ہو جائے تو پھر خدا کا وجود آپ سے آپ ثابت ہو جاتا ہے کیونکہ ہر وہ چیز جو اپنی ذات میں ازلی نہیں ہے اسکا وجود یقیناً کسی محرک اول اور کسی خالق یعنی خدا کے کرشمۂ قدرت کا رہینِ منت ہے۔ جو لوگ سائنس کی تحقیقات کو کوئی وزن دیتے ہیں وہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ یہ کائنات تخلیق کی گئی ہے۔اور یہ عملِ تخلیق لگے بندھے قوانین فطرت سے ماوراء کسی طاقت کا کرشمہ ہے کیونکہ یہ قوانین فطرت بھی تو خود کسی کی تخلیق کا نتیجہ ہے۔اسی ذات خالق کو ہم خدا کہتے ہیں۔ لہٰذا اگر کھلے دل ودماغ کے ساتھ سائنس کا مطالعہ کیا جائے تو آدمی کے لئے خدا پر ایمان لانے کے سوااور کوئی چارہ کار باقی ہی نہیں رہتا۔

ڈاکٹر والٹر آسکر لُنڈبَرگ جو کہ ماہر عضویات وحیاتی کیمیاء ہے کا تجزیہ ہے۔

کہ ایسے لوگ جن کی عمریں سائنسی تحقیقات و تجسس میں گزرتی ہیں وہ خدا کے وجود کو دوسروں کی نسبت زیادہ آسانی سے سمجھ سکتے ہیں بشرطیکہ وہ اس کی طرف توجہ دیں۔ابھی تک سائنس نے انسان کو خدا کی عظمت وبزرگی کی ایک ادنیٰ سی جھلک دکھائی ہے۔ انسان ابھی عقلی طور پر وجود باری اور مظاہر فطرت کا بہت محدود سا ادراک کر سکا ہے۔وہ مجبور ہے کہ روحانی اور وجدانی طور پر ہی خدا پر ایمان لائے۔ انسانی زندگی میں خدائی ذات پر ایمان انسان کے لئے سرمایہ راحت وسکون ہوتا ہے۔ ایک ایسے سائنسدان کے لئے جو خدا کے وجود پر ایمان رکھتا ہو ہر نیا مشاہدہ اور تجربہ اس کے ایمان میں تازگی اوراس کے روح کو فرحت بخشتا ہے کیونکہ اس کا ہر مشاہدہ اوراسکی ہر تحقیق اس کے سامنے وجود باری تعالیٰ کی اہمیت وحقیقت کو واضح سے واضح تر کرتی چلی جاتی ہے۔

ڈاکٹر پال کلیرنس ایبر سولڈ کے آرٹیکل سے اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

انسان اپنی ساری ذہانت اور نت نئے وسائل و ذرائع کے باوجود اپنے آپ کو ہر لحاظ سے مکمل اور آزاد محسوس نہیں کرتا۔ مختلف رنگ و نسل عقائد اور ممالک کے لوگوں کا تاریخ کے ہر دور میں یہ احساس عالمگیر اور یکساں رہا ہے کہ اس وسیع وبسیط کائنات کو سمجھنے اور اسکی بناوٹ تک پہنچنے کے لئے اُن کا علم اور اُن کا قوتِ بیان قاصر ہے۔ انسان عالمگیر طور پر ان حقائق کی دریافت کی خود ضرورت محسوس کرتا ہے جو اس کے فہم وادراک سے ماوراء ہیں۔ یہ بذاتِ خود اس امر کی ایک بیّن دلیل ہے کہ ایک عقلِ کُل اور ایک مدبر و بے مثل ذات اس کارخانۂ رنگ وبو کے پیچھے کارفرما ہے۔

ماہر عضویات مارلن بکس کریدر کا تجزیہ آپ کے سامنے ہے۔

میرا ایمان ہے کہ خدا ہے۔ نہ صرف ایک عام انسان کی حیثیت سے بلکہ ایک سائنسدان کی حیثیت سے بھی جس کی ساری عمر سائنس کے مطالعہ و تحقیق میں گزری ہے۔ مجھے خدا کے وجود کے بارے میں ذرہ برابر بھی کوئی شک وشبہ نہیں۔

وجودِ باری کو دو اور دو چار کی طرح ثابت نہیں کیا جاسکتا اور نہ کسی عمل ہی سے اس کی ذات کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ ایک غیر مادی وجود ہے وہ ایک ایسی قوت ہے جو حکمت ودانائی، روحانیت، تخلیق اور ربوبیت کی جملہ صفات سے بدرجہ کمال آراستہ ہے۔ اگرچہ اس کے وجود کے اثبات کے لئے عام سائنسی طریق استدلال چنداں بارآور ثابت نہیں ہوتا لیکن مظاہرِ قدرت اور خود انسانی فطرت کی بُو قلمونیاں صبح سے شام تک لا تعداد شہادتیں پیش کرتی ہیں کہ یہ کارخانۂ ہست وبُود الل ٹپ اور از خود وجود میں نہیں آگیا۔ اسکے پیچھے کوئی کارفرما قوت اور کوئی حکیم مدبّر ضرور موجود ہے۔ یہ ساری شہادتیں بہت واضح لگتی ہیں۔

یہاں یہ ذکر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے نظریات اور سائنسی حقائق جن کے بارے میں لوگوں کا خیال یہ ہے کہ وہ واقعی صحیح ہیں، درحقیقت وہ بھی ثابت شدہ حقائق

نہیں۔ ان میں سے بہت سے ایسے حقائق ہیں جو بجائے خود مسلّمہ یا کلّیہ کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ حقیقت کی طرف صرف رہنمائی کرتے ہیں۔ اسکی مثال بالکل ایسی ہے کہ جیسے آپ نے اپنے گھر کے پچھلے دروازے سے کسی کو بھاگتے دیکھا اور جب گھر میں داخل ہوئے تو گھر لُٹا ہوا پایا۔ اب اگرچہ آپ کے پاس اس بات کا کوئی واضح ثبوت نہیں کہ چوری اسی ہی شخص نے کی ہے جو بھاگ رہا تھا لیکن مختلف مشاہدات آپ کے اس خیال کو تقویت پہنچاتے ہیں اور مجسٹریٹ فردِ جرم عائد کرنے سے پہلے اسی ہی شہادت کو جانچ پرکھ کر کوئی فیصلہ کرتا ہے۔

مزید بر آں ہر حقیقت کی توضیح و تشریح اور اسکی تحقیق و تصدیق کے لئے سائنسی طریق استدلال کافی بھی نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر محبت کو لیجئے۔ یہ انسانی جذبات میں سب سے زیادہ مؤثر طاقت ہے۔ لیکن اگر آپ سائنس کی زبان میں اسکا تجزیہ کرنے کی کوشش کریں یا اسکے وجود کو سائنسی طریق استدلال سے ثابت کرنا چاہے تو آپ اس میں قطعاً کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ یہی صورت حسن یا نغمے کی ہے کہ اگر ایک شخص آپ سے اسکی حقیقت کو سمجھنا چاہے تو آپ اسے کچھ نہیں بتا سکتے کہ حسن یا نغمہ کی صحیح تعریف کیا ہے۔ اسی بناء پر ان کے وجود سے انکار کی ہمت بھی نہیں کی جا سکتی۔ بالکل یہی معاملہ ذات باری کے وجود کا بھی ہے کہ اسکے دلائل و شواہد بھی عقل و سائنس کے میدان میں بعض دوسرے مسلّمات کے دلائل و شواہد سے زیادہ قرینِ عقل اور وزنی ہیں لیکن ہستیءباری تعالیٰ کے اثبات و نفی دونوں کے لئے دو اور دو چار کی طرح کوئی حتمی و قطعی ثبوت پیش کرنا ممکن نہیں۔

بھلائی اسی میں ہے کہ ہم اس محدود عقل و فہم پر اتنا انحصار نہ کریں کہ جو چیز ہمارے فہم و ادراک میں آئے اسے تو ہم معقول قرار دیں اور جہاں ہمارے فہم و ادراک کی رسائی نہ ہوتی ہو اسے ناقابلِ یقین اور غیر معقول قرار دے کر اس سے انکار کر بیٹھیں۔ میرا تو یہی

عقیدہ اور یہی ایمان ہے اور یہ کوئی اندھا عقیدہ نہیں۔ بلکہ میں نے دلیل سے اس کو اپنایا ہے۔

ماہر طبیعیات وکیمیاء ڈاکٹر آسکر لیو برائر لکھتے ہیں کہ

علم الاصنام کے مطالعے سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ انسانی روح میں ایک ایسا احساس ضرور موجود ہے جو انسان کو بار بار اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ اُسے اور کائنات کو پیدا کرنے والی ذات ایک مافوق الفطرت ہستی ہے۔ جب ہم کائنات کے اس وسیع اور پیچیدہ طلسم پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں جس میں بے شمار سیارے اور ستارے شامل ہیں اور یہ سب قوانین طبیعی کے پابند ہیں تو ہماری عقل یہ باور نہیں کرتی کہ یہ سب کچھ خالقِ کائنات کے بغیر ہو رہا ہے۔ ہمیں اپنے اُن اشتراکی دوستوں پر سخت تعجب ہوتا ہے جو خدائے واحد پر ایمان نہیں رکھتے۔ ہمیں ان لوگوں کی عقل پر بھی حیرت ہوتی ہے جو اپنے آپ کو تعلیم یافتہ کہلانے کے باوجود ذات باری تعالیٰ کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے۔

ڈاکٹر اروِنگ ولیم نابلاخ جو کہ علوم طبیعی کا ماہر ہے اس کے آرٹیکل سے اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

یہ بات اپنی جگہ مسلّم ہے کہ سارے سائنسدان سائنس کو ایک ایسا ہمہ گیر علم نہیں سمجھتے جس سے سارے مسائل حل کئے جا سکیں۔ سائنس صداقت، حسن اور مسرت کا پوری طرح احاطہ نہیں کر سکتی۔ سائنس زندگی کی بھی کوئی تسلی بخش تعبیر نہیں کر سکتی اور نہ اس سے زندگی کا مقصد ہی متعین ہو سکتا ہے۔ پھر اس کے ذریعے ہم اس بات کا بھی کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکتے کہ کیا خدا موجود ہے یا نہیں۔

سائنس ہر وقت اپنے نظریات میں تبدیلی کرتی رہتی ہے۔ یہ اس امر کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتی ہے کہ حق وصداقت کی تلاش کرے لیکن چند قدم اٹھانے کے بعد اسے یہ

محسوس ہوتا ہے کہ اس کے سعی وجد وجہد محض حکایتِ تشنہ وسراب ہے۔ اس کائنات کے بارے میں ہمارے احساسات اور معلومات کا سرچشمہ ہمارے محدود حواس ہیں جو چند منزلیں طے کر جانے کے بعد اپنی بے بسی کا اعتراف کر لیتے ہیں۔ ایک امریکی طبیب نے ایک دفعہ یہ کہا "جوں جوں علم ترقی کرتا ہے اسی رفتار سے سائنس کا مذہب پر ترجیح ختم ہوتی چلی جاتی ہے۔ سائنس سے اگر صحیح کام لیا جائے تو انسان خود بخود خدا پر ایمان لے آتا ہے"۔

یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ جوں جوں سائنس کو ترقی ہو گی اسی نسبت سے مذہب کا مؤقف مضبوط ہوتا چلا جائے گا۔ مجھے خدا پر پختہ یقین ہے۔ میں اس غیر متزلزل عقیدے پر ایمان رکھتا ہوں کیونکہ میں اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہوں کہ مثبت اور منفی برقیے (Positive and Nagative Charges)، ابتدائی ذرات، پہلا نُغرِ مایہ، اولین بیج یا سب سے پہلا دماغ یونہی کسی بخت واتفاق سے پیدا نہیں ہو گئے۔ میں خدا کو اس لئے مانتا ہوں کیونکہ اس ذات کے ذریعے ہی اس کائنات کی صحیح اور معقول توجیہہ ممکن ہے۔

ماہر اراضیاتی کیمیاء ڈونلڈ رابرٹ کار لکھتے ہیں کہ

طبقاتِ ارض کے کیمیاوی مطالعے نے مجھے یہ ماننے پر مجبور کر دیا کہ خدا تعالیٰ ہی نے یہ کائنات بنائی۔ اس مطالعے نے اور بھی بہت سے شواہد سے مجھے روشناس کیا۔ اب اگر میں فطرت میں خدا کے ہاتھ کی گلکاریاں دیکھتا ہوں تو یہ ایک قدرتی اور فطرتی امر ہے۔

ماہر حیاتیات البرٹ میکومبس ونچسٹر اپنے آرٹیکل "سائنس نے میرے عقیدے کو مضبوط کیا" میں رقمطراز ہے کہ

سائنس کا مطالعہ خداوند تعالیٰ کی عظمت اور قدرت کے متعلق گہری بصیرت پیدا کر دیتا ہے اور یہ بصیرت ہر انکشاف کے ساتھ مضبوط ہو جاتی ہے۔ وہ دن مجھے اچھی طرح یاد

ہے جب میں نے پہلی مرتبہ ایک کالج کے طالب علم کی حیثیت سے سائنس کے میدان میں اُترنے کا فیصلہ کیا تو میری ایک خالہ نے مجھے ایک طرف لے جاکر بڑی سنجیدگی سے ارادہ بدلنے کے لئے فرمائش کی کیونکہ انکا خیال تھا کہ سائنس کی تعلیم خدا کے اعتقاد کو ختم کر دے گی۔ ان کے لئے اور بہت سے دوسروں لوگوں کے لیے سائنس اور مذہب دو متضاد طاقتیں تھیں۔ ایک کو حاصل کرنا گویا دوسرے کو رخصت کر دینے کے مترادف تھا۔ لیکن آج میں بڑی مسرت کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ ایک طویل مدت تک سائنس کا مطالعہ کرنے اوراس میدان میں کام کرنے کے باوجود ذاتِ باری پر میرا اعتقاد کمزور ہونے کی بجائے اورزیادہ پختہ ہو گیاہے اوراس کی بنیادیں بہت مستحکم ہو چکی ہیں۔

کیمیاوی انجنیئر اولن کیرول کالکلٹس کے آرٹیکل سے ایک اقتباس پیش خدمت ہے۔
انسانی زندگی کی تمام مدت میں انسان کے ذہن میں تین اہم سوالات آتے رہتے ہیں۔

1. میں کہاں سے آیاہوں؟
2. میں یہاں کیوں آیاہوں؟
3. میں اب کہاں چلا جاؤں گا؟

الہیات اورمابعد الطبیعیات کی سینکڑوں کتابوں نے ان سوالات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ زندگی کا یہ معمہ ایک بہت پرانا مسئلہ ہے۔ ان سوالوں کے جواب کے لئے خداپرستی ہی ایک معقول ذہن کے لئے سب سے زیادہ اطمینان بخش جواب ہے۔ یہ نظریہ مظاہرِ حقیقت کی تمام دوسرے نظریات کے مقابلے میں زیادہ بہتر توجیہہ کرتا ہے۔

محقق کیمیا ایڈمنڈ کارل کورن فیلڈ لکھتے ہیں کہ
انسان کی بنائی ہوئی معمولی مشین کے لئے بھی ایک بنانے والے کی ضرورت ہوتی ہے پھر یہ دس ہزار گنا زیادہ پیچیدہ مشین (زندہ اجسام) کس طرح خود بخود بن سکتی ہے۔ کم از کم

میری سمجھ میں تو یہ بات آتی نہیں۔ایک ایسے شخص کے لئے جس نے حیرت انگیز پیچید گیوں کو دیکھا ہو اور پھر وہ نامیاتی کیمیاء میں تنظیم بھی پاتا ہو خصوصاً ذی حیات اشیاء میں، اس کے لئے اتفاق کے نظریے کو قبول کر لینا کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ جتنا کوئی شخص سالمے کی ساخت کا سائنسی مطالعہ کرتا ہے اوراس کے ردِ عمل پر غور کرتا ہے اتنا ہی وہ اس چیز کی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ وہ کسی اعلیٰ مدبر اور عظیم خالق کے وجود پر ایمان لے آئے۔ میں جس قدر اپنے کام میں آگے بڑھتا جاتا ہوں، میرا خدا کی ذات پر اعتقاد پختہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

ماہر ریاضی وطبیعیات ارل چیسٹر ریکس کا بیان ہے کہ

اگر ہم صرف شہد کی مکھیوں کے چھتے کو غور سے دیکھیں تو دیگر سینکڑوں چیزوں کی طرح ان میں تناسب، یکسانیت اور مکمل انتظام نظر آئے گا۔ دنیا کے لاکھوں شہد کے چھتوں میں سے ہر ایک اصول ہندسہ پر بنایا جاتا ہے اور انتہائی باقاعدہ ہوتا ہے۔ اگر یہ اور بہت سی اس قسم کی چیزیں ایک خالق کی ذہانت، تدبر اور رہنمائی کا ثبوت فراہم نہیں کرتیں تو میں اپنے ایک سائنسدان ہونے کے دعوے کو واپس لیتا ہوں۔

عبد الاحد صاحب اپنے شاگردوں کے سامنے شاگرد بنے بیٹھے تھے اور خوب توجہ کے ساتھ ان کے لیکچرز سن رہے تھے ، دوسری طرف عُویم بھی ہمہ تن گوش بنا ہوا تھا اور کلاس میں اہم اہم پوائنٹس نوٹ کر رہا تھا۔ جب تمام طلباء اپنی اپنی باری لے چکے تو کلاس میں چند لمحوں کے لئے خاموشی چھا گئی جس کو کلاس ماڈریٹر نے توڑا اور عبد الاحد صاحب کا مائیک کھول دیا۔

بہت خوب، لاجواب، میرے پیارو! آپ کے اسائنمنٹس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ انتہائی محبت اور لگاؤ کے ساتھ آپ لوگوں نے ہوم ورک کیا ہے اور انتہائی منظم و متعین

انداز میں پیش کیا ہے جس میں بے جا مبالغے اور ضیاعِ وقت سے گریز کیا گیا ہے جو کہ قابل تحسین وستائش ہے۔ منزل ان کے لئے ہی اپنی باہیں پھیلاتی ہے جو تلاش میں مخلص اور سرگرم عمل ہوتے ہیں۔ آج آپ تمام حضرات نے یہی ثابت کر دیا ہے۔

اب میں آپ کی گفتگو پر اپنی رائے پیش کئے دیتا ہوں۔ سائنسدانوں کو اس کائنات کے مطالعے کے دوران کائنات ہی کے جو دو اہم پہلوؤں نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے اس میں پہلا پہلو نظم وترتیب کا ہے اور دوسرا کائنات اور کائنات میں موجود اشیاء کے پُرپیچ نظام کا۔ ان دونوں پوائنٹس پر بہت سے سائنسدانوں نے قلم اٹھائے ہیں اور خدا کے حضور سر تسلیم خم کئے ہیں۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ کائنات میں موجود نظم وترتیب اور اسکی پیچیدگی ایک ماورائے فطرت ہستی کی طرف سب سے بڑا اشارہ ہے۔ اس انتہائی پیچیدہ نظام کا بنانا پھر اس کو انتہائی منظم انداز میں چلانا اور اس میں کمال کی نظم وترتیب وربط برقرار رکھنا ایک عام ذہن کا کام نہیں۔ اس کے پیچھے جو ذہن کارفرما ہے وہ ضرور انتہائی اعلیٰ وارفع اور ہر ایک خامی سے پاک ہے اور ہر لحاظ سے مکمل ہے جس میں کسی خامی اور کمی کی گنجائش ہی نہیں۔ اس اعلیٰ ذہن اور برتر ہستی کو اہل مذہب خدا کہتے ہیں جو کہ انتہائی مدبر اور عظیم ڈیزائنر وکنٹرولر ہے۔ سائنسدانوں کے اسی فلسفے کو آگے بڑھا کر یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے جو کہ بالکل عقل کے موافق ہے کہ جب پوری کائنات قوانین کے حدود میں بندھی ہوئی ہیں اور کائنات میں موجود ہر ایک چیز کے لئے ازلی قوانین موجود ہو سکتے ہیں تو اسی کائنات کی سب سے اہم مخلوق انسان بے قانون کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کی زندگی گزارنے کے لئے دستوُرالعمل کیوں نہیں ہو سکتا؟ ضرور ہو سکتا ہے اور ہے بھی۔ اسی دستور کو دین کہتے ہیں اور یہ دستور اپنے مخلوق کے لئے خالق نے عطا کیا ہے۔

ان دواہم نکات کے علاوہ سائنسدانوں نے اپنے ایجادات کے دوران اس بات کا اعتراف بھی کیا ہے کہ جس طرح ہمارے کئے ہوئے ہر ایجاد کا موجد موجود ہوتا ہے تو کیونکر

اتنی بڑی کائنات کا بنانے والا موجود نہ ہو۔ یہ ایک انتہائی خلاف عقل بات ہو گی کہ مخلوق کو مانا جائے اور خالق کا انکار کیا جائے۔ خالق ہے تبھی مخلوق کا ہونا ممکن ہو سکتا ہے۔ سائنسدان چھوٹی سی ایجاد بھی اگر کر دیتے ہیں تو اس پر اپنے نام کا لیبل لگا دیتے ہیں کہ فلاں نئے چیز کو فلاں سائنسدان نے بنا لیا تو کائنات پر خدائے بزرگ وبرتر کا لیبل لگانے میں کونسی دلیل مانع ہو سکتی ہے؟

ایک اور نکتہ جو اکثر سائنسدانوں نے بیان کیا ہے وہ یہ کہ اس کائنات کو عظیم منصوبہ سازی کے تحت بنایا گیا ہے۔ یہ کسی اتفاق اور حادثے کا نتیجہ نہیں ہے۔ اگر کائنات اتفاق کا نتیجہ ہوتا تو لیبارٹری میں ہونے والے تجربات میں ہر دفعہ نت نئے نتائج سامنے آتے کیونکہ اگر ایک دفعہ اتفاق کو مان لیا جائے تو کیا بعید کہ یہ اتفاق بار بار رونما ہو۔ لہٰذا اگر اتفاق کو مانا جائے تو ہو سکتا ہے کہ ایک دفعہ لیبارٹری میں پانی 100 ڈگری سینٹی گریڈ پر بھاپ میں تبدیل ہو جائے اور دوسری دفعہ اتفاق سے 80 سینٹی گریڈ پر۔ ان تجربات کے نتائج میں یکسانیت ختم ہو جاتی ہے اگر اتفاق کے قانون کو عملاً نافذ کیا جائے۔ جبکہ عملی و تجرباتی مشاہدہ اس کے برعکس ہے۔ یہ پوری کائنات عالمگیر قوانینِ فطرت کے تحت چل رہی ہے جو کہ ناقابل تغیر ہے۔ کششِ ثقل کا قانون پاکستان میں ہُو بہُو اُس جیسا ہے جیسا کہ ہندوستان میں ہے اور جیسا کہ اندُلس وصحرائے عرب میں ہے۔ اس میں پوری طرح یکسانیت ہے۔ یہی مثال باقی تمام قوانین فطرت کی بھی ہے۔

اسی دوران عبد الاحد صاحب نے ہلکا سا وقفہ لیا اور پانی پیا جس کے بعد دوبارہ گویا ہوئے۔

یہ تو وہ باتیں ہو گئیں جو سائنس اور سائنسدان خدا کے حق میں فرماتے ہیں۔ اب یہاں پر ناانصافی ہو گی اگر مذہب مخالف سائنسدانوں کا ذکر نہ کیا جائے۔ دنیا میں ایسے

سائنسدان بھی گزرے ہیں جو کہ خدا کو نہیں مانتے تھے لیکن ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے اور اکثر و بیشتر ان کو کہیں سے غلطی لگ جاتی ہے جس کو وہ عمر بھر ساتھ لئے پھرتے ہیں۔ یہ غلطی کہیں مشاہدے میں آجاتی ہے اور کہیں استدلال میں۔

مثال کے طور پر علمِ فلکیات کے ابتداء میں جب کم طاقت کی دوربینوں سے آسمان کا مشاہدہ کیا گیا تو بہت سے ایسے اجسام مشاہدے میں آئے جو پھیلے ہوئے نور کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔ اسی مشاہدے کی بناء پر یہ نظریہ قائم کیا گیا کہ یہ گیسی بادل (Gaseous Clouds) ہیں جو ستارے بننے سے پہلے کے مرحلے سے گزر رہے ہیں۔ مگر جب مزید طاقت کی دوربینیں تیار ہوئیں اور ان کے ذریعے از سرنو ان اجسام کو دیکھا گیا تو نظر آیا کہ جو چیز پہلے نورانی بادل کی شکل میں دکھائی دیتی تھی وہ دراصل بے شمار ستاروں کا مجموعہ تھا جو غیر معمولی دوری کی وجہ سے بادل کی مانند نظر آرہا تھا۔ اس کو کہتے ہیں مشاہدے کی غلطی۔

اب ذرا استدلال کی غلطی کا تجزیہ کریں۔

جنوری 1964 میں نئی دہلی میں مستشرقین کی ایک بین الاقوامی کانفرنس میں یہ دعویٰ کیا

گیا کہ قطب مینار، جو کہ قطب الدین ایبک کی طرف منسوب ہے، اس کو 2300 سال پہلے ہندو راجا سمندر گپت نے بنوایا تھا جسے بعد کے مسلم مؤرخین نے غلطی سے قطب مینار کے نام سے پیش کیا۔ اس دعوے کے لئے انہوں نے دلیل یہ فراہم کی کہ قطب مینار میں ایسے پتھر لگے ہوئے ہیں جو بہت پرانے ہیں اور قطب الدین ایبک سے بہت پہلے تراشے گئے تھے۔ بظاہر یہ ایک علمی استدلال ہے کیونکہ حقیقتاً قطب مینار میں ایسے پتھر موجود ہیں۔ مگر قطب مینار کے مطالعے کے لئے صرف اس کے پرانے پتھروں کا حوالہ دینے سے علمی استدلال کا حق ادا نہیں ہوتا۔ اسی کے ساتھ ساتھ اور بہت سے پہلوؤں کو سامنے رکھنا ضروری

ہوتا ہے اور جب ہم مکمل جائزہ لیتے ہیں تو پتھروں کی یہ توجیہہ قطب مینار پر پوری طرح چسپاں نہیں ہوتی۔ اس کی بجائے دوسری توجیہہ زیادہ قرینِ قیاس ہے کہ قطب مینار میں استعمال شدہ پرانے پتھر دراصل پرانی عمارتوں کے کھنڈرات سے حاصل کئے گئے تھے۔ جس طرح دوسری قدیم عمارتوں میں کثرت سے اس کی مثالیں موجود ہیں۔ لہٰذا جب اس دوسری توجیہہ کو قطب مینار کی ساخت، اسکے نقشہ تعمیر، پرانے پتھروں کا اندازِ تنصیب، مینار کے ساتھ ناتمام مسجد اور جوابی مینار کے بقیہ آثار نیز تاریخی شہادتوں کو ساتھ ملا کر دیکھیں تو ثابت ہو جاتا ہے کہ یہی دوسری توجیہہ صحیح ہے اور پہلی توجیہہ ایک مغالطے کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس مثال سے ثابت ہوتا ہے کہ استدلال کی چھوٹی سی غلطی کیا کیا گُل کھلاتی ہے۔

چون گذارد خشتِ اول بر زمین معمار کج
گر رساند برفلک ، باشد همان دیوار کج *

اس مثال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر کسی واقعے کے یک رخی جائزے کی بنیاد پر یا مکمل علم نہ ہونے پر مقدمہ بنایا جائے تو اس میں غلطی کے کافی مواقع موجود ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس صورت میں جز کا اطلاق کُل پر کیا جاتا ہے۔ جبکہ اس کے دوسری طرف تمام اہل علم اور سائنسدان اس حقیقت سے باخبر ہے اور اعتراف بھی کرتے ہیں کہ ہمیں جو علم حاصل ہے وہ پورے علم کے مقابلے میں انتہائی کم ہے۔ پورا علم اگر ایک بحر ہے تو انسان کو معلوم علم ایک قطرے کی مانند ہے۔

اب ذرا مذہب مخالف سائنسدانوں کا ذکر چھیڑتے ہیں۔

---

* ترجمہ: جب معمار زمین پر پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھ لیتا ہے ــــ تو وہ اس دیوار کو اگر آسمان تک پہنچائے۔ دیوار ٹیڑھی ہی رہتی ہے۔

اس ضمن ایک سائنسدان و ماہر عضویات ڈاکٹر انڈریو کانوے کا ایک اقتباس آپ لوگوں کے سامنے رکھتا ہوں۔ وہ اپنا ایک واقعہ سناتے ہیں کہ "ایک دفعہ بہت سے تاجر کھانے کی میز پر بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ اس دوران ایک سائنسدان کا ذکر آگیا۔ اس پر ایک شخص نے کہا کہ وہ تو پکا ملحد ہے۔ ایک دوسرے تاجر نے اس فقرے پر یہ گرہ لگائی اور بڑے وثوق کے ساتھ یہ دعویٰ کر دیا کہ سائنسدانوں کی اکثریت خدا کی منکر ہوتی ہے۔ اپنے اس رائے کے اظہار کے بعد اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھ سے اشاروں میں اس بات کا مطالبہ کیا۔ کہ میں اس رائے کے بارے میں اپنے ذاتی احساسات پیش کروں۔ میں نے اس رائے کی پر زور تردید کی اور کہا کہ یہ سائنسدانوں پر محض الزام ہے۔ میں یہ بات بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ سائنس کی دنیا میں جتنے نامور لوگ گزرے ہیں اور جنہوں نے انسانیت کو اپنی تحقیق سے بہرہ مند کیا ہے ان کی ایک عظیم اکثریت خداوند تعالیٰ کے وجود کی قائل ہے۔ ان میں بعض کے خیالات کو یا تو غلط رنگ میں پیش کیا گیا یا لوگوں کو انہیں سمجھنے میں غلطی ہوئی۔ انکارِ خدا تو اس اندازِ فکر ہی کے منافی ہے جس کے مطابق ایک سائنسدان سوچتا اور تحقیق کے میدان میں آگے بڑھتا ہے۔ وہ اپنے کام کا آغاز اسی بنیادی تصور سے کرتا ہے کہ کوئی مشین بھی مشین کی قوت فکر و عمل کے بغیر معرض وجود میں نہیں آسکتی"۔

سائنسدانوں کے بارے میں ایک سائنسدان کا یہ تجزیہ سن کر سامعین کی حیرت کی انتہا نہ رہی کیونکہ معاشرے میں اکثر طور پر سائنس کو مذہب کے مخالف پیش کیا جاتا ہے۔ اور مذہب و سائنس ایک دوسرے کے حریف سمجھے جاتے ہیں۔

عبد الاحد صاحب نے ہلکے سے وقفے کے بعد گفتگو جاری رکھی۔

وجود باری تعالیٰ کا اثبات سِرے سے سائنس کا موضوع ہی نہیں۔ سائنس کا اصل موضوع مادے کی تحقیقات سے متعلق ہے۔ ان تحقیقات کے دوران جب سائنسدانوں کے

سامنے کائنات کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی خدا کی کاریگری سامنے آتی ہے۔ تو وہ ان کو پرکھنے کے بعد خدا کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ سائنسدانوں کی یہی وہ انکشافات واحساسات ہیں جن کو آج لیکچر میں پیش کیا گیا جو کہ ایک ذی شعور بندے کے لئے خدا کے اثبات کو تقویت کا سبب بنتے ہیں۔

لہٰذا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہے کہ خدا کا وجود ایک احساس کا نام ہے جسکو اصلاً مذہب نے اپنا موضوع بنایا ہے اور سائنس اپنے انکشافات کے ذریعے اس احساس کو ماننے میں معاون کا کردار ادا کرتی ہے۔ اسی کے ساتھ ہی آج کا کلاس ختم کرتے ہیں۔ آپ تمام شرکاء کا بہت بہت شکریہ۔ اللہ ہم سب کا حامی وناصر ہو۔

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

باب بیست

دوستی و خیر اندیشی

سروش کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی یا تھکی ہوئی تھی جو فوراً سو گئی اور کھانے کے لیے نیچے نہیں آئی۔

ماں نے نوکرانی سے سوال پُوچھ لیا۔

ماں جی ! مُجھے تو اور کچھ نہیں پتہ لیکن پریشان سی لگ رہی تھی۔ شاید تھکی ہوئی تھی۔ میں کھانا اُس کے کمرے میں بھی لے کے گئی لیکن وہ سو رہی تھی۔

نوکرانی نے جواب دیا۔

سروش آج یونیورسٹی سے آتے ہی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ماں سے صرف سلام کیا لیکن کچھ کہا نہیں۔ اس کی پریشانی پر ماں بھی تجسّس میں مبتلا تھی۔ پہلے تو ماں نے انتظار کیا کہ وہ کھانا کھانے نیچے ضرور آئے گی لیکن جب انتظار حد سے بڑھا تو وہ خود اُس کے کمرے میں چلی گئی۔ دیکھنے پر معلوم ہوا کہ سروش سو رہی ہے۔ وہ بار بار سروش کے کمرے کا چکر لگاتی رہی کہ کب اُٹھے گی تاکہ کچھ کھا لیں اور پریشانی کی وجہ بھی معلوم کی جا سکے۔

ماں لاؤنج میں اپنی بیٹی کے اُٹھنے کا انتظار کر رہی تھی کہ اِس دوران زُنیرہ آ گئی۔

السّلام علیکم ماں جی !

وعلیکم السّلام بیٹی ! کیسی ہو۔ امی، ابُو، بہن، بھائی سب ٹھیک ہیں ؟

جی۔ ماں جی !

بیٹی! سروش کچھ خفا خفا سی لگ رہی تھی۔ کھانا بھی نہیں کھایا اور فوراً سو گئی۔ میں ابھی تک اُس کا انتظار کر رہی ہوں کہ کب اُٹھے گی۔ کیا ہوا ہے؟

ماں سے رہا نہ گیا اور فوراً ہی زُنیرہ سے اپنی بیٹی کا حال دریافت کرنے لگ گئی۔

نہیں ماں جی! کُچھ خاص نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ بس عریشہ کے ساتھ ہلکی سے تلخی آ گئی تھی۔

زُنیرہ نے رُک رُک کر پھیکی مُسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

اور تو کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔

ماں سوال کرنے شروع ہو گئی۔

نہیں ماں جی! اور کُچھ بھی نہیں ہے۔

اچھا!

زیادہ خفا تو نہیں کیا ایک دوسرے کو؟

جی نہیں۔ بَس چھوٹی سی بات کا خوامخواہ بتنگڑ بن گیا اور بات تلخی تک پہنچ گئی۔

زُنیرہ معصومانہ لہجے میں جوابات دیتی رہی۔

زُنیرہ سروش کا دل رکھنے کے لیے آئی تھی تا کہ سہیلیوں میں تلخی کا بر وقت خاتمہ کیا جائے اور نفرتیں دفن کیں جائیں۔ اگر کہیں کوئی غلط فہمی ہو تو دُور کی جائے کیونکہ یہ دُنیا تو چند پل کی مہمان ہے۔ اس میں نفرتوں، تعصبّوں اور تلخیوں کے لیے وقت کہاں۔ مُسکراہٹیں بکھیرنا ہی انسان کے شایانِ شان ہے۔

اس کے بعد زُنیرہ نے عریشہ کے گھر کا بھی چکر لگانا تھا۔ وہ اپنے بھائی کو ساتھ لے کر آئی تھی تا کہ وہ اس کے بعد اُسے عریشہ کے گھر لے جا سکے۔

ٹھیک ہے بیٹی! اچھا ہوا کہ آپ آ گئی ورنہ یہ انتظار تو میرا لہُو پیتا رہا۔ ہر سیکنڈ کے ساتھ ذہنی دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ آپ نے حالات سے آگاہ کر کے سینہ ٹھنڈا کر دیا۔

ماں جی نے گہری سانس لیتے ہوئے پیار بھرے لہجے میں پُر تشکر انداز میں کہا۔ اس کے بعد ہنس کے بولی۔

تھوڑا انتظار کے بعد آپ اُس کے کمرے میں جا کر اسے جگاؤ تاکہ میں اُس کے کان کھینچوں۔ اس نے میری پیاری بیٹی عریشہ کو خفا کیا ہے۔

اِس پر زُنیرہ کے چہرے پر مُسکراہٹ پھیل گئی۔

کچھ وقت بعد تینوں سروش کے کمرے میں موجود تھیں اور گپ شپ جاری تھی کہ اس دوران نوکرانی چائے لے کر آ گئی۔

باجی! کیا ہُوا تھا۔ یونیورسٹی میں طبیعت خراب ہوئی تھی کیا؟ پریشان لگ رہی تھی۔ میں کھانا بھی لائی تھی لیکن آپ سو رہی تھی۔

نوکرانی نے آتے ہی سروش کو جاگتا دیکھ کر حالات دریافت کرنے شروع کئے۔

نہیں گُڑیا۔ میں ٹھیک ہوں۔ شاید تھک گئی تھی۔

سروش نے پیار بھرے لہجے میں جواب دیا۔

سارے گھر والے نوکرانی کو پیار سے گُڑیا بلاتے تھے۔

ماں نے گڑیا کو اشارے سے سروش کے ساتھ بیٹھنے کا کہا۔

سروش کی ماں کافی پڑھی لکھی اور سلجھی ہوئی خاتون تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ گڑیا کی بھی اپنے ہی بچوں جیسی تربیت ہو اور اس کو یہ احساس بھی نہ ہو کہ اُسے گھر کی محفلوں سے دُور رکھا جاتا ہے۔ دُوسری طرف سروش کو زُنیرہ کا اُس کے گھر آمد، گڑیا کا سروش کی طبیعت بارے تفتیش و سوال اور ماں جی کا اُس کے کمرے میں موجودگی سے حالات کی نزاکت کا احساس ہو گیا تھا۔ اس لئے عُجلت میں کہہ دیا۔

ماں جی! وُہ عریشہ-----

ابھی سروش آگے کچھ کہنے ہی والی تھی کہ ماں بیچ میں ہنسی بھرے چہرے کے ساتھ مخل ہوئی۔

ہاں۔۔۔۔ عریشہ آپ کی بیسٹ فرینڈ ہے۔

ہاں! وہ تو ہے لیکن آج وہ مجھے خوامخواہ تنگ کر رہی تھی۔

زُنیرہ گواہ ہے اس کی۔

زُنیرہ مُنہ کھولنے ہی والی تھی لیکن ماں جی نے موقع ہی نہیں دیا۔

آپ کا کیا خیال ہے کہ اب میں آپ کے دلائل و کہانیاں سُنو نگی اور پھر عریشہ کی۔ پھر زُنیرہ کو بطورِ شہادت بولنے کا موقع دیا جائیگا۔ پھر بحث و تکرار ہو گی۔۔۔ بالکل بھی نہیں۔

نہ مُجھے یہ سننا ہے کہ کیا ہوا تھا اور کیا نہیں اور نہ اس کے دلائل کہ کون غلطی پر تھی۔ مُجھے صرف آپ کی عریشہ اور زُنیرہ کے ساتھ قہقہے سُننے ہیں اور بَس۔

دوستوں کے درمیان چھوٹی چھوٹی تلخیوں میں صحیح اور غلط کے لیے بحثیں نہیں ہوتیں کہ فلاں نے یہ کہا تو فلاں نے وہ جواب دیا۔ پھر فلاں نے یہ کیوں کہا اور فلاں نے وہ کیوں کہا۔ "کیوں" کا لفظ دوستی کو مشکوک بنانے کے لیے کافی ہے۔ دوستی نبھانے میں عُذرات نہیں تراشے جاتے۔ یہ صرف نبھائی جاتی ہے اور ہر حال میں نبھائی جاتی ہے۔ وگرنہ اِن بے جا بحث و تکرار سے تلخی بڑھتی ہے گھٹتی نہیں۔ شاید اِن بحثوں سے کسی ایک دوست کی عارضی جیت ہو جائے لیکن وہ دوستی ہار جاتی ہے۔ یہ بحث و مباحثے اور دلائل علم کے حصُول میں اچھے لگتے ہیں دوستی میں نہیں۔

ہلکی سی خاموشی کے بعد ماں جی دوبارہ گویا ہُوئی۔

بیٹی! اگر کسی کو دوستی کے لیے چُننا ہو تو خامیوں سمیت چُننا ہو گا کیونکہ خامیوں سے پاک فرشتے اور پیغمبر ہیں، ہم انسان نہیں۔ اگر ایسا کرنے کی ہمت نہیں تو یہ انسان دوستی نہ ہوئی بلکہ خُوبیوں کی حرص ہے۔ لہٰذا انسانوں کے بارے میں اچھے گمان اور مثبت سوچ کے

ساتھ آگے بڑھو۔ خامیوں پر پردہ ڈالو اوراس کو اچھا رنگ دینے کی ہر ممکن کوشش کرو۔ انسان سے وہی برتاؤ کرو جس برتاؤ کی آپ خالق سے توقع و اُمید رکھتے ہو۔ اگر خالق سے اپنے خامیوں پر پردہ ڈالنے کی توقع رکھتے ہو تو خالق کے مخلوق کے خامیوں پر پردہ ڈالو۔ زندگی بھلے طریقے سے جینی ہو تو "جانے دو" کو بھی زندگی کے معمول میں حصہ دار بناؤ۔ ہر بات انت تک نہیں پہُنچائی جاتی اور نہ ہی ہر بات ہر ایک کے کام کی ہوتی ہے۔ یہ ہر چیز میں ٹانگ اَڑانے کے مترادف ہے۔ اس لیے نظر انداز کرنا سیکھو اور کچھ معاملات کے بارے میں "جانے دو" پر اکتفا کرو۔ اس سے آپ کو ذہنی تناؤ کی کمی میں مدد ملے گی۔ کیونکہ جتنی ٹینشن کی باتیں کم ہونگی اُتنا ہی ٹینشن کم ہو گا۔ دماغ لڑانا ہے تو کام کی باتوں میں لڑاؤ۔ بھلائی کے لیے استعمال کرو۔ متعلقہ اُمور نمٹانے کے لیے کھپاؤ۔

آخری بات آپکو بتادُوں کہ عورت کی ذات مُحبت کے لئے پیدا ہوئی ہے۔ یہ ذات ایک پُر اسرار راز ہے۔ اِس ذات کو کراہت سے گِھن آتی ہے۔ لہٰذا تلخیاں مٹاؤ اور عریشہ بیٹی سے صلح کرانے میں پہل کرو۔

ماں جی! اتنی بڑی بات نہیں۔ ہلکی سی تلخی پیش آئی تھی جس کے خاتمے کے لیے صُبح یونیورسٹی میں دونوں کے آنکھ ملانے کی دیر ہے۔ مُجھے پتہ ہے کہ یہ چھوٹی چھوتی باتیں دل پر نہیں لی جاتیں۔

ماں کے خاموش ہوتے ہی زُنیرہ نے آگاہی دی۔

شُکر ہے بیٹی! کہ ایسا ہی ہو۔ خُدا آپکی گویائی میں برکت ڈال دیں۔ شیطان ایسی تلخیاں و غلط فہمیاں پیدا کرنے اور بھڑکانے میں چھڑکتی پر تیل کا کردار ادا کرتا ہے۔ اُسے امن سے سخت بیر ہے۔ اُسکی یہ پُوری کوشش ہوتی ہے کہ لوگوں کو اَمن و صُلح کے قریب بھی نہ پھٹکنے دیں۔ وہ باہمی اختلاف و غلط فہمیاں پھیلا کر امن وخُوشی کی محفلوں کو درہم برہم کرتا رہتا ہے ۔ انسانوں میں شیطان کی سب سے بڑے دُشمن پیغمبرانِ اسلام ہیں۔ ان پیغمبرانِ اسلام میں

ایک عظیم المرتبت پیغمبر حضرت ابراہیمؑ جب اپنے وطن مکہ سے رخصت ہو رہے تھے اور اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو مکہ کے اس بے آب و گیاہ وادی میں چھوڑ رہے تھے تو سب سے پہلے جو دُعا مانگی وہ امن ہی کی تھی ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے لاڈلے پیغمبر کی یہ دُعا قبول فرمائی اور مکہ مکرمہ کو جائے امن قرار دیا۔ اسی لیے ہمیں اپنے پیغمبر حضرت ابراہیمؑ کی راہ پر چلتے ہوئے اُس کے دُشمن کے حملے کے لیے ہر وقت چوکنا رہنا چاہیئے۔ اس دوران اگر کبھی غفلت بھی ہو جائے اور کوئی شکر رنجی پیدا ہو جائے تو فوراً صُلح و اصلاح کے لیے کمر کَس لینا چاہیئے۔ دوستیوں کو سبوتاژ نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ ہم رحمان کے بندے ہیں، شیطان کے نہیں۔ ہمیں رحمان کے بندے ہی بن کر جینے میں آسانی بھی ہے اور فائدہ بھی۔ اور سب سے بڑھ کر ذہنی سکُون بھی۔

ماں جی! یہ تعصّبات جن کی وجہ سے تلخیاں طُول پکڑتی ہیں، آجکل انسانوں میں بہت گھر کر رہی ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے۔

سروش ماں سے معلومات حاصل کرنے لگ گئی۔ وہ عریشہ کے ساتھ ہونے والے واقعے کے خیالات کو ردّ کر کے محفل کا حصہ بننے لگی تھی۔

سروش کا سوال سُن کر ماں جی کے چہرے پہ طمانیت و آسودگی کے اثرات نُمایاں ہوئے کیونکہ سوال سے اُسے یہ احساس ہُوا کہ بیٹی کے مزاج میں کینہ پروری و تعصبات غالب نہیں۔ اندازِ سوال سے واضح تھا کہ سروش تلخیوں، تعصبات اور کینہ پروری کو تنقید کا نشانہ بنا رہی ہے۔ والدین کے لیے اس سے بڑھ کر اور خوشی کیا ہو سکتی ہے کہ اس کے بچے راہِ راست پر ہیں اور خُوش اخلاقی و اُنسیت کے اعلیٰ درجے پر فائز ہیں۔ ماں جی نے مُسکرا کر سروش کی طرف دیکھا اور مُسّرت کے ساتھ بولنا شروع کیا۔

میری بیٹی! اسکی سب سے بڑی وجہ علم سے دُوری ہے۔ جب تک کسی شخص میں علم کی کمی ہو گی تب تک اُس میں عجز کا فُقدان ہو گا۔ لیکن علمِ نافع۔ صرف ڈگری نہیں کیونکہ جو علم

عجز پیدا نہ کریں، وہ علم نہیں، بوجھ ہے۔ عجز پیدا ہوتے ہی تعصبات مٹنا شروع ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا علم و آگاہی انسانیت کا حُسن ہے۔ میں اگر اپنی عورت ذات کا ذکر کروں تو مجھے انتہائی افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ عورت نے خُود کو علم سے بغیر کسی وجہ کے روکے رکھا ہے۔ بعض جگہ معاشرتی مجبوریوں و پابندیوں سے قطع نظر یہ حقیقت اٹل ہے کہ عورتوں میں علم کا وُہ رحجان نہیں رہا جو ہونا چاہیئے تھا۔ علم تو صرف ڈگریاں پانے کا نام نہیں۔ آپ کی کلاس میں کتنی لڑکیاں ہو نگی جو اپنے کورس کی کتابوں کے علاوہ دوسری کتابوں کو بھی ہاتھ لگاتی ہو نگی۔۔۔۔بہت کم۔۔۔اور شاید نہ ہونے کے برابر۔ ویسے تو پوری کائنات خدائے بزرگ وبرتر کا عطیہ لیکن مجسم شکل میں جو چیز خدا کی طرف منسوب کی جاتی ہے جسے خدا نے بطور تحفہ انسانیت کی ہدایت چنا، وہ کتاب ہی کی شکل میں انسان کے پاس موجود ہے یعنی قرآنِ کریم۔ یہی ایک دلیل کتاب کی اہمیت اجاگر کرنے کیلیئے کافی ہے اور اللہ کا لاکھ لاکھ شُکر ہے کہ سروش کو کتابوں سے محبت ہے اور پڑھنے کا شوق ہے۔۔۔۔۔

چائے کا گھونٹ لینے کے بعد ماں جی دوبارہ شروع ہو گئی۔

اس دوران سروش نے اپنا نام سُن کے احساس تفاخر سے زُنیرہ کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مُسکرا کر داد وصُول کی۔

تاریخ میں ہماری خواتین اہلِ علم کی مثالیں ایک روشن باب ہے۔بڑے بڑے فقیہہ صحابیات گُزری ہیں جن میں حضرت عائشہؓ، حضرت اُمِّ سلمہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت صفیہؓ، حضرت اُمِّ عطیہؓ، حضرت اُمِّ صبیہؓ، حضرت لائلہ بنتِ قائمؓ، حضرت اسماء بنتِ ابو بکرؓ، حضرت اُمِّ شریکؓ، حضرت خولہ بنتِ اُمِّ درداءؓ، حضرت عتیقہ بنتِ زیدؓ، حضرت سہلہ بنت سہیلؓ، حضرت جویریہؓ، حضرت میمونہؓ، حضرت فاطمہ بنتِ قیسؓ، حضرت اُمِّ ایمنؓ، حضرت اُمِّ یوسفؓ اور حضرت عاصریہؓ وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں حضرت عائشہؓ تو قابلِ قدر عالمہ تھی جس کی مسلمان قوم پر کافی احسانات ہیں۔ اکثر اوقات ایسا ہُوا ہے کہ صحابہ کرامؓ کو درپیش

علمی مسئلے میں آپؓ ہی نے گُتھی سلجھائی ہے۔ صحابہ کرامؓ کو پڑھاتی رہی ہیں بلکہ ہزاروں احادیث آپؓ سے روایت کی گئی ہیں۔ اِسی طرح بنتِ ربعی بنتِ معوذؓ بھی ایک بڑی عالمہ تھی۔ حضرت عبد اللہ ابنِ عباسؓ اور حضرت اِبن عمرؓ آپؓ سے علم سیکھتے تھے۔ فاطمہ بنتِ قیسؓ چند بہت بڑے علماء مثلاً ابنِ مسیّب، عروہ ابنِ زبیر اور شعبی کی مُدّرسہ تھی۔ امام مالک جیسے فقیہہ کی معلمہ سعد بن وقاصؓ کی بیٹی عائشہؓ تھی جو کہ ایک بڑی عالمہ تھی۔ امام شافعی جیسے عالم نے علمِ حدیث سیدہ نفیسہؒ سے حاصل کیا جو کہ حضرت حسنؓ کی پوتی تھی۔ اُس وقت خواتین میں علم کی پیاس بُجھانے کے لیے تگ ودَو کا حال یہ تھا کہ خواتین پیغمبرِ خدا ﷺ سے علمِ دین سیکھنے اُن کے ہاں جایا کرتی۔ اُن کے لیے رسول اللہ ﷺ نے ہفتے میں ایک دن اُن کی تعلیم وتربیت اور سوال وجواب کے لیے مقرر کیا تھا۔

یہی حال دنیوی علم و ادب کا بھی تھا۔ شاعری کے میدان میں حضرت خنساءؓ، حضرت سودہؓ، حضرت صفیہؓ، حضرت عاتکہؓ، حضرت مریدیہؓ اور حضرت اُمِّ ایمنؓ زیادہ قابل ذکر ہیں۔

اب ذرا فلسفے کے میدان میں خواتین اہلِ علم کے کارنامے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں اگر صرف یونان کے خواتین فلاسفرز کی بات کی جائے تو بھی خواتین میں علمی روایت برقرار رکھنے واجاگر کرنے کے لیے کافی ہے۔ میلیٹس کی ایسپیزیا (Aspasia of Miletus) جس کا گھر یونان میں دانشوری کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ وہاں بڑے بڑے فلسفی حضرات علم حاصل کرتے تھے۔ جن میں سُقراط جیسا قابلِ قدر فلسفی بھی شامل تھا۔ دوسری طرف ڈیلفی کی تھیمسٹوکلیز (Themistocles of Delphi) ہے جو کہ پیتھاگورس (Pathagorus) جیسے ریاضی دان فلسفی کی اُستانی تھی۔ سائرین شہر کی ایریٹ (Arete of Cyren) کے اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے جِس نے تقریباً چالیس کتابیں فلسفے پر تحریر کیں اور رحلت کے وقت سو سے زائد شاگرد چھوڑ گئیں۔ یہ لسٹ اگر آگے بڑھاؤں تو لمبی ہو

جائیگی کیونکہ جدید دُنیا میں بھی خواتین فلاسفرز و اہلِ علم اپنے کارنامے سرانجام دے چکی ہیں۔ سائنس کی دُنیا میں ماری کیوری (Marie Curie) ایک درخشندہ تارہ ہے۔ اپنے مُلک پاکستان میں علمِ سیاسیات کے میدان میں محترمہ بے نظیر بھٹو شہید کے علم و دانش سے سب بخُوبی آگاہ ہیں جنہوں نے جدوجہد کی ایک جیتی جاگتی داستان رقم کی۔

یہ تو ایک ہلکا سا تعارف تھا علمی میدان میں خواتین اہلِ علم کے کارناموں کا وگرنہ اِن سے تو کتابیں بھری پڑی ہیں لیکن افسوس کہ کوئی اِس طرف بھی نظرِ کرم کرے۔

لٰہذا چاہیئے کہ خواتین علم کی دُنیا میں آگے بڑھیں۔ کتابیں پڑھنا ان کا روزمرہ کا معمول بنے۔ پڑھائی لکھائی شوق سے کریں۔ اس کو اپنا مشغلہ بنائیں۔ کیونکہ اسی علم ہی کی کوکھ سے شعُور پُھوٹے گا جو کہ نفرتوں کو دفن کرنے میں مددگار ثابت ہو گا۔

اس دوران پی ٹی سی ایل کی گھنٹی بجی۔

گُڑیا! ذرا دیکھو کہ کِس کا فون ہے۔

ماں جی نے گُڑیا کو فون اٹینڈ کرنے کے لیے نیچے بھیجا اور پھر اپنی بات جاری رکھی۔

آپ نے غور کیا ہو گا کہ عورت کی ذات بچوں سے زیادہ مشابہہ ہوتی ہے، شکل و شُباہت میں بھی، حیرت سے زیادہ معمور ہونے میں بھی اور دماغ کی بجائے دِل کو ترجیح دینے میں بھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں میں بچوں کی خاصیتیں رکھنے سے قدرت یہ بتانا چاہتا ہے کہ عورت میں مَرد کی نسبت معصومیت اور محبت زیادہ ہے۔ تبھی تو کِسی سیّانے نے کہا ہے کہ عورت کی مُحبت مَرد کے مقابلے میں دَس گُنا زیادہ ہے۔ روزمرہ کا تجربہ بھی یہی بتاتا ہے کہ کراہت و نفرت عورت ذات پر جچتی ہی نہیں۔ یہ تو سراپا محبت ہے۔ مَرد اگر دماغ کا مالک ہے تو دل کی حکمرانی عورت کے سُپرد کر دی گئی۔ سب سے بڑی اور اہم بات کہ عورت اپنے حدُود کی پاسداری کا گُر جانتی ہے۔ یہ اپنی عزت کے دائرے میں بخُوشی زندگی گزارنا پسند کرتی ہے۔ مرد کے مقابلے میں بغاوت پر کم اُتر آتی ہے اور عزتوں کا سودا نہیں کرتی

کیونکہ خالق نے اسے صبر وعزت کا عظیم تحفہ دیا ہے۔ یہ زیادہ صابر ہوتی ہے۔زیادہ انتظار کرنے کی اہل ہوتی ہے۔ زیادہ عزت کی مالک ہوتی ہے۔ عزت و حیا اور مُحبت کو اگر مجسّم کیا جائے تو عورت بنتی ہے۔

اس دوران گُڑیا بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوگئی۔

باجی! عریشہ کی ماں کا فون ہے۔ آپکو بُلایا ہے۔

یہ سُنتے ہی ماں جی اور زُنیرہ کا چہرہ کِھل اٹھا۔ سروش فون اٹینڈ کرنے نیچے ہال میں چلی گئی۔

دیکھ لیا عورت کی محبت کا نتیجہ کہ فوراًامن و صُلح کے لیے عریشہ کی ماں کا فون آیا۔

ماں جی نے کمرے سے نکلتے ہُوئے زُنیرہ کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر کہا اور نیچے چلی گئی۔

باب بیست و یک

انفُسی دلائل

ہیلو عُویم! آج تو بیگ لے کر آئے ہو۔ خیریت تو ہے۔ آپ کے پاس تو عمومی طور پر صرف ایک رجسٹر اور عمومی مطالعے کے لیے ایک کتاب ہوا کرتی ہے۔ پین بھی کبھی کبھار ہم سے مانگ لیتے ہو۔ میرے خیال میں ارادے بدل گئے ہیں اور پہلی بنچوں پہ جانے کا ارادہ ہے۔ اور صرف اور صرف کورس بکس(Course Books)تک خود کو محدود کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔

یونیورسٹی پہنچتے ہی عُویم کی ملاقات کیف اور آکاش سے ہوئی۔ عُویم کو دیکھتے ہی آکاش فقرے کسنے لگا۔

نہیں یار! بیگ کتابوں کے لئے نہیں ہے بلکہ اس میں ضروری سامان ہیں۔ مجھے پہلی بنچوں پہ جانے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی اپنا آزادانہ ماحول ترک کرنے کا ارادہ ہے۔ صرف کتابی کیڑا بن کے کیا فائدہ۔ مجھے کُند ذہن طالب علم نہیں بننا۔ کورس کی کتابوں کے علاوہ اور بھی بہت سی کتابیں اور علوم موجود ہیں جن سے لائبریریاں بھری پڑی ہیں اور ساتھ ساتھ چلتی پھرتی لائبریریاں بھی اشخاص کی شکل میں گھوم رہی ہوتی ہیں۔ ہر جگہ سے علمی خوشہ چینی میرا مشغلہ ہے۔ اسی طرح سماجی زندگی میں بھی بھرپور حصہ لینے کا خواہشمند ہوں۔ صرف اور صرف اپنے ہی کورس کو پڑھنا ریس کے میدان میں اکیلے بھاگنا ہے۔

عُویم نے مسکرا کے جواب دیا۔

کیسا ضروری سامان ہے بیگ میں، اور بیگ کو گاڑی میں کیوں نہیں رکھا؟

کیف نے استفسار کیا۔

کپڑے وغیرہ ہیں اور گاڑی نہیں لایا ہوں۔ آج چند کلاسز کے بعد مجھے جانا ہے۔ عبد الاحد صاحب آ گئے ہیں، اس سے ملنا ہے۔ بَس میں 12 بجے کی ٹکٹ ہے۔

یہ سنتے ہی کیف کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی اور خاموشی طاری ہو گئی۔

چلو چلتے ہیں تاکہ بیگ کو لائبریرین کے ساتھ رکھ دیں۔

عُویم یہ کہتے ہوئے لائبریری کی طرف روانہ ہوا۔ دونوں دوست بھی ساتھ ہو لئے۔

بس روانگی سے آدھا گھنٹہ پہلے وہ سٹیشن پہنچ گیا اور فوراً اپنا ٹکٹ کنفرم کر دیا۔ مقررہ وقت پر جب گاڑی سٹاپ پر لگ گئی تو وہ بھی بس کی طرف بڑھا۔ بس میں چڑھنے کے بعد وہ اپنے سیٹ پر بیٹھنے ہی والا تھا کہ پیچھے سے کسی جانی پہچانی آواز نے اُسے آواز دی۔

عُویم! پیچھے جگہ خالی ہے ادھر آ جا۔ ایک ساتھ بیٹھتے ہیں۔

عُویم نے متحیر نظروں سے جیسے ہی پیچھے دیکھا تو پیچھے کی سیٹ پر بیٹھا کیف مسکرا رہا تھا۔ وہ اپنا سیٹ چھوڑ کر پیچھے کی طرف روانہ ہوا۔

آپ پہلی کلاس کے بعد اچانک کہاں غائب ہو گئے۔ عُویم نے بیٹھتے ہی سوال کیا۔

یار! جب آپ نے بتایا کہ آپ نے عبد الاحد صاحب سے ملنے جانا ہے تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ عُویم کے ساتھ میں بھی جاؤں اور اپنا ایک چھوٹا سا کام نمٹا کر آؤں۔ مجھے بھی اس شہر میں ایک کام تھا لیکن اکیلے جانے کے لئے دل نہیں کر رہا تھا۔ لہٰذا یہ موقع غنیمت جان کر میں نے بھی اسی ہی بس میں فوراً آن لائن ٹکٹ بک کر الیا۔

کیف نے جلدی جلدی جواب دے دیا۔

بہت خوب۔۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے مجھے بھی ایک بہترین ساتھی کی صحبت مل جائے گی۔

عُویم نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کیف کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر تبصرہ کیا۔

گاڑی روانہ ہو گئی۔ دوستوں میں ہلکی پھلکی گپ شپ جاری تھی۔ عُویم کے ہاتھ میں کتاب تھی جو کہ آدھی کھلی اور آدھی بند تھی اور بار بار پڑھنے کا مطالبہ کر رہی تھی۔ وہ سفر میں اپنے ساتھ کتاب ضرور رکھتا تھا اور موقع ملتے ہی پڑھنا شروع کر دیتا۔

دکھایئے۔۔۔ کیا پڑھ رہے ہو۔

کیف نے عُویم کے ہاتھ سے کتاب کھینچتے ہوئے کہا۔

"آب گم" مشتاق یوسفی کی۔ عُویم نے کتاب دیتے ہوئے جواب دیا۔

اب یہ مشتاق یوسفی کون ہے؟

کیف کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے نظریں جھکائے بول پڑا۔

یہ اصل میں تو ایک مزاح نگار ہے لیکن بہت ہی مختلف اور ہمہ جہت شخصیت ہے۔ مزاح نگار بھی ہے اور عالم بھی۔ ہنساتا بھی ہے اور پڑھاتا بھی ہے۔ بلکہ کبھی کبھی تو رلاتا بھی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یوسفی صاحب کی مزاح ایک دانا شخص کے اس قول زریں کا صحیح ترین مصداق ہے۔ کہ "مزاح تو وہ ہے کہ جسے نچھوڑیں تو آنسو ٹپکنے لگتے ہیں"

عُویم نے تبصرہ کیا۔

اسکے بعد کچھ وقفے کے لئے خاموش چھاگئی کیونکہ کیف کتاب میں مصروف ہو گیا اور عُویم کھڑکی کے شیشے سے باہر نظارہ کر رہا تھا۔

اچھا ہے۔ یہ بتاؤ عُویم! کہ عبدالاحد صاحب سے کافی ملاقاتیں ہوئیں ہیں۔ کیا کچھ سیکھنے کو ملا۔

کیف نے کتاب بند کرتے ہوئے سوال کیا اور ساتھ میں کتاب عُویم کو تھما دی۔ اس کے چہرے پر اور لہجے میں سنجیدگی تھی۔

چھوڑیں یار! سیانے کہتے ہیں کہ ہر وقت سنجیدہ باتیں اچھی نہیں ہوتی، اعصاب پر بوجھ بن جاتے ہیں۔ انسان کے مزاج کا تقاضہ ہے کہ یہ تغیّر و تبدّل سے گزرتا رہے۔ کبھی ہنسے،

کبھی روئے، کبھی جلوت کے ہنگاموں میں گم ہو، کبھی خلوت کی تنہائی میں سَر کھپاتا رہے، کبھی زمین سے چمٹا رہے اور کبھی آسمانوں کی سیر میں فرشتوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیں۔ انسان بنا ہی اسی اصول پر ہے کہ یہ مختلف اور مخالف انتہاؤں کو چھوئیں۔ لٰہذا آؤ یار! اس وقت ماتھے پر شِکن کی بجائے گالوں پر سرخی جماتے ہیں۔ عبد الاحد صاحب کی باتیں پھر کبھی سناؤنگا۔ ابھی آپ کو یوسفی صاحب کی کتاب سے ایک اقتباس سناتا ہوں۔

عُویم نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بات ختم کر کے کتاب کھولی اور ورق گردانی میں مصروف ہو گیا۔

ہاں تو جناب! یوسفی صاحب جوانوں کی کُوچہ گردی میں مخل ہونے پر بزرگوں کے چوکنا نظروں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"کبھی کبھی میاں تحمّل بڑی حسرت سے کہتے کہ یار! لوگ کتنے "لکی" ہیں! ان کے بزرگ یا تو فوت ہو چکے ہیں یا نابینا ہیں۔ بات یہ ہے کہ وہ زمانہ اور تھا۔ نئی پود پر جوانی آتی تو بزرگ نسل دیوانی ہو جاتی۔ سارے شہر کے لوگ ایک دوسرے کے چال چلن پر پہرہ دینا اپنا فرض سمجھتے تھے۔

ہم اُس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا

بزرگ قدم قدم پر ہماری نا قابل استعمال جوانی کی چوکیداری کرتے تھے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ہماری لغزشوں اور غلطیوں کو پکڑنے کے لئے اپنا سارا بڑھاپا چوکنّے وکٹ کیپر کی طرح حالتِ رکوع میں گزار دیتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اگر یہی کچھ ہونا تھا تو ہم جوان کاہے کو ہوئے ہیں۔۔۔۔۔صاحب، اپنی تو ساری جوانی دیوانی ڈنڈ پیلنے اور بھینس کا دودھ پینے میں ہی گزر گئی۔ اب اسے دیوانہ پن نہیں تو اور کیا کہیں؟"

یہ سنتے ہی دونوں دوستوں کے چہرے کھل اُٹھے۔

صبح کا وقت ان کے ملاقات کے لئے مقرر تھا۔ لٰہذہ وہ دونوں وقت سے کچھ پہلے عبد الاحد صاحب کے ادارے پہنچے۔ جنید نے گرم جوشی سے ان کا استقبال کیا اور اپنائیت کا مظاہرہ کیا۔ کچھ وقت کے بعد دونوں دوست استاد جی کے کمرے میں تھے۔ علیک سلیک کے بعد گپ شپ شروع ہوگئی۔ حال احوال دریافت کرنے کے بعد عبد الاحد صاحب کے حالیہ بیرون ملک کے اسفار پر گفتگو شروع ہوگئی جس میں استاد محترم نے ان ممالک کی تاریخ، تہذیب وتمدن، آب وہوا اور وہاں اپنی مصروفیات پر سیر حاصل روشنی ڈالی۔ جس سے سامعین کو اچھے خاصے علمی نکتے سننے کو ملے۔ اسی دوران قہوے کا دور بھی چلتا رہا۔ دورانِ گفتگو کبھی کبھار عبد الاحد صاحب حسِ مزاح کو بروئے کار لاتے ہوئے محفل میں ہنسی بکھیر دیتا اور کبھی کبھار اپنی ادیبانہ ذوق سے شعر وشاعری کے ذریعے گلفشانی کر دیتا۔ وہ محفل کی زینت بنا ہوا تھا۔

وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی

اسی دوران عبد الاحد صاحب نے براہِ راست عُویم سے آن لائن کلاسز کے بارے میں دریافت کیا۔

عُویم بیٹا! کلاسز کیسی جا رہی ہیں؟

یہ سنتے ہی کیف بھی چونک گیا اور مکمل متوجہ ہوگیا۔ کیونکہ وہ بھی آن لائن کلاس کا حصہ تھا جس کی عُویم کو خبر نہیں تھی۔ انہوں نے دبے پاؤں جنید کے ساتھ اپنا فارم جمع کرایا تھا۔ آج اس کا عُویم کے ساتھ آنا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ اسے اِثباتِ الٰہی اور ردِّ الحاد کے بارے میں دل سے احساس ہوگیا تھا۔

بہت خوب جا رہی ہیں۔ لیکن جو مزہ بالمشافہ کلاس میں اور آپ سے ملاقات میں ہے وہ ڈیجیٹل پردے کے پیچھے کہاں۔

عُویم نے کلاس کو سراہا بھی اور اپنے تحفظات کا اظہار بھی کیا۔

بیٹا! یہ تو وقت کی ضرورت ہے۔ اب ہر کوئی کیسے یہاں آکر کلاس لے سکتا ہے۔ ایک بہت بڑی دنیا تک پیغام پہنچانا ہے۔ اس کے سو فیصد نتائج نہ سہی 80 فیصد نتائج کے آنے کے امکانات تو ہیں نا۔ یہ بھی کافی ہے۔ اس کے علاوہ ہم نے تو یہاں آنے اور ملاقات کرنے سے کسی کو بھی نہیں روک رکھا ہے بلکہ ہمارا ادارہ تو آپ جیسے سنجیدہ طلباء کے لئے اپنے ہی گھر کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم خوش آمدید کہتے ہیں۔

جو آئے آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں

محفل خوب جمی ہوئی تھی۔ اس میں سب سے حیران کن شخصیت کیف کی تھی وہ کبھی محفل میں پوری طرح گم ہو جاتا اور ہمہ تن گوش بن جاتا اور کبھی کبھار اپنے خیالوں میں سفر کرتا۔ غرضیکہ اس کا ذہن تذبذب کا شکار تھا کبھی یہاں کبھی وہاں۔ کہ اس دوران اس کے منہ سے اچانک سوال نکلا۔

سر جی! یہ مذہب کا عقیدہ آیا کہاں سے؟

یہ سنتے ہی سب چونک گئے سمیت کیف کے بھی۔ وہ خود بھی حیران ہو گیا کہ شاید میں نے غلطی سے محفل میں خلل ڈالی۔ عُویم کی نظریں کیف پر ٹِک گئی۔ عبد الاحد صاحب اس طرح اچانک سوال سننے پر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کیف کی طرف متوجہ ہوا۔

بیٹا! ایک شرط پر جواب دونگا۔

کیف نے یہ سنتے ہی سر ہلانا شروع کر دیا کیونکہ وہ اپنے بَس کے مطابق ہر شرط پوری کرنے کے لئے تیار تھا۔

عبد الاحد صاحب مسکرایا اور کہا۔

اُٹھو! آپ بھی پانی پیو اور مجھے بھی پلا دو۔

یہ سنتے ہی کیف نے اٹھ کر استاد کو پانی کا گلاس پیش کیا اور اس کے بعد خود بھی پی لیا۔ پانی پینے کے بعد عبد الاحد صاحب نے پوری سنجیدگی کے ساتھ گفتگو شروع کی۔

اچھا تو آپ کا سوال ہے کہ مذہب کا تصور کہاں سے ابھرا۔

یہ وہی سے ابھرا ہے جہاں سے رشتے بننے شروع ہو جاتے ہیں۔ اگر میں آپ سے پوچھ لوں کہ آپ میں والدین سے محبت کا جذبہ کب سے پیدا ہوا ہے؟ کب سے یہ محسوس ہوا ہے کہ مجھے ماں سے محبت ہے، ابو جی سے محبت ہے، بہن بھائی میرے جگر کے ٹکڑے ہیں، رشتہ دار مجھے پیارے ہیں۔ کب سے یہ محبت شروع ہوئی ہے۔ کونسے دن سے آپ کا دل ان کے ساتھ دھڑکنا شروع ہو گیا ہے۔ امید ہے میرے ان تمام سوالوں کا جواب آپ یہی دیں گے کہ شروع دن سے۔۔۔۔۔

انسان کے پیدا ہوتے ہی یہ جذبات آپ سے آپ پیدا ہو جاتے ہیں۔ انسان اس دنیا میں کچھ رشتے لیکر آتا ہے۔ ان رشتوں اور رشتہ داروں کے ساتھ محبت کا جذبہ ایک فطری عمل ہے۔ یہ فطری عمل صرف جذبے کی حد تک محدود نہیں رہتا اور ایک جگہ پر ٹکتا نہیں بلکہ آگے بڑھ کر احساس ذمہ داری سے آشنا ہو جاتا ہے اور انسان کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے۔ جیسا کہ یہ محبت اور وفاداری ہی کا رشتہ ہوتا ہے کہ آپ والدین کی خدمت کرتے ہیں اور والدین آپ کی۔ آپ بہن بھائیوں کے کام آتے ہیں اور وہ آپکی۔ اگر یہ رشتہ نہ ہوتا تو ایک جوان بیٹے کا اس سے کیا سروکار کہ وہ اپنی کمائی اور توانائی بوڑھے والدین پر خرچ کریں۔ اسی طرح والدین شیر خوار بچوں کو کیوں اپنے ہی منہ کے نوالہ پیش کریں۔ یہ احساس ذمہ داری محبت کا لازمی نتیجہ ہے۔ احساس ذمہ داری اپنائے بغیر محبت کی توہین ہے اور محبت ادھوری ہے۔۔۔۔ یہ رشتے مختلف ہو سکتے ہیں جس سے ہمیں محبت ہوتی ہے اور اس کے لئے اپنے دل میں احساس ذمہ داری بھی رکھتے ہیں۔ وسیع تناظر میں دیکھے تو ہمارا ایک رشتہ انسانیت سے بھی ہے۔ اسی وجہ سے ایک سلیم الطبع انسان ہر دوسرے انسان سے محبت رکھتا ہے۔ ان کے دکھ درد میں شریک ہوتا ہے۔ ان کی خوشی اپنی خوشی اور ان کی غمی اپنی غمی گردانتا ہے۔ لیکن۔۔۔۔۔۔ لیکن ان سب رشتوں سے بڑھ کر ہمارا ایک بہت ہی مقدس

رشتہ ہمارے خالق کے ساتھ بھی ہے۔ جس نے ہمیں تخلیق کیا ہے تو کیوں نہ اس سے محبت کا رشتہ قائم ہو اور محبت کے لازمی نتیجے کے طور پر انسان اپنی ذمہ داری کا احساس بھی کریں ۔یہی محبت اور یہی احساسِ ذمہ داری مذہب کی بنیاد ہے اور یہی سے مذہب پھُوٹا ہے۔

ہلکی سی خاموشی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کیف دوبارہ بول پڑا۔

لیکن فلسفی حضرات تو کہتے ہیں کہ مذہب خوف کی پیداوار ہے۔ جب انسان کو اس دنیا میں زلزلوں، سیلابوں، موسم کی بدحالیوں اور وباؤں وغیرہ سے سابقہ پیش آیا تو ان کے ڈر سے انسان انہی مظاہر فطرت کے بارے میں وہم میں مبتلا ہوا۔ اسی وہم نے انسان کو اس نتیجے پر لا کھڑا کر دیا کہ ان مظاہر کو کنٹرول کرنے کے لئے اَن دیکھی طاقتوں کی پرستش شروع کی جائے۔ لہٰذا کبھی سورج کو دیوتا بنایا گیا کہ اس کی عبادت سے ان آفات سے چھٹکارا پایا جا سکتا ہے، کبھی ستاروں اور سیاروں کو دیوتا بنایا گیا، کبھی روح کو وغیرہ وغیرہ۔ غرضیکہ بہت سارے دیوتا وجود میں آ گئے۔ پھر ان دیوتاؤں کے بت بننے لگے اور اصنام پرستی کا آغاز ہوا۔ معبدیں تعمیر ہونے لگیں۔ پھر ان دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے بتوں پر چڑھاوے اور قربانیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ مختصراً یہ کہ ان تمام سرگرمیوں کے پیچھے جو وجہ کارفرما تھی وہ صرف اور صرف قدرت کی قوتوں کو مسخر کرنا تھا اور پُراسرار قوتوں کا حصول تھا۔

عبدالاحد صاحب گہری دلچسپی سے کیف کی باتیں سن رہا تھا اور بار بار سر کو تفہیمی انداز میں جنبش دے رہا تھا۔

کیف کے سوال کے اختتام پر عبدالاحد صاحب دھیمے لہجے میں گویا ہوا۔

بیٹا ! آپ نے جو نقطہ نظر بیان کیا ہے اس کو آغازِ مذہب کا ارتقائی نظریہ کہتے ہیں۔ آغازِ مذہب کے بارے میں ہمارے پاس دو نظریات ہیں۔ ایک ارتقائی نظریہ اور ایک الہامی نظریہ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ارتقائی نظریہ برائے آغازِ مذہب چند فلسفیوں کا خیال ہے لیکن بہت سے فلسفی اسکے سخت ناقد بھی ہیں۔

ارتقائی نظریہ اُس وقت قابل قبول ہو سکتا ہے جب ہم یہ مان لیں کہ یہ ساری دنیااور کائنات آپ سے آپ بن گئی ہے اور کسی برتر ہستی نے اسے تخلیق نہیں کیا ہے بلکہ ارتقائی عمل سے یہاں تک پہنچی ہے۔ تو جب یہ مانا جائے کہ یہ پوری کائنات خود بخود تخلیق ہو گئی، پھر آہستہ آہستہ چرند، پرند، جمادات و نباتات اور بالآخر ترقی کرتے کرتے انسان ارتقائی عمل سے وجود میں آگیا۔ تبھی جا کے اسکے ساتھ مذہب کا ارتقاء ممکن ہو سکتا ہے۔ لیکن پھر بھی جو کچھ کہا جائے گا وہ سارے کا سارا ایک خیال گردانا جائے گا کیونکہ لکھی ہوئی تاریخ کسی کے پاس بھی موجود نہیں۔۔۔۔ میری نظر میں تو یہ ایک واہمہ ہے کیونکہ کائنات چیخ چیخ کے پکار رہی ہے کہ اسے ایک عظیم ذہن نے بڑی شدّ ومدّ اور اہتمام کے ساتھ تخلیق کیاہے اوراسی تخلیق کے ساتھ ساتھ اسکے مقاصد بھی متعین کئے ہیں۔ جو ارتقائی عمل ان چند فلسفیوں کے ذہن میں ہے وہ زمین کے عمر کے لحاظ سے ممکن بھی نہیں کیونکہ زمین کی عمر اس ارتقاء سے کہیں کم ہے۔ تو کیونکر ایسی عجلت امیز ارتقاء پر بندھے آنکھوں یقین کیا جائے۔ عقل و دلیل یہاں پر ساتھ دینے سے انکاری ہے۔۔۔۔۔ صاف انکاری ہے۔

اسی طرح اس ارتقائی نظریے کو ایک اور زاویے سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں اس نظریے کے مطابق قدرتی آفات کی وجہ سے جو نعمتیں چھین جاتی ہیں اس کے ڈر سے مذہب وجود میں آیاہے۔ اگر غور کیا جائے تو پہلے نعمت موجود ہو گی تب ہی اسکا چھین جانا وقوع پذیر ہو سکتاہے۔ لہٰذا ہونا تو چاہیئے تھا کہ پہلے نعمت کے ہونے کا احساس پیدا ہو تا تب جا کر اس کے چھین جانے کا خوف انسان کو اپنے حصار میں لے لیتا اور یہی فطری طریقہ عمل ہے۔ پہلے مجھے کسی چیز سے محبت ہو گی اس کا احساس ہو گا تب کہیں جا کے اس محبت کے بچھڑنے کا خدشہ لاحق ہو گا۔ لیکن ارتقائی نظریے کے حامل فلسفی اس پہلے جذبے و احساس کو یکسر نظر انداز کر

دیتے ہیں اور فوراً چھلانگ لگا کر خوف کی منزل پر ڈھیرے ڈال دیتے ہیں۔ لہٰذا اگر پہلے جذبے و احساس کو نظر انداز نہ کیا جاتا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلنا تھا کہ نعمت کی موجودگی پر اس کا احساس انسان کو کسی ایسے نقطۂ نظر کی طرف راغب کر دیتا جس سے وہ اس نعمت کی توقع و شکر گزاری کرتا۔ یہی نقطۂ نظر مذہب کا پہلا بیج ہو سکتا تھا۔ کیونکہ انسان باشعور ہستی ہے وہ اگر نعمت کے چھین جانے کے خوف کی وجہ سے مذہب قبول کر سکتا ہے تو اسی نعمت کے حصول پر بھی کر سکتا ہے۔ نیستی کا اگر ادراک ممکن ہے تو بلاشبہ ہستی کا بھی ممکن ہے بلکہ ہستی کا ادراک نیستی کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے کیونکہ روزمرہ زندگی میں اس کے امکانات زیادہ ہیں۔ انسان کا نعمتوں سے سامنا اسکے چھین جانے سے کہیں زیادہ ہیں۔ قدرت کی ڈھیر ساری نعمتوں سے لذت اٹھانا ہمارا روز کا معمول ہے لیکن ان کے برخلاف زلزلے، طوفان اور قدرتی آفات روزمرہ کا معمول ہرگز نہیں۔ اس لئے ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ ارتقائی نظریہ ناقص العقلی کا شکار ہے اور بہت بڑے اور شدید تنقید کی زد میں ہے۔

جبکہ اسکے متصادم جو نظریہ میں نے بیان کیا ہے یعنی مذہب کا الہامی نظریہ وہ بالکل قرینِ قیاس ہے۔ ہم مذہبی لوگ اس کائنات کو مخلوق مانتے ہیں کہ اس کو ایک عظیم ہستی نے تخلیق کیا ہے۔ اس کائنات کے مخلوقات میں برتر ہستی کا مقام حضرت انسان کو حاصل ہے جس کی شخصیت دو حصوں میں منقسم ہے۔ مادی وجود اور روحانی وجود۔ تو یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ اس عظیم اور دوراندیش خالق نے انسان کی مادی ضروریات کا خیال رکھا ہو اور روحانی ضروریات کو یونہی چھوڑ دیا ہو۔ کس طرح وہ اپنی باشعور مخلوق کو بے نکیل چھوڑ سکتا ہے کہ یونہی بھٹکتا پھرے۔ اصل میں مسئلہ یہ ہے کہ یہ انسان کی طبعیت کا خاصہ ہے کہ وہ حواسِ خمسہ کی یافت کو بہت آسانی سے اور جلدی محسوس کر لیتا ہے کیونکہ اس کا تعلق مادی دنیا سے ہے جبکہ شعور اور احساس کو اتنی جلدی اور آسانی سے اپنی گرفت میں نہیں لیتا کہ یہ روحانی دنیا سے وابستہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے اردگرد پھیلے ہوئے اس خوبصورت کائنات

میں ہم مادی لحاظ سے ہر قسم کا فائدہ اٹھاتے ہیں اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ لیکن یہ احساس پیدا ہونے میں وقت لگتا ہے اور دقت و مشکل پیش آتی ہے کہ سب کچھ ایک خالق کی پیداوار ہے اور اگر یہ سب کچھ انسان کی جسمانی ضروریات کے لئے ہیں تو ایسی ہی روحانی ضروریات اور ہدایت کے لئے کیا منصوبہ بندی اختیار کی گئی ہے؟ اور کیوں نہ کی گئی ہو۔ یہی روحانی ضرورت اوراس کی تکمیل کے لئے منصوبہ بندی مذہب کے ہونے کا سبب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان اول حضرت آدمؑ کو جب اس دنیا میں بھیجا تو روزِ اول ہی سے ان کے تمام مادی ضروریات کی طرح ان کے روحانی ضروریات یعنی دینی ہدایت کا بھی سامان کیا۔ اسی بنیاد پر ہم کہتے ہیں کہ ہمارے جد امجد یعنی انسان اول پوری طرح ہدایت یافتہ تھے۔ وہ نہ صرف توحید پرست تھے بلکہ توحید الٰہی کے پیغمبر بھی تھے۔ جبکہ ارتقائی نظریے کے حامل لوگ انسانیت کی ابتداء گمراہی اور بھٹکنے سے کرتی ہے۔ میں اپنے اباواجداد کو روشنی میں دیکھتا ہوں اور وہ تاریکی میں۔ اسی طرح ان حضرات کے بقول خدا خوف کی پیداوار ہے جب کہ میرے لئے خدا محبت کا نتیجہ ہے۔

عبد الاحد صاحب محفل میں ہر ایک کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ وہ بھی دورانِ گفتگو ہر ایک کی طرف توجہ کر رہا تھا لیکن اصل توجہ کیف کی طرف تھی۔ کیف کے چہرے پر افسردگی اور گہرے تفکر کے اثرات رقصاں تھے۔ بعض دفعہ تو ایسے لگ جاتا جیسے ذہنی طور پر وہ محفل کا حصہ نہیں ہے بلکہ اپنی خیالی دنیا میں کہیں گھوم رہا ہے۔ اسی دوران عُویم بھی سوالات کے میدان میں کود پڑا۔

سر جی! بعض نفسیات دانوں کا خیال ہے کہ مذہب انسان کے اپنے لاشعور کی پیداوار ہے نہ کہ فی الواقع کسی خارجی حقیقت کا انکشاف۔ اسی طرح وحی والہام محض بچپن میں دبے ہوئے خیالات کا ایک غیر معمولی اظہار ہے۔ یہ موت کے بعد کی دوسری دنیا، جنت اور دوزخ کا تصور محض انسانی ذہن کی اختراعیں ہیں۔ یہ وہ آرزوئیں ہیں جو اس دنیا میں سازگار حالات

نہ ہونے کی وجہ سے پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتے۔ لہٰذا انسان اپنے لئے فرض کر لیتا ہے تا کہ اسے ذہنی سکون ملے۔

عُویم کی خاموشی ہونے پر عبد الاحد صاحب مسکرایا اور بولنے لگا۔

میرے لختِ جگر! آپ کے سوال کے دو حصے ہیں۔ لہٰذا اس پر الگ الگ سے گفتگو کرتے ہیں۔

پہلا حصہ یہ کہ مذہب انسانی لاشعور کی اپنی ایجاد ہے اور وحی و الہام دبے ہوئے خیالات کا اظہار ہے اور کچھ نہیں۔

میری نظر میں یہ ان لوگوں کا خیال ہو سکتا ہے جو شعور و لاشعور کی بحث کا صحیح اطلاق وحی والہام پر نہیں کر سکتے ہیں۔ یا وحی والہام کا دعویٰ کرنے والی شخصیت جسے ہم پیغمبرؑ کہتے ہیں، اُس پر نہیں کر سکتے ہیں۔ لہٰذا پہلے شعور و لاشعور کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

انسانی ذہن کے افکار و خیال کو ہم دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک شعور جو کہ عام طور پر ہوش و حواس کی حالت میں ہمارے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں اور دوسرا لاشعور جس میں وہ افکار شامل ہوتے ہیں جو ہمارے علم و حافظے کے سامنے وقتی طور پر موجود نہیں ہوتے بلکہ اسکی پوشیدہ تہہ میں زندہ رہتے ہیں۔

انسانی ذہن کے سامنے جب بھی کوئی خیال آتا ہے تو وہ سب سے پہلے شعور کے خانے میں پہنچ جاتا ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ خیال شعور کے خانے سے نکل کر اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو کر لاشعور میں چلا جاتا ہے اور وہاں اپنا بسیرا کر دیتا ہے۔ ذہن کی تمام یادداشت و معلومات کو اگر تقسیم کیا جائے تو تقریباً 10 فیصد حصہ شعور پر مشتمل ہوتا ہے جبکہ باقی 90 فیصد حصہ لاشعور پر۔ شعور قلیل المعیاد حافظے کا مرکز ہے جب کہ لاشعور طویل المعیاد حافظے کا شاخسانہ۔ جس طرح ایک دفتر میں مختلف کاغذات کو کام کرنے کی خاطر جمع کیا جاتا ہے اور وہاں ان کاغذات سے متعلقہ امور کو نپٹایا جاتا ہے۔ اس دوران یہ کاغذات اور

متعلقہ امور نظروں کے سامنے ہوتے ہیں اور شعور کے خانے میں گردش کر رہے ہوتے ہیں۔ لیکن متعلقہ امور نپٹانے کے بعد ان کاغذات کو الماری میں رکھ کر محفوظ کر دیا جاتا ہے تو آہستہ آہستہ یہ امور لاشعور کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق انسان تقریباً 21 سال کی عمر میں سو سے زائد انسائیکلوپیڈیا جتنی معلومات اپنے لاشعور میں مستقل طور پر محفوظ کر لیتا ہے۔

یہاں پر ایک اور حقیقت کو اس بحث کے ساتھ خلط ملط نہ کر دینا وہ یہ کہ یہاں شعور و لاشعور کی بحث ہم انسانی علوم و تصورات کے ضمن میں کر رہے ہیں۔ یہ وہ خانے ہیں جو انسانی تصورات، خیالات اور معلومات سے بھرتے رہتے ہیں۔ یعنی کسی بھی شے کے بارے میں ہمارے ذہن کی اپنی داخلی کرشمہ سازی۔ اسی داخلی حقیقت کے بارے میں ملحد نفسیات دانوں کا اعتراض ہے کہ مذہب ان تصورات کی پیداوار ہے۔ اس مظہر کے ساتھ ساتھ ایک اور مظہر بھی بیک وقت موجود رہتا ہے جس کا منبع خارجی حقیقت میں ہے اور انسان میں پہلے دن سے ودیعت کر دیا گیا ہے۔ اس کو انسان کی فطرت کا حصہ بنایا گیا ہے۔ مذہبی لوگ اس کو عہد الست کہتے ہیں۔ اس نظریے کے مطابق تمام انسانوں کے روحوں کو جب پیدا کیا گیا تو اس پر تمام حقیقت آشکارا کی گئی اور ان سے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور الٰہ ہونے کا عہد لیا گیا۔ یعنی شروع دن سے انسان کو تحفتاً خدا اور مذہب کا تصور دیا گیا لیکن اس دنیا میں امتحان کی خاطر اس فطرت کی کھوج پَرکھ اور اس سے مطابقت ہم انسانوں پر چھوڑ دیا گیا۔ انسان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ تحفہ ملنے اور حقیقت کے آشکارا ہونے کا ثبوت علم نفسیات کی تحقیق میں مل چکا ہے جس کے مطابق بچہ اپنی پیدائش کے دن ہی سے ایک صاحب علم ہستی ہوتا ہے۔ اور یہی قرآن کریم کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانِ اول حضرت آدمؑ کو علم سکھایا اور مختلف چیزوں کے نام سکھائے۔ اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ ان نفسیات دانوں کا بنیادی استدلال ہی غلط ہے کہ مذہب انسانی لاشعور کی پیداوار ہے جبکہ اس کے برعکس مذہب مکمل

طور پر ایک خارجی مظہر ہے جسکا منبع عہد الست کی بنیاد پر انسانی فطرت میں موجود ہے اور انبیاء کرامؑ کی دعوت و تلقین میں بھی کیونکہ انبیاء کرامؑ کا کام اسی عہد الست کی یاد دہانی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کو کسی بے نکیل اور بے راہ اونٹ کی طرح پیدا نہیں کیا گیا بلکہ اس کی فطرت میں مذہب کا خمیر ڈالا گیا ہے جس کی کوج پرکھ کے لئے عقل جیسا عظیم الشان تحفہ بھی دیا گیا ہے تاکہ انسان اسکا استعمال کرکے حقیقت تک پہنچے اور منظم و مرتب کائنات اوراحساسات سے روشناس ہو جائے۔ اس پر بڑھ کر انبیاء کرامؑ کا سلسلہ بھی جاری کر دیا گیا تاکہ وقتاً فوقتاً انسان کو اپنی فطرت اور عقلی تقاضوں کی طرف بلاتا رہے اور کہیں سے ہدایت کے لئے خلا باقی نہ رہ جائے۔ یہاں پر کچھ نفسیات دان بیچارے فرماتے ہیں کہ مذہب کا مقدمہ لاعقلی پر قائم ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ عقل کے استعمال کی جتنی تاکید مذہب کرتا ہے شاید ہی کوئی اور نظریہ کرتا ہو۔ الہامی کتابوں کا مطالعہ کرو، صفحے صفحے پر عقل کے استعمال پر زور دیا گیا ہے کہ اپنے ہی عقل کو استعمال کرکے خدا کو تلاش کرو۔ ان نفسیات دانوں سے ہم صرف یہی درخواست کرسکتے ہیں کہ مذہب کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لئے مذہب کے بنیادی کتب کا مطالعہ کریں اور بلا تعصب کے کریں۔ یہ بنیادی کتابیں الہامی کتابوں کی شکل میں دنیا کے کونے کونے میں ہر زبان میں ترجمہ شدہ موجود ہیں۔

اچھا۔۔۔ اب یہاں کوئی سوال کرسکتا ہے کہ عہد الست اگر انسانی فطرت میں موجود ہے تو یاد کیوں نہیں؟ اس کا سیدھا سادہ جواب ہے کہ اگر یاد رہتا تو امتحان کی وقعت ہی ختم ہو جاتی جبکہ یہ دنیا امتحان کے اصول پر بنائی گئی ہے۔ ان عقائد کے بارے میں برسٹل یونیورسٹی میں ڈیویلپمنٹل سائیکالوجی(Developmental Psychology)کے پروفیسر بروس ہُڈ(Bruce Hood)کی تحقیقات یہ بتاتی ہے کہ مافوق الفطرت قسم کے عقائد ہماری پیدائش کے وقت ہمارے ذہن میں وائرنگ کر دی جاتی ہیں۔ لہٰذا مذہب ایک نہایت قوی

نفسیاتی قوت سے فیض پاتا ہے۔ لوگوں کو عقائد ترک کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش بے سود ہے اس لئے کہ عقائد انسانوں کی فطرت سے اٹھتے ہیں۔

اب دوبارہ پلٹتے ہیں اپنے شعور ولاشعور کے بحث کی طرف۔ لاشعور خواہ کتنا ہی نظروں سے اوجھل ہو اس کا ہماری شخصیت پر اثر ضرور ہوتا ہے اور وقتاً فوقتاً اپنی پہچان کراتا رہتا ہے۔ اس کی سب سے بہترین مثال "مطالعہ" ہے۔ ہم میں سے ہر کوئی روزانہ کی بنیاد پر مختلف کتابیں ورسائل پڑھتا رہتا ہے اور خوب سوچ سمجھ کر پڑھتا ہے۔ لیکن اگر کچھ وقت گزرنے کے بعد اسکا امتحان لیا جائے تو وہ اسی طرح یاد نہیں ہوگا جس طرح دورانِ مطالعہ یاد رہتا ہے لیکن اس کے باوجود اس میں ذرہ برابر بھی شک نہیں کہ اس مطالعے کی گہری چھاپ ہماری شخصیت پر نظر آتی ہے اور ہر وقت نظر آتی ہے۔

مذکورہ بالا تمام بحث سے یہ نتیجہ آسانی سے نکالا جا سکتا ہے کہ انسان کا لاشعور اصل میں ایک خلاء ہے جس میں پہلے سے کوئی چیز موجود نہیں ہوتی بلکہ معلومات، خیالات و تصورات شعور کے راستے سے گزر کر آہستہ آہستہ اس خلا کو بھرتی رہتی ہے۔ لہٰذا یہ کوئی نامعلوم حقائق کا خزانہ نہیں بلکہ ان معلومات و تصورات کا رجسٹر ہے جو کبھی انسانی علم و عقل کی راہ سے گزرے ہو۔ اسی ہی معلومات پر ہر انسان کی عقل اپنی پراسیسنگ (Processing) کرتی ہے اور اپنی طبیعت و استعداد کے مطابق نئی چیزیں تراش لاتی ہیں جس سے نت نئے راستے کھلتے رہتے ہیں۔ یوں علم کی دنیا آگے بڑھتی رہتی ہے اور معلومات میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اب کوئی صاحب عقل کس بنیاد پر ان لاشعوری حقائق کا اطلاق انبیاء کرامؑ پر کر سکتا ہے کہ وحی والہام ان دبے ہوئے خیالات کا اظہار ہے اور مذہب انسان کے اپنے لاشعور کی پیداوار ہے۔ جبکہ اس الزام کے برعکس انبیاء کرامؑ ایسی ایسی رازوں سے پردے اٹھاتے ہیں جو نہ تو انہیں بذات خود پہلے سے معلوم تھی اور نہ بیان کرتے وقت پوری انسانی نسل کو معلوم ہو سکیں تھیں۔ اگر انبیاء کرامؑ کے پیش کردہ حقائق کا سرچشمہ لاشعور

ہو تا تو وہ ہر گز ایسے نامعلوم حقائق کا اظہار نہ کرتے۔ انبیائے کرامؑ کے قول و فعل سے انکی تاریخی مثالیں پوری دنیا کے سامنے ہیں جو کہ مسلّمہ حقائق بن چکی ہیں۔ جب بھی انبیاء کرامؑ نے اپنے مخالفین پر فتح کی پیشن گوئی کی وہ مِن و عَن پوری ہوئی۔ حالانکہ انبیائے کرامؑ کے ساتھی پیشن گوئی کے وقت کمزور ترین لوگ ہوا کرتے تھے جن کے پاس نہ افرادی قوت ہوتی تھی اور نہ مالی طاقت جبکہ مقابلہ بادشاہِ وقت سے ہوتا تھا جو کہ ہر قسم کے اسلحے و افرادی قوت سے لیس ہوتا تھا۔ اس کے باوجود حق کا ٹولہ باطل سے نبرد آزما ہوا کرتا اور جیت بھی حق ہی کی نصیب ہوتی تھی۔ تنِ تنہا ایک مضبوط ریاست کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنا اور اس کو جیت کر دکھانا ایک بہت بڑے حوصلے اور یقین و اعتماد کی شہادت ہے۔ نمرود کے مقابلے میں حضرت ابراہیمؑ کی مثال موجود ہے۔ فرعون کے مقابلے میں موسیٰؑ کی مثال سب کے سامنے ہے۔ نزدیک تاریخ میں سردارانِ مکہ کے خلاف محمد الرسول اللہؐ کی مثال موجود ہے۔ کون یہ یقین کر سکتا تھا کہ مکہ مکرمہ کی وادی میں ایک شخص اکیلے اٹھ کھڑا ہو گا پورے عرب کے سرداروں کو للکارے گا اور ساتھ میں پورے یقین کے ساتھ اس بات کی تنبیہہ بھی کرتا رہے گا کہ فتح اسلام ہی کی ہو گی اور بالآخر 23 سال کے عرصے میں فتح حاصل بھی کر لے گا۔ یہ انبیائے کرامؑ کی صداقت کی گواہی نہیں تو اور کیا ہے؟

کون ان کو بتاتا ہے کہ آپ اپنے مشن پر ڈٹے رہو فتح آپ کو نصیب ہی ہو گی۔ اس کے ساتھ ساتھ انبیائے کرامؑ پر یقین و تسلیم کے لئے جو حقیقت مجھے اپنی طرف سب سے زیادہ کھینچتی ہے وہ انبیائے کرامؑ کا انتہائی تیقن اور وثوق والا لہجہ ہے۔ وہ ایسے بات کر رہے ہوتے ہیں جیسے وہ پوری دنیا اور انسانی تاریخ و مستقبل کا ایک اونچے مینار سے مکمل علم کے ساتھ مشاہدہ کر رہے ہو۔ جس کے علم کی گرفت میں زمان و مکان کا ہر ذرہ شامل ہوتا ہے۔ وہ مکمل بھروسے و اعتماد کے ساتھ بات پہنچا رہا ہوتا ہے کہ "ایسا ہی ہے"، "اس میں کوئی شک نہیں"، "ایسا ہی ہو گا"، "اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں"۔ "شاید" کا لفظ ان کے غیر مانوس ہوتا

ہے۔ میری نظر میں بلکہ کسی بھی سلیم الطبع وعاقل شخص کی نظر میں ایسے وثوق کا لہجہ عام انسان کا خاصہ نہ ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

اب ایک مثال قرآنِ کریم سے پیش کرتا ہوں، سورہ روم سے۔

ہُوا یوں کہ حضورؐ کی بعثت سے چند سال پہلے ایران اور روم کی سلطنتوں کے درمیان چپقلش شروع ہوئی۔ اس وقت دنیا میں یہی دو بڑی سلطنتیں تھیں۔ سلطنت ایران جو کہ عرب کے مشرق میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے بادشاہ کو کسریٰ کہا جاتا تھا۔ دوسری روم کی سلطنت جو کہ عرب کے شمال مغرب میں پھیلی ہوئی تھی اور اس کے بادشاہ کو قیصر کہا جاتا ہے ۔ ایران کا مذہب مجُوسیت تھا اور یہ لوگ آگ کو پُوجتے تھے جبکہ رومی عیسائی تھے۔ ان دونوں بڑی سلطنتوں کے چپقلش کے نتیجے میں خونریز جنگیں لڑیں گئیں۔ شاہ ایران خسرو پرویز نے اس جنگ کو مجوسیت اور میسیحیت کی مذہبی جنگ کا رنگ دے دیا۔ اور رومی سلطنت پر چڑھائی کر دی۔ شاہ روم ہرقل میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اس طوفان کا مقابلہ کر سکے کیونکہ ایران کا پلہ ہر لحاظ سے بھاری تھی۔ اسی وجہ سے ایرانیوں نے روم کی فوج کو پے در پے شکستیں دے کر ان کے بڑے بڑے شہر فتح کر دیے۔ 613ء میں دمشق فتح ہوا۔ 614ء میں بیت المقدس فتح ہوا جس میں مسیحیوں کا مقدس ترین کلیسا تباہ کر کے مسیحی دنیا پر قیامت ڈھا دی گئی۔ بیت المقدس کے قبضے میں تقریباً 90 ہزار عیسائی قتل کر دیئے گئے۔ مسیحیوں کا مقدس صلیب چھین کر مدائن لے جایا گیا۔ بڑے بڑے گرجاگھر مسمار کر دیے گئے۔ مقدس مقامات پیوند خاک کر دیے گئے۔ بیت المقدس کی فتح نے شاہِ ایران خسرو پرویز کو عجیب سحر و تکبر میں مبتلا کیا۔ غرضیکہ 615ء میں ایران نے روم پر مکمل قبضہ حاصل کیا۔ اسی دوران یہ سورۃ روم نازل ہوئی۔ یہ نبوت کے ابتدائی سال تھے اس سورۃ کے ابتدائی آیاتوں میں اللہ تعالیٰ نے بزبانِ رسول حضرت محمدؐ مستقبل کے 2 رازوں سے پردہ اٹھایا ہے جو ہُو بہُو سچ ثابت ہوئی۔ سورۃ روم کی آیت 2 سے 4 کا ترجمہ پیش کئے دیتا ہوں۔

"رومی پاس کے علاقے میں مغلوب ہوئے اور وہ اپنی مغلوبیت کے بعد عنقریب چند سالوں میں غالب آجائینگے۔ اللہ ہی کے حکم سے ہوا جو پہلے ہوا اور اللہ ہی کے حکم سے ہوگا جو بعد میں ہوگا۔ اور اس وقت اہلِ ایمان مسرور ہوں گے"۔

ان آیتوں میں دو پیشنگوئیاں کی گئیں ایک یہ کہ شکست خوردہ رومی چند سالوں میں دوبارہ ایران پر غالب آجائینگے اور دوسری یہ کہ مسلمان جو اس وقت مکہ مکرمہ کے مشرکین کے ہاتھوں ظلم وستم کا شکار ہیں، وہ بھی اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی فتح پر خوشیاں منائیں گے اور مسرور ہوں گے۔ یہ دونوں پیشنگوئیاں اس وقت اتنی بعید از قیاس تھیں کہ کوئی بھی شخص جو اس وقت کے حالات سے واقف ہو ایسی پیشنگوئیاں نہیں کر سکتا تھا۔ بظاہر دور دور تک کہیں اس کے آثار موجود نہ تھے کہ ان میں کوئی ایک بھی پیشنگوئی چند سال کے اندر اندر پوری ہو۔ کیونکہ ایک طرف مٹھی بھر کمزور مسلمان تھے جو مشرکینِ مکہ کے ظلم وستم میں دَبے اور پِسے ہوئے تھے اور دوسری طرف ایران کا روم پر سخت ترین غلبہ اور روم کی انتہائی کسمپرسی تھی۔ انگریز مؤرخ ایڈورڈز گبن(Edwardes Gibbon) کے بقول" قرآن مجید کی اس پیشن گوئی کے بعد سات آٹھ برس تک حالات ایسے تھے کہ کوئی شخص یہ تصور تک نہیں کر سکتا تھا کہ رومی سلطنت ایران پر غالب آجائے گی۔ بلکہ غلبہ تو درکنار اس وقت کسی کو یہ امید بھی نہ تھی کہ اب سلطنتِ روم زندہ رہ جائیگی"۔ اس بعید از قیاس پیشنگوئی کا مکہ مکرمہ کے مشرکین نے کافی مذاق اڑایا۔ کیونکہ کمزور ولاچار مسلمانوں کو مشرکین و سردارانِ مکہ پر فتح کی نوید سنائی گئی تھی جو مشرکین کے وہم وگمان میں بھی نہ تھی اور ساتھ ساتھ مضبوط وغالب ایران پر مغلوب روم کے غلبے کی بات بھی کی گئی تھی۔ اس میں مشرکین مکہ کے لئے تعصب اور مذاق اُڑانے کا پہلو یہ بھی تھا کہ ایران وروم کی لڑائی میں مسلمانوں کی ہمدردیاں روم کے ساتھ تھی کیونکہ مسیحیت الہامی مذہب ہونے کے ناطے اسلام سے مماثل ہے جبکہ مشرکین مکہ کی ہمدردیاں ایران سے تھی کیونکہ یہ دونوں توحید کے منکر تھے۔

پس ہوا یوں کہ 622ء میں نبی کریمؐ ہجرت کر کے مدینہ طیبہ تشریف لے گئے۔ اورادھر ہر قل نے خاموشی کے ساتھ ایران پر عقب سے حملے کی تیاری شروع کر دی۔ حالات نے عجیب و غریب پلٹا کھایا جس میں ہر قل کو ایسی کامیابی حاصل ہوئی کہ جنگ کا پورا پانسہ پلٹ گیا۔ ہر قل نے اپنا حملہ 623ء میں ارمینیا سے شروع کیا اور دوسرے ہی سال 624ء میں آذر بائیجان میں گھس کر ایرانیوں کے سب سے بڑے آتش کدے کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ اللہ تعالیٰ کا کرشمہ دیکھئے کہ یہی وہ سال تھا جس میں مسلمانوں کو بدر کے مقام پر عظیم الشان فتح نصیب ہوئی اور قریش کے بڑے بڑے سرداران مارے گئے۔ اس طرح قرآن کریم کی دونوں پیشگوئیاں دس سال کی مدت ختم ہونے سے پہلے پہلے بیک وقت پوری ہوئی جس کا بظاہر حالات کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔ اس سے آنحضرتؐ اور قرآن مجید کی سچائی روزِ روشن کی طرح عیاں ہو گئی۔

یہ تو ہو گئی تاریخی حقائق۔ اب ذرا پیغمبروں کے پیش کردہ تحریری اور صوتی سرمایہ اور معاشرے میں انکا کردار و مقام دیکھتے ہیں۔ جو لوگ یہ فرمارہے ہیں کہ وحی والہام لاشعور میں دبے ہوئے خیالات کا اظہار ہے، وہ سراسر یک رُخی جائزے پر بہت بڑی عمارت کھڑی کرنے کے درپے ہیں۔ جسکا علم و عقل کی دنیا میں کوئی مقام نہیں۔ کیا ان حضرات میں سے کوئی مجھے یہ بتا سکتا ہے کہ کیا لاشعور صرف اچھے، خوبصورت اور بہترین خیالات کا منبع ہیں؟ اس میں کیا برے اور بدصورت خیالات نہیں سماتے؟ ہو ہی نہیں سکتا۔ عام انسانی مشاہدہ تو یہ بتاتا ہے کہ لاشعور دونوں قسم کے خیالات کا مخلوط مسکن ہے۔ اچھوں کے ساتھ ساتھ برے خیالات بھی یہاں پل رہے ہوتے ہیں۔ اب جو بھی شخص اپنے لاشعور کا کھل کر بَر ملا اظہار کرے گا۔ وہ ضرور خیر اور شَر دونوں پہلوؤں سے نمایاں ہو گا۔ یقین نہیں، تو ابھی آپ سب اپنے لاشعور میں دبی ہوئی خواہشات کا جائزہ کر کے دیکھ لیں۔ لیکن اس کے برعکس انبیائے کرامؑ کی زبان سے جس مذہب کا ظہور ہوا ہے وہ سرتاسر خیر اور پاکیزگی ہے۔ ان کا

کلام اورانکی زندگی خیر اور پاکیزگی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ دنیائے تاریخ ابھی تک ان حضرات کا مثال پیش نہ کر سکی۔ مثال تو دور کی بات ہے ثانی ڈھونڈنا بھی ناممکنات میں شامل ہیں۔انبیائے کرامؑ اخلاقیات، خیر ،امن اور پاکیزگی کے اعلیٰ درجے پر فائز ہیں۔

اس گفتگو سے ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبروں کا علم کوئی عام انسانی علم نہیں ہوتا بلکہ وہ کائنات کے مالک وخالق کی طرف سے متعین اور بے عیب علم ہوتا ہے۔ کائنات کا مالک ہی اس طرح قطعی انداز اپنا سکتا ہے جس کی باتیں اوراصول دائمی ہوتے ہیں۔ وقت کے بہاؤ کے ساتھ بہہ نہیں جاتے بلکہ مستقل ہوتے ہیں۔ ارتقاءسے ماوراء ہوتے ہیں اور ناقابل تغیر ہوتے ہیں۔ ہر قسم کے اغلاط سے پاک ہوتے ہیں۔انکو کسی بھی صورت غلط ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

اب آتے ہیں آپ کے سوال کے دوسرے حصے کی طرف۔ لیکن اس سے پہلے مجھے پانی پلادیں۔

عبد الاحد صاحب نے عُویم سے مخاطب ہوکرپانی کی طرف اشارہ کیا گفتگو کی آخری باتیں کہتے ہوئے عبد الاحد صاحب کی آواز بیٹھ گئی تھی اوراس کے لہجے سے یقین واعتماد چھلک رہا تھا۔ وہ بالکل فیصلہ کن انداز میں محو گفتگو تھا۔

پانی پینے کے بعد دوبارہ گویا ہوئے۔

آپ کے سوال کا دوسرا حصہ یہ تھا کہ موت کے بعد کی دنیا، جنت اور دوزخ محض انسانی ذہن کی ایجاد ہے اور یہ وہ آرزوئیں ہیں جو ناساز گار حالات کی وجہ سے پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ پاتے۔ لہٰذاانسان اسے فرض کر لیتے ہیں۔

دنیائے عدالت کا قانون ہے کہ دعوے کو مدعی ہی ثابت کرے گانہ کہ مدعاالیہ۔یعنی ثبوت فراہم کرنے کی ذمہ داری دعویٰ کرنے والے کے کندھوں پرہے نہ کہ جس پر دعویٰ کیا گیاہے۔ اسی ہی دلیل کو لیکر آگے بڑھتے ہیں۔ دنیا میں کوئی ایک بھی ایسا شخص مجھے بتا

دیں، آج کا ہو یا تاریخ میں ڈھونڈ کر نکالیں جس کے ذہن میں جنت و دوزخ کا تصور نہ ہو، قطع نظر اس کے کہ یہ تصور مذہب نے دیا ہو یا فرض کر لیا ہو۔ یا ایسا شخص بتا دیں جس کے مَن میں جنت و دوزخ کے بارے میں سوال نہ ابھرتا ہو۔

امید ہے آپ کو ایسا شخص ڈھونڈ کر نکالنے میں سراسر ناکامی کا سامنا کرنا پڑیگا۔ اس پر ان ملحد نفسیات دانوں کا بھی اتفاق ہے کہ یہ تصور تو بہر حال موجود ہے۔ لیکن وہ اسے فرض کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس وقت مجھے غرض اس تصور کے وجود سے ہے۔ اس سے بالکل نہیں کہ یہ تصور فرض کر لیا گیا ہے یا حقیقی ہے۔ پس جس چیز کا وجود ثابت ہو جائے تو اس کے عدم کو تردید کرنے والے ہی ثابت کرینگے۔ مثال سے سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں فرض کیا میرے سامنے یہ میز پڑی ہے۔ سب کو اس بات پر اتفاق ہے کہ ہاں یہ میز ہے اور اسی وقت اگر کوئی شخص باہر سے آکر یہ دعویٰ کرے کہ یہ میز نہیں بلکہ ایک واہمہ ہے یا کچھ اور چیز ہے تو اس دعوے کو وہی مدعی ہی ثابت کرنے کا پابند ہے اور وہی ہی اپنے دعوے کے لئے دلائل فراہم کرے گا ہم نہیں۔ لہٰذا یہ سوال تو ہمارا بنتا ہے ان چند نفسیات دانوں سے کہ کیا آپ کے ذہن میں جنت و دوزخ کا تصور موجود نہیں؟ اگر ہے تو ذرا بتاؤ کہ کہاں سے آیا یہ تصور؟

کیا آپ کے دل میں اپنے خواہشات کو ٹھکانہ لگانے کی آرزو نہیں ہے؟ کیا یہ انسان کی نفسیات میں شامل نہیں ہے کہ جزا اور سزا کا تصور موجود رہے۔ عملاً بھی اور تصوراتی بھی۔ جنت و دوزخ اسی جزا اور سزا کے نتیجے کی انتہا ہے۔ انسان نے بحیثیت مخلوق جزا اور سزا کے تصور کو محسوس کر کے عدالتی نظام قائم کئے ہیں۔ تو اگر اسی تصور کو خالق اپنائے تو کیا مضائقہ؟

بیٹا! میری یہ بات یاد رکھ کہ جب بھی کسی تصور کو اخلاقیات اور عقل کی حمایت حاصل ہو جاتی ہے تو وہ انسانی زندگی کی اساس بن جاتی ہے۔ اب اگر کوئی اس کو ماننے سے جی چرائے تو وہ اور کچھ نہیں کر رہا بلکہ خود سے جھوٹ بول رہا ہے۔

اسی طرح نفسیات دانوں کے اس استدلال میں ایک اور کمزور پہلو بھی شامل ہے کہ یہ آرزوئیں ناساز گار حالات کی وجہ سے پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ پاتے۔۔۔۔ کیا پوری انسانی تاریخ میں کسی ایک شخص کو بھی ساز گار حالات میسر نہ ہوئے؟ کسی بادشاہ کو بھی نہیں؟ کوئی ایک تو ایسا ہونا چاہیئے جو اس دنیا میں ہر لحاظ سے مطمئن ہو جس کی کوئی ایک خواہش ادھوری نہ رہ گئی ہو۔ بادشاہ بھی خواہشات کا ڈھیر سینے میں لئے پھر رہا ہے اور اسکی تکمیل کے لئے تڑپ رہا ہے اور عام آدمی بھی۔ لہٰذا یہ ایک لغو خیال ہے کہ ناساز گار حالات کی وجہ سے آرزوئیں پوری نہ ہونا جنت کے فرض کئے جانے کی دلیل ہے۔ جنت کا ہونا انسانی سرشت میں شامل ہے۔ یہ ہماری جبلت کا تقاضہ ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ اگر ان چند ملحد نفسیات دانوں کے مطابق عقیدہ آخرت مٹا دیا جائے تو کوئی بعید نہیں کہ یہ دنیا ظلم و ستم کی آماجگاہ بن جائیگی۔ عقیدہ آخرت کے بغیر اخلاقی اصولوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر اس دنیا میں جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا قانون رائج ہونے میں کوئی دیر نہیں لگے گی۔

یہ تو ہُوا چند نفسیات دانوں کے خیالات کا تنقیدی جائزہ۔ اب ان خیالات کو جدید ریسرچ کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔

سب سے پہلے یہ بتاتا چلوں کہ ان خیالات کی بنیاد آسٹریا کے ماہر نفسیات سگمنڈ فرائڈ نے رکھی۔ فرائڈ نے مذہب کو نفسیاتی بیماری قرار دیا۔ جس کی وجہ سے الحاد کو علمِ نفسیات سے حمایت مل گئی اور یوں الحاد نے سب سے زیادہ زور نفسیات دانوں میں پکڑا۔ لیکن جدید تحقیق سگمنڈ فرائڈ کے ان خیالات کے برعکس ہے۔

جارج واشنگٹن یونیورسٹی کے ادارہ برائے مطالعۂ سماجی پالیسی کے ایسوسی ایٹ ڈائریکٹر پیٹرک گلائن اپنی کتاب "خدا: ایک شہادت" (God: The evidence) میں رقمطراز ہے۔

"گزشتہ پچیس سالوں میں نفسیات کے میدان میں تحقیق نے واضح کر دیا ہے کہ فرائڈ اوراس کے شاگردوں کے دعوے کے مطابق کہ مذہب ایک نفسیاتی بیماری ہے، ریسرچ اس دعوے کو غلط ثابت کرتی ہے۔ حقیقت میں مذہبی عقیدہ ذہنی صحت اور مُسرت کے لیے ایک لازمی عُنصر ہے۔ ریسرچ پر ریسرچ اس حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے کہ مذہبی عقیدہ اوراس پر عمل خودکشی، شراب نوشی، منشیات، طلاق، ذہنی تناؤ اور شادی کے بعد جنسی عدمِ تسکین کے خلاف صحت مندانہ رویے میں حیران کن طور پر مضبوط باہمی تعلق کا پتہ دیتی ہے۔ مختصر یہ کہ مشاہداتی ڈیٹا نفسیاتی تحقیق کے میدان میں سائیکوتھیراپیک اجماع کے بالکل خلاف نتائج پیش کرتا ہے۔ اس صورتحال کا انوکھاپن نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ کے سابق نفسیات دان ڈیوڈ۔بی۔ لارسن نے واضح کر دیا ہے۔ اس نے ان تحقیقاتی مطالعہ جات کو منضبط کیا ہے۔ اسکے مطابق

"اگر ایک نیا علاج دریافت کیا جائے جو نوجوانوں میں خودکشی کی شرح کم کرنے میں مدد دے، شراب نوشی اور نشے کو روکنے میں مدد دے، ذہنی تناؤ کے علاج کو بہتر بنائے، آپریشن سے جلدی افاقے میں مدد دے، طلاق کی شرح کم کرنے میں مددگار ہو اور صحت مندی کے احساس میں اضافہ پیدا کرے، تو بلاشبہ ہر ڈاکٹر اس علاج کو آزمانے کے لئے لپکے گا۔ لیکن دوسری طرف بھی اگر ناقدین ان تحقیقات کو نقصان دہ قرار دے کر ردّ کر دے، باوجود اس کے کہ تحقیقات نے اس کو 80 فیصد تک مفید ثابت کر دیا ہو تو آپ کونسی بات پر یقین کرنے کے لیے تیار رہینگے؟ ناقدین کے اپنی آراء پر مبنی دعوؤں پر یا ٹھوس تحقیقات پر مبنی کلینکل تجربات کے نتائج پر؟"

یہ نیا علاج جس کے بارے میں لارسن بات کر رہا ہے، بلاشبہ مذہبی ایمان و تیقن ہے۔ لاتعداد تحقیقی مطالعے یہ بات ثابت کر رہے ہیں کہ غیر مذہبی لوگوں کے مقابلے میں مذہبی لوگوں میں خودکشی، نشہ و شراب نوشی، نڈھال کر دینے والی ذہنی تناؤ و دباؤ اور طلاق کی شرح بہت کم ہے"۔

یہ ایک نفسیات دان کے خیالات ہیں جو انہوں نے تجربے کی بنیاد پر بیان کئے ہیں اور اپنے ساتھ دوسرے نفسیات دان کے خیالات بھی پیش کئے ہیں۔ آخر میں بتاتا چلوں کہ یہ کتاب 1997ء میں شائع ہوئی ہے اور اس کا مصنف پیٹرک گلائن پہلے مذہبی شخص تھا، پھر مُلحد بنا اور پھر واپس پلٹ کے مذہبی بن گیا۔ اس کا کہنا تھا کہ "کئی سال فلسفیانہ ملحد یا لاادری رہنے کے بعد مجھے آخر کار محسوس ہوا کہ "حقیقت میں خدا ہے""۔

عبد الاحد صاحب نے ہلکی سی خاموشی اختیار کی جبکہ پوری محفل میں مکمل سکوت طاری تھا۔ عبد الاحد صاحب نے کچھ وقفے کے بعد جنید سے مسکرا کر کہا۔

بھائی! آج چائے نہیں پلانی ہے کیا؟

کیوں نہیں جناب۔ بس آپکے اور سامعین کے حکم کا انتظار تھا۔

یہ کہتے ہوئے وہ چائے آرڈر کرنے کے لئے باہر چلا گیا۔

بیٹا عُویم! کل تو آپکی آن لائن کلاس بھی ہے۔

ہاں جی!

میرے خیال میں آپ لوگ آج اپنے شہر نہ جائیں۔ کیونکہ کل کی کلاس مختلف نوعیت کی ہے۔ چند مہمان سکالرز ہمارے ادارے آرہے ہیں جس کے لئے ایک کانفرنس کا بندوبست کیا گیا ہے۔ وہ الحاد پر گفتگو کرینگے۔ لہٰذا اسی گفتگو کو ریکارڈ کر کے آن لائن کلاس میں سنائی جائیگی اور اگر اس پر طلباء کی طرف سے سوالات آئے تو وہ ان سکالروں کو ارسال

کر دیئے جائینگے۔ میری خواہش ہے کہ آپ دونوں براہِ راست کانفرنس میں شریک ہو۔ عُویم ہلکی سی سوچ میں پڑ گیا۔

میں نے تو گھر سے ایک ہی رات کے لئے اجازت لی تھی لیکن میں گھر فون کر کے اماں جی سے بات کر لونگا۔ امید ہے اجازت مل جائیگی۔ اسی طرح کیف کو بھی۔

عُویم نے کیف کی طرف دیکھ کے آمادگی سے کہا۔ وہ کیف کی رضامندی چاہتا تھا جس پر کیف نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اسی دوران جنید بھی اندر داخل ہو گئے۔

جنید! مہمان خانے میں عُویم اور کیف کے لئے کمرے کا بندوبست کرو۔

استاد نے نے جنید سے کہا۔ جس پر جنید نے سر کو جنبش دی۔

باب بیست و دو

تاریخی دلائل وحدِّ علم کا عقدہ

کل عبد الاحد صاحب کے ساتھ نشست بڑی دلچسپ اور معنی خیز رہی۔ بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ کافی الجھنیں دور ہوئیں۔ مزہ آ گیا۔ آپ کو کیسا لگا؟

کیف نے ہال میں داخل ہوتے ہی تبصرہ بھی کیا اور سوال بھی۔

استاد محترم سے ملاقات ہمیشہ ذہنی خلش کم کرنے میں مددگار ثابت ہوئی ہے وہ علم کی دنیا میں عقل و خِرد کی لاٹھی تھامے ہوئے چلنے والا انسان ہے۔ اُن کی محفل دربارِ دُربار ہے۔

عُویم نے جواب دیا۔

دونوں دوست کانفرنس ہال میں موجود تھے اور مہمانوں کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ دونوں دوستوں کے لیے صفِ اول کی نشستوں میں خاص مہمانوں کے ساتھ کرسیاں متعین کر دی گئی تھی۔ ان کے سامنے سٹیج پر صرف تین بڑی کرسیاں رکھی گئی تھی جو کہ ابھی تک خالی پڑی تھی۔ کرسیوں کے سامنے لمبی میز کو خوبصورت پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ ہال ابھی تک سامعین سے پورا بھرا نہیں تھا بلکہ چیدہ چیدہ لوگ موجود تھے اور آنے کا سلسلہ جاری تھا کہ اس دوران عُویم اور کیف بھی آ گئے اور اپنی نشستوں پر براجمان ہو کر معمول کی گفتگو کرنے لگ گئے۔

آپ کیوں مذہب کے سلسلے میں عقل کے پیچھے پڑے ہوئے ہو۔ مذہب تو ایک عقیدہ ہے اور عقیدہ صرف عقیدت مانگتی ہے بس۔۔۔

کیف نے بے توجہی کے ساتھ سوال کیا۔

عُویم نے بالکل اَن سُنی کر دی اور جواب نہ دینا چاہا۔ تجاہل عارفانہ سے کام لینے لگا اور ہال میں مہمانوں کی آمد و تیاریوں میں خود کو محو کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

او۔۔۔۔۔ہیلو۔۔۔۔۔۔کہاں گم ہو۔

کیف نے چُٹکی بجا کر عُویم کو متوجہ کیا۔

جی۔۔جی،،، یہاں ہوں۔

عُویم نے متوجہ ہو کر جواب دیا۔

کیف نے اپنی بات دہرائی۔

عقل ہی میرے لیے واحد کسوٹی ہے۔ اسی ہی کی بنیاد پر میں مذہب سمیت ہر ایک چیز کو پر کھونگا۔ اچھے بُرے، صحیح غلط، حلال حرام وغیرہ کی تمیز عقل ہی کرے گی۔ عقل ہی مجھے خارج سے ہم آہنگ کرے گا۔ رہی بات عقیدے کی تو میرے بھائی! جس عقیدے کے پیچھے صرف عقیدت ہی کار فرما رہتی ہے وہ اتنا مضبوط نہیں ہوتا بمقابلہ اس عقیدے کے جس کے پیچھے عقل کار فرما ہو۔ عقیدت اپنے حقیقی معنوں اس وقت معنی خیز بن جاتی ہے جب انسان ماننے سے پہلے جاننے کے مراحل طے کریں۔ عقیدت اگر جذبات کی بجائے عقل کے راستے سے آئے تو زیادہ مستحکم ہوتی ہے۔ تبھی تو میرا یقین ہے کہ انسانیت کی بنیادیں جوش کی بجائے ہوش پر زیادہ استوار ہیں۔ جب انسانی وجود میں دماغ کو سب سے اوپر رکھا گیا ہے تو کیوں نہ وہ حکمرانی کریں۔ بلکہ آپ کی توجہ ایک اور نکتے کی طرف مبذول کراؤں کہ دوسری انواع کے مقابلے میں انسان کا بچپن سب سے زیادہ طویل ہوتا ہے یہ اس لیے کیونکہ بچپن میں ہم مکمل طور پر بڑوں پر انحصار کرتے ہیں اور یہی عمر سیکھنے کی عمر ہوتی ہے تاکہ ہم بڑوں سے زیادہ سے زیادہ سیکھ سکے۔ عقل کا استعمال اسی سیکھنے سے وابستہ ہے۔ لہٰذا اسی عقل کی بنیاد پر میں عبد الاحد صاحب یا کوئی اور جو بھی ہو سے گفتگو کرتا رہتا ہوں۔ میری نظر میں جس گفتگو میں

"کیوں"، "کیسے" اور "کہاں" شامل نہ ہو وہ گفتگو نہیں بلکہ نصیحت ہے اور نصیحتیں مجھے زیادہ پسند نہیں۔

اک بادہ کش بھی وعظ کی محفل میں تھا شریک
جس کے لیے نصیحتِ واعظ تھی بارگوش

عُویم نے اپنے اظہار خیال کے آخر میں مسکرا کر شعر کہا اور سر ہلا ہلا کر شعر سے خود بھی لطف اُٹھایا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عقل کا مقام افضل ہے۔ دلیل وبُرہان کا مسکن ہے۔ سارے علوم اسی پر کھڑے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ عقل اضطراب اور بے چینی کی آماجگاہ بھی ہے اور یہی مسئلہ آپ کو انتہائی حد تک درپیش ہے۔ تبھی تو برٹرینڈ رسل نے کہا تھا کہ "انسان کو علوم کی نہیں یقین کی ضرورت ہے"۔ آپ کے اتنا قریب رہ کر اور آپ کی عقل پرستی کو جان کر میرا تجزیہ یہی کہتا ہے کہ ایسے عقل کی انتہا کو صرف تصوف ہی اپنے آغوش میں لے سکتی ہے اور ممتا جیسا پیار دے کر سُلا سکتی ہے۔

کیف نے ابھی تک بات پوری نہیں کی تھی کہ عُویم بیچ میں کود پڑا اور مسکرا کر کہا۔

کونسا تصوف، بھائی! تذکیر والا یا اُڑنے والا۔

تذکیر والا۔۔۔ اُڑنے والا آپ سے مطابقت نہیں رکھتا۔

کیف نے قہقہہ کنٹرول کرتے ہوئے جواب دیا۔

ہاں تذکیر والا تصوف تو ٹھیک ہے۔ وہ مجھے پسند بھی ہے۔

عُویم نے سر ہلا کر کہا۔

اس دوران مہمان سکالرز بہت سے دوسرے مہمانوں کے ساتھ عبد الاحد صاحب کی سربراہی میں ہال میں داخل ہوئے۔ تمام شرکاء نے اٹھ کر استقبال کیا۔ عبد الاحد صاحب

دو مخصوص مہمانوں سمیت سٹیج کی طرف روانہ ہوئے جبکہ باقی مہمان ہال میں لگی ہوئی کرسیوں کی طرف بڑھ گئے۔

ہال میں خاموشی چھا جانے کے بعد عبد الاحد صاحب نے سلام و دعا کے ساتھ گفتگو کا آغاز کیا جس میں مختصراً دونوں مہمانوں کا تعارف بھی کیا۔ کانفرنس کے بارے میں تمہیدی کلمات پیش کئے اور کانفرنس کا ایجنڈا او طریقہ کار بھی بتا دیا کہ مہمانوں کے تقاریر کے بعد سوال وجواب کا سیشن ہو گا۔

اس کے بعد مہمانوں کا مائیک کھول دیا گیا۔ پہلے سفید ریش، پُر نور و خوش رُو مہمان نے بڑے تحمل اور دھیمی آواز کے ساتھ گفتگو شروع کی۔

مجھے میرے بھائی عبد الاحد صاحب نے اثبات الٰہی اور الحاد کے بارے میں گفتگو کے لیے بلایا ہے۔ الحاد اپنی ذات میں بے علمی، ناواقفیت اور جہل کا اظہار عجز ہے۔ جس کا گودا بغاوت کی کھوپڑی میں گھوندھا گیا ہے۔ لہٰذا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ الحاد لاعلمی و نادانی اور بغاوت کا ایک ایسا آمیزش ہے جس کی تاریک راہوں میں احساسات و جذبات کچلے جاتے ہیں۔ میں اس وقت اپنی گفتگو کا رخ اثبات وجود باری تعالیٰ کی طرف موڑتا ہوں کیونکہ اثبات وجود باری تعالیٰ ہی رد الحاد کی دلیل ہے۔

مجھ سے جب بھی کوئی سنجیدہ طالب علم کسی بھی مضمون میں تخصیص کے بارے میں دریافت کرتا ہے تو میں اسے سب سے پہلے اسی مضمون کی تاریخ پڑھنے اور سمجھنے کا مشورہ دیتا ہوں۔ کسی بھی مضمون پر صحیح اور مکمل دَسترس حاصل ہونے کے راستے صرف اس وقت کھل سکتے ہیں جب آپ کو اس کی تاریخ سے مکمل واقفیت ہو اور خاص طور پر تب جب مضمون کا تعلق مابعد الطبیعیات یا سماجی علوم سے ہو۔ فرض کیا کہ اگر میں پاکستانی سیاسیات کے مطالعے سے دلچسپی کا اظہار کروں تو سب سے پہلے مجھے ضروری ہے کہ میں معلوم کروں کہ اس ملک کی سیاسی تاریخ کیا ہے۔ 1947ء کے بٹوارے سے پہلے اور بعد کی سیاسی صورت

حال کیا تھی اور سیاسی حضرات و پارٹیوں کی کیا پوزیشن تھی۔ سیاسی پارٹیاں کیسے بنی اور کن کن مراحل سے گزر کر آگے بڑھی۔ حزب اقتدار اور حزب اختلاف کے درمیان اس سیاسی سفر میں کیا کیا اُتار چڑھاؤ پیش آئے۔ یہ سب تاریخی مسلّمات ہیں جو کہ مؤرخین نے قلم بند کیے ہوئے ہیں اور جو رہ گئے ہیں وہ عام آدمی کے ذہن پر نقش ہوئے ہیں۔ لہٰذا ان سب سے واقفیت ہی ایک سنجیدہ طالب علم کو علمِ سیاسیات کے میدان میں کُودنے کے لیے تیار کرتا ہے۔ بالکل یہی حال مذہب کا بھی ہے۔ فرض کیا اس وقت ایک شخص اقرار وانکار مذہب کے بیچ تذبذب کی حالت میں گرا پڑا ہے اور وہ بالکل غیر جانبدار (Neutral) اور بے تعلق حالت میں ہے اور مذہب کے اقرار اور انکار کے بارے میں حقائق تک پہنچنے کی کوشش میں لگا ہے۔ یعنی دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ اس کے ایک طرف خدا ہے اور دوسری طرف الحاد اور اس شخص کو اپنے علم کے بل بوتے ان دونوں میں سے کسی ایک کو چُننا ہے تو ایسے شخص کے لیے صحیح اور معیاری علمی رویہ یہی ہو گا کہ وہ سب سے پہلے اقرار وانکار مذہب کے بارے میں غیر جانبدار اور مسلّمہ تاریخ کا مطالعہ کرے۔ جب یہ شخص ایسا کرنے کے لیے قدم اٹھائے گا تو میں پورے فخر اور جوش و جذبے کے ساتھ اسے چیلنج کروں گا کہ اس کے لیے انکار مذہب کے بارے میں مستند اور تسلی بخش مواد ملنا ناممکن رہے گا اور جو ٹوٹی پھوٹی مواد ملے گی اس میں نہ تسلسل ہو گا، نہ یکسانیت اور نہ عقلی دلائل۔ وہ مواد خود تذبذب کا شکار ہیں۔ جن حضرات نے یہ دعوے کئے ہیں ان میں اکثریت کبھی خود کو ملحد گرادنتے ہیں اور کبھی لا ادری۔ مطلب یہ کہ الحاد کے ماننے والے خود اپنی ذات میں واضح نہیں ہیں تو انسانیت کو کیا راہ دکھائیں گے الحاد نے تاریخی لحاظ سے کوئی تسلسل، ہم آہنگی، یکسانیت اور عقلی بنیاد فراہم نہیں کی اور نہ ان کے ماننے والوں کا کسی ایک نظریے پر اجماع ہوا ہیں۔ جبکہ اس کے برعکس مذہب کا واقعہ یہ ہے کہ اس ضمن میں انسانیت کے پاس پیغمبروں کا ایک پورا محکمہ (Department) موجود ہے جن کے وجود پر پورے انسانی تاریخ کا اجماع ہے

اور تمام انسانیت ان پر متفق ہیں۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ آپ کے پاس مذہب کے بارے میں سب سے بڑی دلیل کیا ہے تو میں اسی محکمے کو پیش کروں گا۔ اس مادی دنیا میں ان پیغمبروں کا تاریخی وجود میرے لیے اثبات الٰہی کا سب سے بڑا ثبوت ہے اور پیغمبر بھی ایسے کہ ان کی راست گوئی، صداقت اور اخلاقی برتری پر ماننے والے اور نہ ماننے والے سب متفق اور متاثر ہیں۔

یہاں پر ایک وضاحت انتہائی ضروری سمجھتا ہوں کہ اس وقت ان پیغمبروں کا ذکر میں عقیدے کے باب میں کر ہی نہیں رہا بلکہ ان کا ذکر تاریخ کے ذیل میں کر رہا ہوں۔ عقیدے پر صرف وہ حضرات متفق ہوتے ہیں جو پیغمبروں کو بطور نمائندہ الہٰ مانتے ہیں جبکہ تاریخ پر پوری انسانیت کا اجماع ہوتا ہے، ماننے والوں کا بھی اور نہ ماننے والوں کا بھی کیونکہ پیغمبروں کی تاریخ مسلّمہ تاریخ ہے۔

اِس وضاحت کو ایک مثال سے سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ عباسیّوں کا منگولوں سے لاکھ اختلاف سہی لیکن واقعہ یہ ہے کہ منگولوں نے تیرھویں صدی عیسوی میں تختِ بغداد کو تہس نہس کر دیا تھا۔ یہ واقعہ تاریخ کا حصہ بن چکا ہے اور پوری مسلّمہ تاریخ اس پر گواہ ہے، چاہے کوئی بھی اس واقعے کے ہونے سے اختلاف کریں یا اتفاق لیکن تاریخ یہی ہے کہ یہ واقعہ ہوا تھا۔ عباسی بھی اس کو مان رہے ہیں اور منگول بھی۔ اسی طرح یہ بھی تاریخ کا حصہ ہے کہ انہی فاتح منگولوں نے مفتوح مسلمانوں کا مذہب اختیار کیا۔ اب ذرا برصغیر پاک وہند میں آئے۔ مغلیہ حکومت تاریخ کا حصہ ہے۔ غالب و اقبال کی شخصیتیں تاریخی مسلّمات ہیں۔ کوئی بھی صاحبِ علم ان حضرات کے اشعار سے اختلاف رکھ سکتا ہے لیکن ان کے وجود سے نہیں۔ یہ واقعات رونما ہوئے۔ فلک نے ان کا مشاہدہ کیا۔ وقت کا پل پل ان کا شاہد بنا۔ ان واقعات سے کسی طرح بھی انکار کسی بھی صاحب عقل کے لیے ممکن نہیں۔

بعینہٖ یہی حال پیغمبروں کے وجود اوران کے تعلیم و تبلیغ کا ہے۔ ان کا کردار بھی تاریخ میں مکمل طور پر واضح اورروزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ان کے راستے میں موجود ایذائیں، صعوبتیں اور غم و قلق کے ساتھ ان کا سامنا کسی سے ڈھکا چُھپا نہیں۔ مصیبتیں جھیلیں، تکلیفیں برداشت کیں، موت کو گلے لگایا، دنیا کے تاج و تخت اپنے قدموں میں رگڑتے دیکھ کر بھی ٹُکرادیا۔ ان سب کے باوجود کسی بھی چیز کی پرواہ کیے بغیر اپنے خاص مقصد کے لیے ہمہ تن و ہر وقت کوشاں رہے اور ایک انچ بھی اپنے راستے سے نہیں ہٹے بلکہ استقامت اور صبر کے ساتھ ڈٹے رہے اور خندہ پیشانی و اعلیٰ اخلاقی کردار کے ساتھ آگے بڑھتے گئے۔ ان سب حقائق پر آج مذہب کا ماننے والا اور نہ ماننے والا دونوں متفق ہیں۔

اتنے ناداں بھی نہ تھے جاں سے گزرنے والے
واعظو! پند گرو! راہ گزر تو دیکھو

مہمان سکالر نے فیض احمد فیض کے شعر کے ساتھ خاموشی اختیار کی۔ انہوں نے بالکل عام فہم انداز میں مدلل گفتگو کی جس میں جذبات کا کوئی عمل دخل نہیں تھا اور بالکل دھیمے اور نرم لہجے میں لفظوں اور فقروں کو سمیٹتا گیا۔۔۔۔ ہاں۔۔۔ اس کے چہرے پر گہرے فکر کے تاثرات لرزاں تھے۔ جبکہ عبد الاحد صاحب کے دوسری طرف بیٹھا دوسرا مہمان سکالر اتنے مدلل اور پُر مغز گفتگو پر احساسِ تفاخر سے پھُولے نہیں سمارہا تھا۔ وہ تالی بجائے بغیر داد دے رہا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ دونوں مہمان دو قالب و یک جان ہیں۔

اس کے بعد دوسرے مہمان کو گفتگو کی دعوت دے دی گئی۔

تیرے عہدِ نو کی دانش نئے بت تراش لائی
میرا لا الہ الا ، وہی یکتا و یگانہ

موجودہ دور علم کا دور ہے۔ علم کے اس دور میں الحاد کو مذہب کے مقابلے میں بہت بڑا چیلنج درپیش ہے اوراس مقابلے میں الحاد بالکل نہتا ہے۔ انسانی علم کے جتنے بھی ذرائع ہیں

الحاد ہمت کریں اور کسی بھی ذریعۂ علم سے یا خدا کے تصور کو چیلنج کریں یا کائنات اور انسان کے بارے میں مذہب کی بیان کردہ توجیہہ سے بہتر کوئی اور توجیہہ پیش کر دیں اور ان دونوں حقائق کو جھٹلا دیں تبھی جا کر الحاد مذہب کی جگہ لے سکتا ہے وگرنہ اس کے سوا یہ صرف خام خیالی تصور کی جائے گی۔ ابھی تک الحاد نے نہ خدا کے تصور کو چیلنج کیا ہے اور نہ کر سکتا ہے اور نہ ہی الحاد نے انسان اور کائنات کی کوئی بہتر توجیہہ پیش کی ہے اور نہ ہی پیش کر سکتا ہے۔

آیئے۔۔۔اب ان دونوں حقائق پر الگ الگ گفتگو کرتے ہیں۔

پہلی حقیقت یہ کہ الحاد نے ابھی تک خدا کے تصور کو چیلنج ہی نہیں کیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ الحاد ہمت کرے اور انسانی شعور، عقل اور تاریخ میں موجود تصور خدا کو چیلنج کریں کہ بھئی یہ تصور جو ازل سے انسانیت کا خاصہ چلا آرہا ہے غلط تھا لیکن یہ چیلنج ضروری ہے کہ وہی ذرائع علم سے کیا جائے گا۔

خدا کا وجود تو بدیہی ہے۔ وہ تو اندھوں کو نظر آرہا ہے۔ وہ تو اِس کائنات سے زیادہ مشہود ہے۔ خدا کا وجود انسان کی تاریخ ہے۔ خدا کا وجود انبیاء کی شہادت ہے۔ خدا کا وجود اپنے پیچھے پورے انسان کے باطنی شعور کے ساتھ کھڑا ہے۔ خدا کا وجود پوری انسانیت کا ورثہ ہے۔ یہ کوئی عام تصور نہیں جو ایک دو دن کے لیے خیال میں جگہ کر گیا اور پھر محو ہو گیا۔ یہ ازل سے لے کر ابھی تک چلا آرہا ہے۔ انسان کی نفسیات خدا کے وجود کی تسکین کر رہی ہے اور عقلی استنباط اس کی تصویب و تصدیق کر رہی ہے۔ انسان پر خدا کی اس گہری اور پرانی چھاپ کے بارے میں پہلی صدی عیسوی کے مشہور یونانی مؤرخ پلوتارک لکھتے ہیں۔

"زمین پر چلتے پھرتے تم ایسے شہر بھی دیکھو گے جن کی دیواریں نہیں ہیں۔ ایسے بھی جن میں سائنس کی کوئی علامت دکھائی نہیں دیتی۔ ایسے بھی جہاں حکمران کوئی نہیں۔ ایسے بھی جہاں محلات ہیں نہ خزانے۔ نہ ورزش گاہیں نہ تھیٹر، لیکن تم کوئی ایسا شہر نہیں پاؤ گے جہاں دیوتاؤں کے مندر نہ ہو۔ جہاں دعائیں نہ مانگی جاتی ہو۔ جہاں منتّیں نہ مانی جاتی ہو،

جہاں پیشن گوئیاں نہ کی جاتی ہو۔ ایسا شہر نہ آج تک کسی انسان نے دیکھا ہے نہ کبھی دیکھنے میں آئے گا"۔

الحاد کو اگر علمی و عقلی دنیا میں جگہ ڈھونڈنی ہے تو ان تمام بیان کردہ امور کو چیلنج کرنا ہو گا۔ میں حیران ہو جاتا ہوں جب الحاد اتنی بڑی حقیقت کو چیلنج کرنے آرہا ہے اور نہ تجربے میں کوئی مخالف چیز، نہ مشاہدے میں کوئی مخالف چیز، نہ عقلی استنباط میں کچھ اور نہ مسلّمہ تاریخ سے کوئی مذہب مخالف ثبوت۔

دوسری حقیقت یہ کہ الحاد اس کائنات کی اور انسانی وجود کی کوئی اور بہتر توجیہہ پیش کر دے اور مذہب کے بیان کردہ توجیہہ کو ٹکرا دے تبھی قابل غور و فکر ہو سکتا ہے۔ مذہب نے اس ضمن میں جو توجیہہ پیش کی ہے وہ یہ ہے کہ اس کائنات کو اور انسان کو ایک خالق نے تخلیق کیا ہے جو کہ ایک قادر مطلق ہستی ہے ۔ اس تخلیق کے دلائل خود کائنات میں اور انسانی ذات میں موجود ہیں اور ہر آن ہر گھڑی اس کے مشاہدے سے یہ با آسانی اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ کائنات اور انسان اپنے وجود سے شہادت دے رہی ہے کہ اس کا ایک خالق ہونا چاہیئے۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک بچہ پیدا ہوتا ہے اور ایک مکمل عمل سے گزر کر تیار ہوتا ہے۔ کیا میں اس پورے اعجاز کا انکار کروں؟ ناممکن۔۔۔۔ بالکل بھی ناممکن۔ انسان کائنات کی ایک برتر ہستی ہے جو کہ ایک شاہکار ہے علم کا، شاہکار ہے ذہانت کا، شاہکار ہے معنویت کا، شاہکار ہے شعور کا۔ کیا یہ شاہکار اس بات کا متقاضی نہیں کہ اس عظیم مخلوق کو کسی برتر ہستی نے تخلیق کیا ہو۔ بالکل ہے۔۔۔۔۔ اس کو اس عظیم قادر مطلق ہستی نے تخلیق کیا ہے جس کو مذہب بطورِ خدا پیش کر رہا ہے۔ اس توجیہہ کے مقابل میں الحاد نے اس تخلیق کی ایک ہی توجیہہ پیش کی ہے جو کہ ابھی تک علم و عقل کی دنیا میں سب سے بڑا اظہار عجز ہے۔ وہ توجیہہ ہے نظریہ ارتقاء و اتفاق۔ یعنی اس سے بڑی عاجزی اور بے بسی اور کیا ہو گی کہ آپ تخلیق کے مقابلے میں توجیہہ پیش کرنے کی بجائے یہ کہیں۔۔۔۔ کہ جی بس یہ تو ہو گیا

اتفاق سے۔۔۔۔۔ کیا اتفاق علم ہے؟ بالکل بھی نہیں۔۔۔ یہ عاجزی اور بے بسی کا آخری درجے میں اعتراف ہے۔ یعنی مذہب کے نظریہ تخلیق کے مقابل میں عاجزی اور بے بسی کے علاوہ کوئی دوسری توجیہہ سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ اگر کوئی اتفاق کو علم کے زمرے میں لاتا ہے تو پھر باقی علوم پر بھی اتفاق کا لیبل چسپاں کر دیں اور لیبارٹریز بند کر کے گھر جائیں۔ پھر وہاں کیوں تردد میں پڑے ہوئے ہیں۔ پھر تو میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ سیب زمین پر اتفاق سے گرتا ہے یہ تو ویسے ہی نیوٹن صاحب کا دماغی توازن خراب ہو گیا تھا۔ ستارے اتفاق سے گردش کر رہے ہیں۔ پھر تو سائنسدانوں کو شفاخانۂ امراضِ دماغی میں بھیجنا چاہیئے۔ اتفاق کے لفظ پہ کبھی سنجیدگی سے غور کیا ہے— بلکہ میں تو یہ گزارش کر رہا ہوں کہ یہ صرف مذہبی آدمی کا مسئلہ نہیں بلکہ یہ مسئلہ ہر باشعور انسان کا مسئلہ ہے۔

یہ کائنات، اس کی نعمتیں، اس کی وسعتیں، اس کا حسن، اس کا جمال، اس کے اندر کارفرما غیر معمولی قوانین، انسان کی اپنی ذات، زندگی اور زندگی کے مظاہر، ایک دو نہیں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں زندگی کے انواع۔۔۔۔۔ یہ کیا کوئی خواب ہے جو ہم دیکھتے ہیں۔ اگر یہ سب ایک حقیقت ہے تو مذہب اپنی تاریخ کے حوالے سے بتا رہا ہے کہ یہ سب کچھ ایک مدبر خالق کی کرشمہ سازی ہے۔ میں حیران ہو جاتا ہوں کہ تخلیق کے اتنے کمالات دیکھنے کے باوجود خالق پر اعتراض کس طرح کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی اس عظیم اور حسین و جمیل تخلیق کے موجود ہونے کے ساتھ خالق کو نہ مانے تو گویا وہ اس پر بضد ہے کہ کائنات تو ہے، انسان بھی ہے، کرشمہ سازی بھی ہے، اس کا معجزانہ ظہور بھی ہے، اس میں معنویت بھی ہے، اس میں ڈیزائن بھی ہے، اس میں نظم بھی ہے، یہ غیر معمولی طور پر ایک سوچنے والے انسان کو سحر میں مبتلا کر دیتی ہے، یہ ساری کرشمہ سازی موجود ہیں لیکن چونکہ اس کا خالق نظر نہیں آتا تو میں نہیں مانوں گا۔ اس مقدمے کے ساتھ علم کی دنیا میں ایک طوفان برپا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس کے مطابق یہ کہنا ناگزیر ہو جائے گا کہ تمام علوم کی بنیاد صرف اور صرف مشاہدہ

ہے اور دنیا صرف علم بالحواس کی قائل ہے اور عقلی استدلال کی کوئی حیثیت نہیں۔ اب کوئی ذی شعور اور ذی عقل صاحب مجھے یہ بتا دیں کہ کیا ایسا ممکن ہے؟ کیا یہ مقدمہ قابل غور ہے؟

ہر گز نہیں، ہر گز نہیں۔۔۔۔ ناممکن۔۔۔۔ ناممکن

مہمان سکالر نے بڑے پر تیقن لہجے اور کسی حد تک جذباتی انداز میں پورے ہال کو ساتھ لئے ہوئے اپنا مقدمہ بیان کر دیا۔ عُویم اور کیف بھی گم سم بیٹھے اَن کہی انداز میں داد دے رہے تھے اور تفہیمی انداز میں سروں کو جنبش دے رہے تھے۔ بیان مکمل ہونے کے بعد ہال میں خاموشی چھا گئی کیونکہ مہمانوں کو پانی پینے کا ہلکا سا وقفہ دینا تھا اور پھر سوال وجواب کا سیشن شروع ہونا تھا۔ اس وقفے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے عُویم نے کیف کی طرف جھک کر سرگوشی کی اور مہمانوں کے بیانات پر تبصرہ کیا۔

یار کیف! مہمانوں کے اندازِ گفتگو اور بیان سے ایسا لگ رہا تھا جیسا کہ پہلا مہمان دماغ میں بھی دل کا قائل ہے اور دوسرا دل میں دماغ ڈھونڈ رہا ہے۔

عُویم کے اس تبصرے پر کیف نے اثباتی طور پر سر ہلا دیا۔

سوال وجواب کا سیشن شروع ہوا تو سب سے پہلا سوال پہلی ہی صف میں بیٹھی ایک خوش لباس اور خوش وضع قطع متوسط العمُر خاتون نے کیا جو کہ انداز سے کافی پڑھی لکھی لگ رہی تھی۔

جناب! آپ حضرات نے تو کائنات کے خلق ہونے پر روشنی ڈالی اور اس کو ایک خالق کی کرشمہ سازی سے تعبیر کیا لیکن کیا یہاں یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ پھر اس خالق کو کس نے تخلیق کیا؟ کائنات کے خالق کا خالق کون ہے؟

مہمانوں نے ایک دوسرے سے آنکھیں ملائیں اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے گفتگو کی اجازت لے بھی گئے اور دے بھی گئے۔

میری بہن! یہ سوال بالعموم کیا جاتا ہے خاص کر فلسفے کے میدان میں۔ لیکن اس بات پر غور کرنے کے لیے یہ لوگ تیار نہیں ہوتے کہ کسی چیز کے بارے میں یہ سوال کب پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس کا خالق ہونا چاہیئے؟ یہ سوال اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب ہم پر کسی چیز کا مطالعہ اور تجزیہ کرنے کے بعد یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ فلاں چیز مخلوق ہے اور بنی ہوئی ہے۔ یعنی پہلے اس شے کے بارے میں فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ کیا یہ مخلوق ہے یا کسی اور طریقے سے وجود میں آئی ہے۔ جب یہ ثابت ہو جائے کہ یہ مخلوق ہے تبھی اس کا خالق ڈھونڈا جائے گا۔ اس کو ایک مثال سے سمجھیئے۔ ہم جب کسی میز کو دیکھتے ہیں تو اس کی ساخت یہ سوال پیدا کرتی ہے کہ اس پر جو نقش و نگار بنایا گیا ہے، اس میں لکڑی کو جو شکل دی گئی ہے۔ اور لکڑی سے اس کی جو صورت بنادی گئی ہے۔ یہ کسی ذہن کے بغیر نہیں ہو سکتی کیونکہ میز کی ہیئت یہ چیخ چیخ کے پکار رہی ہوتی ہے کہ اس کو بنایا گیا ہے۔ یہ اپنے آپ سے نہیں ہے۔ اگر تو میز اپنی ساخت سے اپنی توجیہہ خود کر دے تو کبھی بھی یہ سوال پیدا نہیں ہو گا کہ اس کو کسی نے تخلیق کیا ہے لیکن میز اپنی توجیہہ خود نہیں کر رہا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے میز کو مخلوق ماننے کے علاوہ ہمارے پاس کوئی اور چارہ ہی نہیں۔ تو جیسے ہی میز مخلوق ثابت ہو جاتی ہے اس کے فوراً بعد ہمارے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کو کس نے خلق کیا ہے۔ کون اسے وجود میں لایا ہے۔۔۔ اب ہم اس کے خالق کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں اور بڑھئی تک پہنچ جاتے ہیں۔ بالکل یہی صورت کا سامنا ہمیں اس وقت بھی ہوتا ہے جب ہم ایک لکڑی کو دیکھتے ہیں۔ اس کو دیکھنے کے بعد کسی بڑھئی کے وجود کا سوال پیدا نہیں ہوتا کیونکہ لکڑی کا عام سا ٹکڑا اپنی ساخت سے بتا رہا ہوتا ہے کہ اس کو انسانی ہاتھ نہیں لگا۔ اس پر کوئی نقش و نگار نہیں ہے۔ اس کو کوئی خاص صورت نہیں دی گئی۔ لہٰذا اس لکڑی کے ٹکڑے کا خالق نہیں ڈھونڈا جاتا۔ لہٰذا صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے یہ طے کی جائے کہ فلاں چیز اپنی ساخت کے لحاظ سے مخلوق ہے یا نہیں؟ ہم اہلِ مذہب اگر اس کائنات کے بارے میں مخلوق ہونے کا دعویٰ کر

رہے ہیں وہ اسی لئے کرتے ہیں کہ اس کا خلق ہونا نظر آرہا ہوتا ہے۔ یہ بنی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس میں ذہن کارفرما محسوس ہوتا ہے۔ اس کی معنویت، اس کے اندر موجود اتاہ گہرائی میں اُتری ہوئی ریاضی، اس کا نظم، اس کا ضبط یہ بتارہا ہے کہ یہ سب کچھ بنا ہوا ہے۔ لہٰذا ہم مجبور ہیں علمی اور عقلی لحاظ سے کہ سب سے پہلے اس کائنات کو اور انسان کو مخلوق مانے اور پھر دیکھے کہ اس کا خالق کہاں ہے۔ دنیا کا، میرا، آپ کا، اس کائنات کا خالق اس لیے تلاش کیا جاتا ہے کیونکہ یہ اپنے ساخت اور معنویت کی توجیہہ و وضاحت خود نہیں کر رہا بلکہ خالق کی کرشمہ سازی کا محتاج ہے اور یہ احتیاج اس کی ساخت میں نظر آرہا ہوتا ہے۔

تو میری بہن! یہ سوال ہی غلط ہے کہ ہر چیز کا ایک خالق ہونا چاہیئے۔ بلکہ سوال یوں ہے کہ ہر بنی ہوئی چیز کا ایک خالق ہونا چاہیئے۔ ہر مخلوق کا ایک خالق ہونا چاہیئے۔ جیسا کہ ہر نظم کا ایک ناظم ہوتا ہے۔ ہر معلوم کا ایک عالم ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر مخلوق کا ایک خالق ہوتا ہے۔ ان شاء اللہ جب ہم روزِ قیامت میں خالق سے ملیں گے اور اگر وہاں یہ معلوم ہو گیا کہ وہ بھی بنا ہوا ہے۔ وہ بھی اپنی ذات کی توجیہہ خود نہیں کر پا رہا۔ تو آپ اطمینان رکھیں ہم اور آپ اس کا بھی خالق ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ وہ خالق ہی ہے، مخلوق نہیں۔ اور روز قیامت یہ واضح ہو جائے گا ان شاء اللہ۔

مہمان سکالر نے بڑی دھیمی اور آہستہ آہستہ گفتگو سے سوال کرنے والی خاتون کو حیرت زدہ کر دیا۔ وہ حیرت سے لرزاں نظروں میں مہمان سکالر کو تک رہی تھی جبکہ دوسری طرف پورا ہال خاموش بنا بیٹھا تھا جیسے ہر کسی کو سانپ سُونگھ گیا ہو۔ سامعین مہمانوں کے انداز و بیانِ گفتگو میں اتنے مگن تھے کہ جیسے کوئی ذہین طالب علم امتحان گاہ میں اپنے پرچے میں مگن ہوتا ہے۔ گفتگو کے اختتام پر بھی یہ خاموشی نہیں ٹلی اور کئی پل پورے محفل پر یونہی سکتہ طاری رہا جس کو بالآخر عُویم نے توڑ دیا۔

سر! آپ کے فرمودات سر آنکھوں پر، لیکن آپ صاحبان جس خالق کا بیانیہ مذہب کی شکل میں پیش کر رہے ہیں، کیا مذہب کا بیانیہ صرف یہی ہے کہ ایک قادر مطلق ہستی کو خالق مانے جائے اور بس۔۔۔۔۔ یا مذہب کا بنیادی مقدمہ کچھ اور ہے۔۔۔ اوراس کے ساتھ یہ کہ مذہب کیوں الحاد کے راستے میں حائل ہو رہا ہے۔

عُویم ایسے بول رہا تھا جیسا کہ رو رہا ہو۔ اس کی آواز بیٹھ گئی تھی۔ اس کے الفاظ میں گریہ سرائیت کر گیا تھا۔ اس کی آنکھیں نم تھیں۔ اس کے لہجے میں بے پناہ اداسی گھلی ہوئی تھی۔ اس کو تلاش و اضطراب نے اس قدر جھنجھوڑ کے رکھ دیا تھا کہ ہوا کا لمس بھی اسکے حساس بدن میں آگ لگانے کے لیے کافی تھا۔ عُویم کے اس حالت اضطرار کو عبد الاحد صاحب نے بخوبی محسوس کیا اور وہ عُویم کو غور سے دیکھنے کی خاطر کرسی میں آگے کی طرف کھِسک کر میز پر جھک سے گئے اور چوکنا ہو گئے۔ اس دوران کیف نے عُویم کے کندھے پر ہاتھ ڈال دیا۔

میرے برخُوردار! مذہب کا بنیادی مقدمہ یہ ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق ہے اورایک دن مجھے اس کے سامنے جوابدہ ہونا ہے اور یہ جوابدہی عمل کے بنیاد پر ہو گی۔ یعنی انسان کے علم و عمل کے صحت کی بنیاد پر اسے وہاں پیش کیا جائے گا۔ اس خالق کی سچی معرفت حاصل کرنا ہی مذہب کا بنیادی مقدمہ ہے۔ خالق کی اس سچی معرفت کو حاصل کرنا انسان کا اصل امتحان ہے۔ یہی وہ امتحان ہے جس کو مذہب نے اپنا محور بنایا ہے۔ کیونکہ اسی امتحان کی بنیاد پر خالق قیامت کے دن جزاو سزا برپا کر دے گا۔

یہاں پر میں آپ سب کی توجہ مذہب کی صداقت کے ایک اور اہم نکتے کی طرف مبذول کرانا چاہوں گا جس پر تاریخ شاہد ہے۔ وہ یہ کہ جس قیامت کا ذکر مذہب کر رہا ہے وہ اس کائنات کے اختتام پر ایک بہت بڑے پیمانے پر برپا کیا جائے گا جس میں ازل سے لے کر آخر تک تمام انسانوں کے تمام چھوٹے اور بڑے اعمال کا حساب لیا جائے گا اور اچھوں کو

بروں سے الگ کیا جائے گا۔ خالق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے والوں اور خالق کے سامنے ڈٹ کر تکبر کرنے والوں کو علیحدہ کیا جائے گا اور جنت و دوزخ کا فیصلہ سنایا جائے گا جو کہ مکمل انصاف پر مبنی ہو گا۔ یہ تو مستقبل میں پیش آنے والی ایک قطعی حقیقت ہے جس کے لئے مذہب منادی کر رہا ہے۔ اس کے اقرار کے لئے انسان کا وجدان کافی ہے لیکن اس بڑی حقیقت سے پہلے اس بڑے قیامت کا عملی مظاہرہ اس دنیا میں خدا کے رسولوں نے پیش بھی کیا ہے۔ جزا اور سزا کو عملی طور پر برپا کر کے دکھایا ہے۔ جس کو قیامت صغریٰ کے لفظ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ اس لیے تاکہ انسانیت پر واضح ہو جائے اور اچھے اور برے کا تمیز کیا جائے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ بعض اوقات کوئی شخص کسی قطعی سائنسی حقیقت کو صرف مکابرت اور ضد کی وجہ سے نہیں مان رہا ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ سائنسی مقدمہ علمی و عقلی لحاظ سے معقول ہوتا ہے۔ تو ایسے شخص کو اسی سائنسی مقدمے کی تصدیق کے لیے لیبارٹری میں لے جا کر تجربہ اور مشاہدہ کرایا جاتا ہے اور حقیقت آخری درجے میں حقیقت واضح کی جاتی ہے یعنی سائنسدان لیبارٹری میں دو گیسوں ہائیڈروجن اور آکسیجن کے ملاپ سے پانی بنا کر دکھا دیتا ہے۔ بعینہٖ یہی طریقہ کار قیامت کبریٰ کی تصدیق کے لیے رسولوں کے ذریعے قیامت صغریٰ کی شکل میں پیش کیا گیا اور اس کو تاریخ کا حصہ بھی بنا دیا گیا جس کے آثار آج بھی موجود ہیں۔ رسول اللہؐ کے منکرین پر اس دنیا میں قیامت برپا کر دی گئی اور سزا دلوائی گئی جب کہ مقربین کو جزا کے طور پر عزت بخش دی گئی اور اقتدار سونپا گیا۔ ہو بہو یہی حال طوفانِ نوحؑ کا ہے۔ قومِ عاد، قوم ثمود، قوم لوطؑ کے واقعات کسی سے ڈھکے چُھپے نہیں۔ فرعون کی غرقابی کو نشانِ عبرت بنا دیا گیا۔ مسیحیوں کا غلبہ پوری دنیا نے دیکھا اور منکرین کی بدحالی کا بھی وقت شاہد بنا۔ یہ وہ داستانیں ہیں جس میں خدا کے منکرین پر عذاب کا تازیانہ اسی دنیا میں برسا دیا گیا۔ یہ تازیانہ آخری مرتبہ انسانی تاریخ میں محمد الرسول اللہؐ کے ذریعے برسایا گیا اور انسانوں کو دکھایا گیا کہ جو بات ہمارے رسولؐ آپ کو کہہ رہے تھے وہ اب آپ کی

آنکھوں کے سامنے ہے۔ خدا کی عدالت زمین پر لگ گئی ہے اور امتحان کی گھڑی ختم ہو چکی ہے۔ اب صرف جزا و سزا کا نفاذ ہو کے رہے گا۔ میرے بیٹے! یہ تمام داستانیں تاریخ کے صفحات پر ثبت ہیں۔

اب آتے ہیں آپ کے سوال کے دوسرے حصے کی طرف کہ مذہب کیوں الحاد کی راہ میں حائل میں ہو رہا ہے۔ میرے جگر گوشے! میں تو اس کے برعکس سوچتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ الحاد مذہب کی راہ میں آ گیا ہے اور وہ بھی بغیر کسی علمی و عقلی دلیل کے۔ مذہب انسان کی میراث ہے۔ یہ ہمارے تصور میں رچا بسا ہے۔ یہ انسانیت کے ساتھ اتنا گھل مل گیا ہے کہ محاروں اور زبانوں کا حصہ بن چکا ہے۔ اس کے ذریعے نفسیات کے تسکین کے تجربے اور مشاہدے ہو رہے ہیں اس پر مسلّمہ تاریخ واضح ہے جو کہ ناقابل تردید ہے۔

سَر! مذہب اور سائنس کا آپس میں کیا تصادم ہے؟

پیچھے کے نشستوں سے آواز آ گئی۔ نوجوان طالب علم مختصر سوال کرتے ہی بیٹھ گیا۔

میرے بیٹے! یہ سوال جب بھی مجھ سے کیا جاتا ہے تو میں بڑے تعجب میں مبتلا ہو جاتا ہوں کہ کیوں دو مختلف چیزوں کا موازنہ آج کل کی جدید ذہن کا مشغلہ بن گیا ہے۔ ان دونوں مضامین کے دائرے بالکل الگ ہیں۔ آپ کو علم ہونا چاہیے کہ سائنس فلسفے کے بطن سے پیدا ہوئی اور بنیادی وجہ جس سے سائنس فلسفے سے الگ ہو کر اس عظیم ترقی سے ہمکنار ہوئی وہ اہلِ علم کا طبیعیات اور مابعد الطبیعیات کے متعلق ایک فیصلہ تھا۔ وہ فیصلہ یہ تھا کہ ہمارے لیے مابعد الطبیعیات (Metaphysics) اور اخلاقیات (Ethics) کی گھتیاں سلجھانے کے لیے عقل مستقل معیار نہیں۔ اس لیے ہم ان دو کو الگ کریں گے اور صرف مادے پر تحقیق کریں گے۔ یعنی یہ فیصلہ ایک لحاظ سے اعتراف عجز تھا کہ فلسفہ جو کہ مابعد الطبیعیات، اخلاقیات، جمالیات اور مادے سمیت تمام امور کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھا۔ ان میں سائنس نے خود کو صرف مادے کی تحقیق تک محدود کر لیا اور آپ کی

آنکھوں کے سامنے یہ حیرت انگیز دنیا دریافت کی۔ مادے کے ان قوانین کی دریافت اور مطالعے کا مذہب سے کیا تصادم ہو سکتا ہے؟ مجھے ہمیشہ یہ حسرت رہی ہے کہ کوئی مجھے ان دو کے درمیان تصادم بتا دیں۔ مذہب کا موضوع مادے کی تحقیق نہیں ہے۔ بلکہ اس کا موضوع ہماری آنے والی زندگی کی بھلائی ہے۔ یہ ایسے ہی ہیں کہ ایک ڈاکٹر کا کام یہ ہے کہ وہ آپ کو صحت کے بارے میں مشورہ دیں۔ انجنیئر کا کام یہ ہے کہ اس سے آپ مکان کا نقشہ بنوالیں یا کوئی پل تعمیر کروالیں۔ جبکہ پیغمبر کا کام یہ ہے کہ وہ آپ کو یہ بتادیں اور جگادیں کہ آپ کی اس عارضی زندگی کے بعد کیا ہونے والا ہے۔ کیا موت کے بعد کی زندگی پر سائنس نے کوئی نئی اور جدید تحقیق کر لی ہے؟ کوئی نیا نتیجہ نکالا ہے؟ اگر نہیں تو سوال یہ ہے کہ تصادم پھر کس جگہ ہے؟

سائنس تو مادے کی تحقیق سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر نہیں ہٹا۔ ابھی تو وہ نفس کی تحقیق کا دروازہ بھی کھولنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ آپ کے علم میں ہونا چاہیئے کہ سائنس جب فلسفے سے الگ ہو رہی تھی تو اس دوران علم نفسیات یعنی سائیکالوجی کو الگ کرتے ہی ابتداء میں روح کی سائنس(Science of soul) کہا گیا لیکن تھوڑے ہی عرصے میں سائنسدانوں کو احساس ہوا کہ روح تو تجربے اور مشاہدے میں آنے کی چیز ہی نہیں۔ پھر اس علم میں ترمیم کی گئی کہ ہم روح کی سائنس نہیں بنا سکتے۔ یہ سائنسدانوں کے بس میں نہیں لہٰذا ہم انسانی رویے(Human Behaviour) کو دیکھے گے اور نتائج اخذ کریں گے۔ پس سائیکالوجی رویے کی سائنس(Science of Behaviour) بن گئی۔ یعنی انسان سے کیا رویے صادر ہوتے ہیں۔ انسان کا طرز عمل کیا ہے۔ باقی لوگوں سے میل جول میں کیسا ہے یہ تمام امور سائیکالوجی کا شعبۂ علم بن گیا۔

مہمان سکالر جواب دینے کے بعد خاموش ہو گئے کہ اس دوران ایک پروفیسر نما یا شاید حقیقتاً پروفیسر صاحب نے سوال پوچھ لیا۔

جناب! خدا کے وجود کو ماننے کی بجائے مادے اور مادے میں کارفرما قوانین کو خدا ماننے میں کیا حرج ہے۔ کیونکہ مادہ اور اس میں موجود طبعی قوانین ازل سے ٹھیک ٹھیک اور نپی تُلی حساب سے گامزنِ سفر ہے۔ تو اس کو خدا ماننے میں کون سی عقلی دلیل مانع ہے؟

مہمان سکالر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ مائیک کی طرف کِھسک گئے۔

میرے محترم! میرے علمی سفر میں ابھی تک کوئی ایک بھی ایسی شخصیت مجھے نہیں ملی جو خدا کے وجود سے انکاری ہو۔ پچھلے ڈھائی ہزار سالہ فلسفیانہ تاریخ پر میری نظر ہے۔ میرے علم میں نہیں کہ آج تک کوئی پڑھا لکھا آدمی یا فلسفی یا سائنسدان خدا کا انکار کر سکا ہو۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ ناممکن ہے۔ ہمیں درپیش مسئلہ یہ ہے ہی نہیں کہ کچھ لوگ خدا کا انکار کرتے ہیں اور کچھ اقرار بلکہ حقیقتاً مسئلہ یہ ہے کہ خدا کا تصور الگ الگ ہے۔ کچھ لوگ اس کائنات کو خدا مانتے ہیں جبکہ ہم مذہبی لوگ اس کائنات کا خدا مانتے ہیں بس یہی "کو" اور "کا" کا فرق ہے۔ آپ کسی بھی ایسے فلسفی یا حکیم کو پڑھیئے تو اصل میں جو باتیں ہم مذہبی لوگ خدا کے بارے میں کہہ رہے ہوتے ہیں وہی باتیں وہ کائنات کے بارے میں کہہ رہا ہوتا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ "خدا آپ سے آپ ہے" وہ کہتا ہے کہ کائنات آپ سے آپ ہے، ہم کہتے ہیں کہ "خدا علیم ہے، حکیم ہے، قدیر ہے" وہ کہتا ہے کہ ان سارے قوانین کے ساتھ کائنات کام کر رہی ہے" آپ کے سوال میں بھی خدا کا وجود اور تصور موجود ہے۔ آپ بھی اس سے انکاری نہیں ہے لیکن آپ کے ہاں تصور خدا مادہ اور مادے میں کارِفرما قوانین ہیں۔ اس لئے مجھے اب آپ کے ساتھ اس پر گفتگو کرنی ہے کہ مادہ ہو یا مادے کے قوانین ہو یا کائنات بذات خود ہو، یہ خدا نہیں ہے بلکہ ان سب کا بنانے والا ایک علیم و خالق ہستی خدا ہے۔

مادہ اور اس میں موجود قوانین یا کائنات کیوں خدا نہیں ہے۔ اس سوال پر اب توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ کائنات کا مشاہدہ کرنے کے بعد ہم تین ہی نتائج پر پہنچ سکتے ہیں۔ اول یہ کہ مادہ خود ہی اپنا خالق ہے یعنی مادہ خدا ہے۔ دوئم یہ کہ کائنات ایک اتفاق کا نتیجہ ہے اور سوئم

یہ کہ ان سب کا ایک خالق خدا کی صورت میں موجود ہے۔ ان تینوں پر الگ الگ گفتگو کرتے ہیں۔

پہلا استدلال تو سرے سے غلط ہے کیونکہ مادہ علم و عقل سے عاری ہے۔ مادہ شعور سے عاری ہے۔ اور علم و عقل اور شعور کے بغیر نہ یہ کائنات میں چار سو پھیلی تغیرات پیدا ہو سکتی ہیں نہ یہ تنوع پیدا ہو سکتا ہے نہ کائنات کی یہ معنویت وجود میں آسکتی ہے اور نہ یہ قوانین وجود میں آسکتے ہیں۔ کائنات کو ذرا ایک آرٹسٹ کی نگاہ سے دیکھ لیں۔ ایک پھول کی پتی سے لیکر ایک جیتے جاگتے انسان تک کتنی کرشمہ سازی نظر آئے گی۔ کتنی رنگارنگی نظر آئیگی۔ کیا یہ بے علم و عقل مادے کی کرامات ہو سکتی ہے۔۔۔۔؟ ہرگز نہیں۔

دوسرا استدلال اتفاق کا ہے۔ کائنات کے بارے میں اتفاق پر عقل کو مطمئن کرنے سے بڑا اعتراف عجز ہو ہی نہیں سکتا۔ اس پر ابھی پہلے گفتگو کی جاچکی ہے۔

لہٰذا ہمارے پاس تیسرے استدلال کو ماننے کے سوا کوئی اور چارہ ہی نہیں اور حقیقت بھی یہی ہے جو کہ پیغمبروں جیسی برگزیدہ ہستیوں نے ہمیں بتایا ہے کہ خدا ہی اس عظیم الشان اور حسین و جمیل کائنات کا بنانے والا ہے۔ تبھی تو اللہ تعالیٰ نے قران پاک میں ارشاد فرمایا ہے۔

"وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، غائب و حاضر کا جاننے والا، وہ رحمٰن ورحیم ہے، وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں —— بادشاہ، یکسر پاک، سراپا سُکھ، امن بخش، معتمد، غالب، زورآور، صاحب کبریاء۔ اللہ پاک ہے ان چیزوں سے جن کو لوگ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ وہی اللہ ہے نقشہ بنانے والا، وجود میں لانے والا، صورت گری کرنے والا۔ اسی کے لئے ساری اچھی صفتیں ہیں۔ اس کی تسبیح کرتی ہے جو چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ اور وہ غالب و حکمت والا ہے۔ *

---

* سورۃ حشر آیات 22-24

قرآن کو پڑھتے ہوئے مہمان سکالر کے انداز میں احساس تفاخر اور وفور جوش چھلک رہا تھا۔ وہ مٹھی کو زور سے بند کئے ہوئے جذبے میں اپنے ہاتھ کو غیر محسوس انداز میں جنبش دے رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسا کہ یہ فعل اس کی گرفت میں نہ ہو، بالعمد و بالقصد نہ ہو۔ یہ صورتحال جوش وجذبے سے مغلوبیت کا اشارہ دے رہی تھی۔ جبکہ دوسری طرف سوال کرنے والا گہری سوچ میں ڈوبا تھا۔

محفل میں جب سکوت نے طول پکڑنا شروع کیا تو عبد الاحد صاحب مائیک کی طرف بڑھے کیونکہ انہوں نے محسوس کیا کہ سوال وجواب کا سیشن اپنے اختتام کو پہنچ گیا ہے۔

محفل کا وقت اپنے اختتام کو پہنچتا ہے مجھے بطور میزبان چند گزارشات آپ کے سامنے رکھنے کی تائید کی گئی تھی۔ سب سے پہلے تو میں اپنے مہمان دوستوں کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے آکر ہمارے ادارے کو زینت بخشی جو کہ ہمارے لیے باعث فخر ہے اور ادارے کی ناموس میں ترقی کا سبب ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ سامعین کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے محفل میں شرکت کی اور اس طالب علمانہ کاوش کی حوصلہ افزائی کی۔

اس کے بعد اب میں محفل کے بارے میں اپنے احساسات بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔جو میں نے محسوس کیا وہ حدِ علم کا عقدہ ہے۔یعنی انسانی علوم کے حدود کیا ہیں۔کیا انسان سب کچھ سیکھ اور جان سکتا ہے؟ کیا انسان ہر ایک معمے اور عقدے پر قابو پا سکتا ہے؟ انسانی علم کی تاریخ کم و بیش چار ہزار سال کی ہے۔اس دورانیے میں ایسے کوئی آثار نہیں ملتے کہ انسان نے کبھی یہ دعویٰ کیا ہو کہ وہ ہر ایک چیز جان چکا ہے۔یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ سارے علوم ہمارے ذہنوں میں سما جائیں کیونکہ علوم کی کوئی حد نہیں اورانسانی علوم کی فراخی و وسعت ایک حد تک ختم ہو جاتی ہے۔ایک دانا کے بقول "علم ایک سُمندر ہے اور ہم جو کچھ جانتے ہیں اس کی حیثیت ایک قطرے سے زیادہ نہیں"۔جس طرح انسانی آنکھ کے دیکھنے یاکان کے سننے کے کچھ حدود ہیں کہ اس سے آگے نہ انسان دیکھ سکتا ہے نہ سن سکتا ہے۔ایسے

ہی انسانی علم کے بھی حدود ہیں۔ یا یوں کہیئے کہ انسانی ذہن اپنے حدود سے آگے نہیں بڑھ سکتی اور جانکاری حاصل نہیں کر سکتی۔

لہٰذا انسان کو علم کی دنیا میں قدم رکھتے ہی سب سے پہلے اپنے علم واختیار کے حدود کی جان کاری حاصل کرنی چاہیئے۔ علم صرف یہ نہیں کہ آپ کسی نامعلوم کو جان لیں بلکہ علم یہ بھی ہے کہ آپ یہ جان لیں کہ آپ کیا نہیں جان سکتے۔ اس کی ہزاروں مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ خالق کے بارے میں مجھے ایسے سوالات کا اکثر سامنا کرنا پڑتا ہے جو سرے سے انسانی علوم کے دائرے میں نہیں آتے۔ جیسا کہ خدا کیسا ہے؟ وہ کیا کام کرتا ہے؟ وہ کیسے کام کرتا ہے؟ وہ کیوں کام کرتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ اپنے دائرہ علم سے تجاوز ہے۔ ان سوالات کو جاننے کی صلاحیت انسان کو اس دنیا میں عطا ہی نہیں کی گئی۔ ہم سے خالق کی طرف سے جو تقاضہ کیا گیا ہے وہ بس اتنا ہے کہ ہم جان لیں کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے اور وہی واحد معبود ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے عقل جیسی نعمت دی گئی ہے۔ تبھی تو میری فطرت اس کے ہونے کا شدید احتیاج محسوس کرتی ہے۔ پوری شدت سے اس کی ضرورت محسوس کرتی ہے۔ عقل وفطرت کے اس اثبات کو مزید پختگی بخشنے کے لئے تاریخ میں پیغمبروں کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے بارہا ظہور کے تجربے کئے گئے اور اس کو صفحہ انسانی پر ثبت بھی کیا گیا۔ کوئی بھی عاقل انسان ان شواہد و دلائل کا انکار نہیں کر سکتا۔ رہی بات ان سوالوں کا جو اس دنیا میں ہمارے حدود علم سے باہر ہیں تو وہ جنت میں بارگارہِ الٰہی میں مجھے بھی پوچھنے ہیں آپ بھی پوچھیئے۔ لیکن اس وقت آیئے مل کر جنت میں جانے کے لیے تگ و دَو کرتے ہیں کیونکہ اس کے برعکس جو راستہ ہے وہ نہایت ہی خطرناک اور ہیبت ناک ہے۔ وہ بدبختوں اور بدنصیبوں کا راستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری کتاب قرآن پاک میں قیامت کے دن ہونے والے ان بدنصیبوں کے افسوس اور پچھتاوے کا نقشہ کھینچا ہے۔

"اگر تم اس وقت کو دیکھ پاتے جب یہ دوزخ کے کنارے پر کھڑے کیے جائیں گے پس یہ کہیں گے کہ کاش! ہم پھر واپس کیے جائیں کہ مانیں اور اپنے رب کے آیات کی تکذیب نہ کریں اور ایمان والوں میں سے بنیں"۔*

اس دعا کے ساتھ محفل کا اتمام بالخیر کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں قیامت کے دن ان بد نصیبوں جیسے ذلت ور سوائی سے بچائے رکھے کیونکہ اُس وقت پچھتاوے سے کچھ نہیں ہو گا اور واپسی کا راستہ بند ہو گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے فضل سے خوش نصیبوں میں شامل فرمائے۔

آمین

*سورہ الانعام آیت 27

باب بیست و سہ

پیغمبرِ الٰہی و کلامِ الٰہی کی صداقت و قطعیت

کیوں عُویم بیٹا! یونیورسٹی نہیں جانا کیا۔ یا آج کلاس تاخیر سے شروع ہو گی۔

ماں نے عُویم سے دریافت کیا۔

عُویم صبح سویرے تیار ہو کے سیڑھیوں سے نیچے اُتر رہا تھا۔ وہ یونیورسٹی جانے کیلئے تیار بھی ہو اتھا کہ اس دوران سی آر (Class Representative) کا میسج آیا کہ آج کلاس نہیں ہے اور انہیں اگلے ہفتے ارینج (Arrange) کیا جائے گا۔

نہیں ماں! ابھی ابھی میسج آیا کہ چُھٹی ہے۔

عُویم کی ماں ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ عُویم بھی ساتھ بیٹھ گیا اور بیٹھتے ہی ماں کے نزدیک سے ٹی وی کا ریموٹ کنٹرول لے لیا اور بے توجہی اور بغیر دلچسپی کے ساتھ چینلز تبدیل کرنے لگا۔ ٹی وی کے چینلز ہر دوسرے سیکنڈ تبدیل ہوتے رہے کیونکہ عُویم ٹی وی دیکھ نہیں رہا تھا بلکہ ٹی وی کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ اس دوران سب سے زیادہ سکون کا سانس لینے والا چینل کارٹون نیٹ ورک تھا اور بھاگتے چور کی طرح او جھل ہونے والے چینلز نیوز چینلز تھے۔ ماں عُویم کے ساتھ باتیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ وہ کئی دنوں سے خاموش اور سنجیدہ لگ رہا تھا۔

ایسا کرتے ہیں میں آپ کے ابو سے بات کرلوں گی، دو، تین دن کیلئے گاؤں چلے جاتے ہیں۔ میں بھی ساتھ چلی جاؤنگی۔ آپ کی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی اور ترو تازہ ہو جاؤ گے۔

نہیں، نہیں۔ میں ٹھیک ہوں اور ساتھ میں یونیورسٹی کی مصروفیات بھی زیادہ ہیں۔

عُویم کی نظریں ٹی وی پر اٹکی ہوئی تھی اور دیکھے بغیر ماں کو مختصراً جواب دے دیا۔ ماں اس دوران اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی لیکن عُویم کا جواب انتہائی مختصر ہوتا۔

آپ بیٹھے رہے، میں آپکے لئے قہوہ بناتی ہوں۔

آپ نہ بنائیں کسی اور سے کہہ دیں وہ بنالے گی۔ آپ اِدھر ہی بیٹھی رہیں۔

عُویم نے جواب دیا۔

قہوہ پینے کیلئے عُویم نے ریموٹ کنٹرول اپنے ساتھ صوفے پر ایک سائیڈ میں رکھ دیا۔ اس دوران ٹی وی پر کچھ اشتہارات چل رہے تھے۔ اشتہارات کے بعد ایک پروگرام جو کہ آدھا گُزر چکا تھا دوبارہ شروع ہوگیا۔ اس پروگرام میں ایک طرف تین کرسیوں پر تین پروفیسر نما اشخاص بیٹھے تھے اور دوسری طرف ڈائس پر ایک شخص کھڑا تھا جو کہ ان حضرات سے سوال و جواب میں مشغول تھا۔ عُویم بے توجہی کے ساتھ اپنا قہوہ پی رہا تھا اور اس کی نظریں ٹی وی پر تھی جبکہ دماغ کہیں اور۔ کہ اس دوران ڈائس پر کھڑے شخص کی گفتگو کے پہلے فقرے نے عُویم کو گرفت میں لے لیا۔

اچھا جی ! تو الحاد پر ہماری سلسلہ وار گفتگو جاری ہے لہٰذا دوبارہ اپنے محترم مہمان کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ عُویم یکایک ہمہ تن گوش ہوگیا۔ محترم مہمان نے بقیہ سے تسلسل کے ساتھ اپنی گفتگو کا آغاز کیا۔

جی شکریہ !وقفے سے پہلے یہ بتایا گیا کہ الحاد صرف اسلام کیلئے نہیں بلکہ تمام مذاہب بلکہ زیادہ مناسب یہ ہوگا کہ ہر سلیم الطبع شخص کے لئے چیلنج ہے۔ اس ضمن میں اگر کسی ایک بھی ہستی کو پیغمبر ثابت کیا جائے کہ وہ براہ راست خالق سے ہدایت لیتا رہا ہے تو الحاد آپ سے آپ غلط ثابت ہو جاتا ہے اور اس کی ساری عمارت ملیا میٹ ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے کی آج کی گفتگو دین اسلام کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ اور اُس کی پیش کردہ کتاب پر ہے۔ ویسے تو

سارے نبی آدمؑ سے لیکر حضرت محمد ﷺ تک دین اسلام ہی پیش کرتے رہے لیکن آخری نبی ﷺ کو سب سے پہلے موضوعِ گفتگو بنانے کا اصل مقصد یہ ہے کہ آپؐ کی تاریخ مُسلّم طور پر ہمارے پاس موجود ہے۔ اسی تاریخی مواد کو استعمال کر کے الحاد کو پیوند خاک کیا جا سکتا ہے اور یہی الحاد کیلئے سب سے بڑا درد سر ثابت ہوا ہے۔

میرے محترم دوست نے وقفے سے پہلے رسول اکرم ﷺ کی پیش کردہ آخری آسمانی کتاب قرآن مجید کے اعجاز اور پیشن گوئیوں کا ذکر کیا اور اِس دوران سچ ثابت ہونے والے واقعات میں رُوم کے غلبے اور فتح مکہ کی مثالیں پیش کیں جس پر مورخین انگشت بدنداں ہیں اور یہی قرآن کے سچ ہونے کا ثبوت ہے۔ اِسی ضمن میں اب میں چند اور واقعات کا اضافہ کرنا چاہتا ہوں جس سے قرآن کا اعجاز اور کتاب الٰہی ہونا مزید واضح ہو جائے گا۔

قرآن مجید میں فرعون کے بارے میں سورۃ یونس میں ارشاد ہوا کہ " آج ہم تیرے بدن کو باقی رکھیں گے تا کہ تیرے بعد آنے والوں کیلئے نشانی رہے "۔ قرآن کے نازل ہونے کے سینکڑوں سال بعد بھی ایسی کوئی لاش دنیا کے کسی خطے میں آنکھوں کے سامنے نہیں تھی جس کا ذکر قرآن میں کیا گیا تھا۔ لیکن آج سے تقریباً سوا سو سال قبل قاہرہ کے قریب کھدائی کی گئی اور اہرام مصر کی عمارتیں کھولی گئیں تو وہاں سے بہت قدیم مصری فرمان رواؤں کی میتیں برآمد ہوئیں۔ مصریوں کا یہ عام طریقہ تھا کہ اہم شخص کے مرنے پر اسکی لاش پر مصالحے لگا کر محفوظ کر لی جاتی اور اس کے ساتھ اسکی پوری تفصیل بھی لکھ دی جاتی۔ آثار قدیمہ کی اس تحقیق میں ماہرین کو ایک صندوق ہاتھ لگ گئی جسے کھولنے پر پتہ چلا کہ اسمیں موجود لاش فرعونِ موسیٰؑ رعمیس دوئم کی ہے جسکا نام منفتہ تھا۔ 1907ء میں سر گرافٹن سمتھ نے جب لاش سے پٹیاں کھولی تا کہ اسکے لاش کی تحقیق کی جاسکے تو پتہ چلا کہ اسکا جسم نمک سے بھرا ہوا ہے۔ اس سے ماہرین نے یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ سمندر میں ڈوب کر مرا ہے اور ڈوبنے پر سمندر کے پانی میں موجود نمک جسم کے اندر پانی کے ساتھ گیا ہوا ہے۔ فرعون کی یہ

میت آج بھی قاہرہ کے عجائب گھر میں موجود ہے۔یوں عقل والوں پر قرآن کی ایک اور پیشن گوئی سچ ثابت ہوگئی اور فرعون قرآن کے حکم کے مطابق رہتی دنیا تک نشان عبرت بن کر رہ گیا۔

قرآن کریم کے حق ہونے پر ایک اور محققانہ دلیل مصری آثار قدیمہ کے ہاتھ لگ گئی۔ قرآن مجید میں فرعون کے ایک بااثر وزیر ہامان کا ذکر آیا ہے لیکن تاریخی مسوّدات میں ہامان نامی شخص کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ آثار قدیمہ کی اس جدید تحقیق سے پہلے مسلم مفسرین نے اس اعتراض کا نہایت عقلی جواب دیا ہے کہ کیا کسی کے پاس فرعون کے تمام وزراء کی لسٹ موجود ہے جس میں ہامان کا نام موجود نہیں ہے۔اگر مکمل لسٹ کسی کے پاس نہیں تو کیا یہ ضروری ہے کہ ایسا کوئی وزیر نہیں گزرا ہوگا۔ یہ خیال بعید از عقل ہے کہ اگر تاریخ میں کوئی شخص مفقود ہو تو اسکے عدم ہونے کا دعویٰ کیا جائے۔ خیر یہ تو نہایت جاندار عقلی دلیل تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے کتاب کے بارے میں حجت تمام کرنی تھی اور تمام اعتراضات اکھاڑ پھینکنے تھے۔لہٰذا آج سے کچھ عرصہ قبل مصر کے آثار قدیمہ سے ایک میت دریافت ہوئی جس کی تابوت پر پوری تفصیل کے ساتھ لکھا ہوا تھا کہ یہ شخص ہامان ہے اور یہ فرعون کے زمانے میں ایک بااثر انسان تھا۔اسی طرح وقت نے قرآن کریم کی ایک اور حقیقت سے پردہ اُٹھادیا۔

ایک اور اعتراض قرآن مجید پر مخالفین نے اُٹھایا لیکن جدید تحقیق نے وہ بھی غلط ثابت کیا اور قرآن کی صداقت روزروشن کی طرح عیاں ہوگئی۔ یہ اعتراض تھا حضرت عُزیرؑ کے بارے میں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے کہ یہودی حضرت عزیرؑ کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا مانتے تھے۔(نعوذباللہ)۔ مغربی علماء کی طرف سے اس پر یہ اعتراض اُٹھا کہ یہودیوں میں ایسا کوئی فرقہ سِرے سے موجود ہی نہیں جو عزیرؑ کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا مانتے ہو اور نہ ہی ایسی کسی حقیقت کا ذکر یہودیوں کے کسی کتاب میں موجود ہیں۔ شروع شروع میں مسلمان مفسرین نے اس

اعتراض کا جواب یہ دیا کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ ایسا کوئی یہودی فرقہ موجود نہ ہو کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو نزول قرآن کے وقت یثرب اور خیبر کے یہودی اِس حقیقت پر اعتراض اُٹھاتے۔ اُس وقت کے یہودیوں کی خاموشی اس بات کی دلیل ہے کہ ان میں ایسا فرقہ موجود رہا ہے ۔اس عقلی دلیل سے ہٹ کر خدا نے اپنے قرآن کے حق میں محکم مُہر ثبت کرنی تھی اور معترضین کو آخری درجے میں خاموش کرانا تھا۔

ہوا یوں کہ بیسویں صدی کے نصف سے کچھ عرصہ پہلے بحر مُردار (dead sea) کے مغربی کنارے پر احمد نامی چرواہے کے ساتھ ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ بحر مُردار کا یہ علاقہ اب اسرائیل کے قبضے میں ہے۔ ایک شام احمد کے ریوڑ میں ایک بکری گم ہوگئی جس کے تلاش میں وہ ایک غار کے دہانے پہنچ گیا۔ وہ بکری کی تلاش میں غار کے اندر داخل ہو گیا ۔ وہاں پر اُسے مٹی کے بڑے بڑے گھڑے ملے ۔ خزانے کی غرض سے ایک مٹکے میں ہاتھ ڈالا تو اُس میں پُرانے کاغذ تھے جو کہ طومار (Scroll) کی طرح گول گول لپٹے ہوئے تھے ۔اُس نے اِس خزانے کا ذکر گاؤں والوں سے کیا۔ حکومت کو جب اسکا پتہ چلا تو اُس نے ماہرین آثار قدیمہ سے اِن ڈھیر ساری کتابوں اور طوماروں کا مطالعہ کرنے کا کہا۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ یہ ایک عیسائی عالم کا ایک بہت بڑا کتب خانہ تھا۔ جو کہ قدیم عبرانی اور سریانی زبانوں میں لکھی گئی کاغذات کی شکل میں دفن تھا۔ کاربن ڈیٹنگ (carbon dating) کے ذریعے معلوم ہوا کہ یہ لکھائی عیسیٰؑ کے 100 یا 150 سال بعد کی گئی ہے۔ لکھائی سے پتہ چلا کہ یہ عیسائی عالم صاحبِ ایمان اور صاحبِ توحید تھے اور کتابوں کے ضائع ہونے کے خدشے سے انہوں اُس وقت کے حالات و واقعات اور دیگر مذہبی عقائد پر مبنی یہ خزانہ یہاں دفن کیا تھا۔ کیونکہ اس وقت یہودیوں کی حکومت تھی جو کہ عیسائیوں پر مظالم ڈھا رہے تھے۔ اِن کاغذوں میں یہودیوں کے اس عقیدے پر اِن کو کھَری کھَری سُنادی گئی تھی کہ وہ حضرت عُزیرؑ کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا مانتے ہیں۔ (نعوذ باللہ)۔ اور یہ وضاحت کی گئی تھی کہ یہ مشرکانہ عقیدہ

ہے جبکہ اللہ کی ذات اقدس اس سے پاک ہے۔ اور وہ ایک ہے۔ اسکا کوئی بیٹا نہیں۔ عُزیرؑ تو اللہ تعالیٰ کے نیک بندے اور انسان تھے۔ یوں جدید دُنیا نے اپنی تحقیق کے بَل بوتے قرآن مجید کی ایک اور حقیقت کو پوری طرح روشن کر دیا۔ اِن کاغذوں میں محمد ﷺ کے بارے میں حضرت عیسیٰؑ کی پیشگوئی بھی موجود ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کو عرب کا شہزادہ کہا گیا ہے۔ یہ اتنا واضح بیان ہے کہ کوئی عاقل اس سے منہ نہیں پھیر سکتا۔ ابھی پروگرام کا موضوع اس کی اجازت نہیں دیتا ورنہ پوری کہانی بیان کر دیتا۔ یہ سارا خزانہ بحر مُردار کے طومار (Scrolls of dead sea) کے نام سے مشہور ہے۔

ان واقعات کی روشنی میں کیا کوئی صاحب عقل اِس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ آج سے سینکڑوں سال پہلے محمد ﷺ کو یہ ناقابل تردید حقائق کِس نے بتائے؟ یہ اُس شخص کی بیان کی ہوئی حقائق ہیں جس نے زندگی بھر نہ کسی سے تعلیم حاصل کی اور نہ ہی کسی مدرسے کا حصہ بنے بلکہ عرب کی ایسی بے آب و گیاہ وادی میں آنکھیں کھولیں جس کی علمی حیثیت آس پاس کے علاقوں سے کم تر تھی۔ کیونکہ ایک طرف بازنطینہ کی ریاست تھی اور دُوسری طرف فارس کی۔ ایسے علاقے میں پیدا ہوا ایک صحرا نشین اگر زندگی کی اتنی بڑی حقیقتیں اتنی وثوق کے ساتھ بیان کرے جس کی آج جدید دُنیا بھی اعتراف کر رہی ہے تو کیا پھر بھی صاحبِ علم و عقل کو اس میں آسمانی ہاتھ دکھائی نہیں دے گا۔ اس کے باوجود بھی وہ تردد اور شائبے کا شکار رہے گا۔ اتنی واضح دلائل کے بعد اس طرح کا تردد اور شائبہ میری نظر میں ظلم کے زُمرے میں آتا ہے۔

یہ تو ہوئیں جدید ذہن کیلئے جدید تحقیق پر مبنی مثالیں۔ اب ذرا اُس زمانے کی سیر کرتے ہیں جس میں قرآن نازل ہو رہا تھا۔ رسول اللہؐ کے اولین مخاطبین کفار عرب اور قریش مکہ تھے۔ یہ لوگ علم کی دنیا سے تقریباً ناواقف تھے صرف شاعری اور زبان دانی انکا کمال تھا۔ فصاحت اور بلاغت انکا میدان تھا۔ اپنی اس صفت پر انہیں اتنا ناز تھا کہ وہ باقی دُنیا کو عجم

یعنی گونگا کہہ کر پکارتے تھے۔ گویا زبان دانی کے میدان میں باقی دُنیا اُن کے سامنے گونگی تھی۔ کوئی نوجوان اگر شعر کہنا شروع کر دیتا تو خوشیاں منائی جاتی تھی۔ لوگ شاعروں کی شاعرانہ معراج پر اُنکے سامنے سجدے میں گر جایا کرتے تھے۔ اس فصاحت و بلاغت کے عروج کے دور میں قرآن کریم نے پورے عرب کو چیلنج کر دیا کہ اگر اس قرآن کریم کے آسمانی کتاب ہونے میں آپ کو شک ہے تو اس کتاب جیسی کوئی کتاب بنا کر دکھاؤ۔ کتاب نہیں لاسکتے تو اس جیسی دس سورتیں ہی بنا کر لے آؤ وہ بھی نہیں کرسکتے تو کم از کم ایک سورۃ ہی بنا ڈالو۔ لیکن اس چیلنج کا نہ اُس وقت بھی کوئی جواب دیا گیا نہ آج تک کوئی یہ ہمت کر سکا۔ ابھی تک سینکڑوں سال گزرنے کے باوجود کوئی تین آیتیں بھی قرآن مجید جیسی پیش نہ کر سکا کیونکہ چھوٹی سے چھوٹی سورت تین آیتوں پر مشتمل ہوتی ہے جیسا کہ سورۃ کوثر و سورۃ العصر۔ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ دُنیا کو اس چیلنج کا علم نہیں۔ قرآن کریم کا آج دُنیا کی ہر بڑی زبان میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ دُنیا کے ہر کونے میں قرآن مجید تقریباً 205 زبانوں کے تراجم کے ساتھ موجود ہے۔ اتنا بڑا ناقابل شکست چیلنج کیا قرآن کریم کے آسمانی ہونے کو ثابت نہیں کرتا؟ اسمیں نشانی ہے عقل والوں کیلئے۔

اب قرآن کریم کے ایک اور رُخ کا جائزہ لیتے ہیں۔ قرآن کریم رسول اللہ ﷺ کی سرگزشت انذار ہے جو کہ کم و بیش 23 سال کے دورانیے میں مکمل ہوا۔ حالات و واقعات کے مطابق آسمان سے کبھی تھوڑا کبھی زیادہ نازل ہوتا رہا اور محفوظ ہوتا رہا۔ مکمل ہونے کے بعد جب اسکو ایک کتاب کی شکل میں یکجا کیا گیا تو اسکی داخلی ترتیب اور تنظیم بھی بذات خود ایک معجزہ بن کر اُبھری کیونکہ یہ ترتیب نزول قرآن کے ترتیب سے یکسر مختلف تھی لیکن پھر بھی کسی قسم کی کجی شامل نہیں ہے۔

یہ تو ایک مختصر سی روشنی تھی جو اس کتاب پر ڈالی گئی جسکو کائنات کے خالق کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ جب کائنات کے خالق کی کتاب میں کوئی کجی نہیں ہے تو کائنات کا خالق

بذات خود کیا سے کیا ہو گا۔ الحاد کی رد میں قرآن سے بڑھ کر کوئی اور دلیل نہیں۔ وگرنہ ملحدین آئیں، ہمت کریں اور اس کتاب کو غلط ثابت کر دیں۔ جبکہ اسکے بر عکس اعجاز القرآن کے نئے نئے پہلو سامنے آتے جائینگے اور قرآن رسول اللہؐ کے اس قولِ مبارک کا مصداق بنتا جائیگا کہ "قرآن کے معجزات کبھی ختم نہیں ہونگے"۔ اتنے وثوق کے ساتھ دعویٰ صرف اُس مصنف کی تصنیف کے بارے میں کیا جاتا ہے جو علم کے معراج پر موجود ہو اور ہر قسم کے نَقص سے پاک ہو۔ اسی مصنف کو ہم اہل مذہب خدا کہتے ہیں۔

حضور ﷺ قرآن کریم کو اپنا معجزہ کہتے تھے۔ اس سے بڑا پائیدار اور جاندار معجزہ ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ یہ کتاب سینکڑوں سالوں سے درخشندے تارے کی طرح بغیر کسی نقص کے جلوہ گر ہے۔ اس دُنیا میں اس وقت ایک نہیں، دو نہیں کروڑوں کی تعداد میں کتابیں موجود ہیں اور ایک دو نہیں دُنیا میں بے شمار اہل علم پیدا ہوئے، ہر فن کے ماہرین پیدا ہوئے۔ لیکن کسی بھی کتاب اور کسی شخص کی عمر سو سال سے بھی زیادہ نہیں ہوئی۔ سو سال تو چھوڑیں چالیس، پچاس سال گزرنے کے بعد یہ واضح ہونا شروع ہو جاتا ہے کہ آدمی نے فلاں جگہ غلطی کی تھی۔ اُسکی کتاب میں فلاں معلومات ٹھیک نہیں تھی۔ فلاں دعویٰ ٹھیک نہیں کیا گیا تھا۔ سائنس میں نیوٹن جیسے بڑے سائنسدان کی مثال لیجئے۔ سو سال بھی نہیں گزرے تھے کہ اسکا بنایا ہوا قصر مسمار ہونا شروع ہو گیا۔ اسی طرح علامہ اقبالؒ جیسے عظیم مفکر کی مثال لیجئے۔ اُس کے شہرہ آفاق خطبات 1928ء میں کتاب کی صورت میں چھپیں۔ ذرا آج اسکو پڑھ کے دیکھ لیں کہ کیا کیا غلطیاں سامنے آگئی ہیں۔ بلکہ علامہ اقبالؒ سے خود جب اسکے پی ایچ ڈی مقالے "فلسفہ عجم" کے چھاپنے کے بارے میں پوچھا گیا تو اس کا جواب یہ تھا کہ اسمیں تو ڈھیر سارے نقائص سامنے آگئے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کوئی ایک کتاب بھی دُنیا کے سفر کے سامنے نہ ٹھہر سکی اور یہ کوئی استخفاف کی بات بھی نہیں بلکہ علمی ارتقاء کا لازمی جز ہے۔ اسکے مقابلے میں اب ذرا قرآن مجید کو دیکھ لیں۔ سو سال نہیں، دو سو سال

نہیں بلکہ چودہ سو سال سے یہ کتاب اپنی جگہ پر کھڑی ہے۔ چیلنج ہے کہ کوئی اسکا ایک لفظ بھی مار کر دکھائے۔ اسکا حرف حرف آپکو بتا دیں گا کہ یہ زندۂ جاوید کتاب ہے۔ تھوڑی دیر کیلئے بھول جائیں کہ یہ خدا کی کتاب ہے۔ چودہ سو سال پہلے اُس وقت کے صحرائے عرب کے ایک صحرا نشین کی لکھی ہوئی کتاب مان کے ذرا پڑھ کے تو دیکھ لیں کہ دُنیا میں پچھلے تین سو سالوں کے اندر ایک علمی انقلاب برپا ہو گیا ہے۔ پُرانا علم وفات پا گیا ہے۔ لیکن چودہ سو سال سے اُس صحرا نشینؐ کی کتاب آج بھی اپنی جگہ پر کھڑی ہے اور یہ اس شان کے ساتھ کھڑی ہے کہ اس کا ایک شوشہ بھی اپنی جگہ سے ٹالا نہیں جاسکا۔ کوئی اس کا ایک پتہ بھی ہلا نہ پایا۔ اس بندہ عاجز کا درود و سلام ہو اس صحرا نشینؐ پر۔

یہ تمام تو ہو گئیں علمی، عقلی، تاریخی و محققانہ دلائل۔ اب ذرا خالی الذہن ہو کر اس کتاب کو پڑھنے کا تجربہ کرتے ہیں۔ اسکو براہِ راست عربی میں سمجھ کر یا سیدھا سادہ ترجمے میں پڑھ کر تو دیکھ لیں۔ آپکو کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ یہ خود اپنے آپکو ہر سلیم الطبع شخص پر واضح کر دے گی کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے۔

عُویم بالکل ہمہ تن گوش و متحیر بنا بیٹھا تھا۔ اسکے چہرے پر گہرے تفکر کے اثرات رقصاں تھے۔ وہ پروگرام میں بالکل محو تھا۔ جبکہ ماں کو پروگرام پہ غصہ آرہا تھا۔ کیونکہ آج کئی روز بعد وہ ٹی وی لاونج میں ماں کے قریب آیا تھا اور اس دوران پروگرام درمیان میں خلل ڈال رہا تھا۔ ماں عُویم کی پروگرام میں انتہائی دلچسپی اور توجہ کے باعث باتیں نہیں کر پارہی تھی کیونکہ عُویم پروگرام میں انتہائی محو تھا کہ اس دوران پروگرام میں وقفہ آ گیا۔

ماں! یہ پروگرام کب شروع ہوا تھا اور کیا یہ دوبارہ نشر کیا جائے گا یا نہیں۔

عُویم نے وقفے کے دوران ماں سے سوال پوچھ لیا۔

مجھے کیا پتہ بیٹا! پروگرام کے اختتام پر معلوم ہو جائیگا کہ دوبارہ کب نشر ہونا ہے۔

پروگرام دوبارہ شروع ہوا تو تیسرے سکالر نے گفتگو کا آغاز کیا۔

میرے دوستوں نے قرآن کریم کی حقانیت و مطلقیت ثابت کرنے کیلئے پُر مغز گفتگو کی جو کہ ہر ذی شعور کی کھوپڑی روشن کرنے کیلئے کافی ہے۔ میں اِس آخری مختصر وقفے میں اس عظیم الشان کتاب کو پیش کرنے والے شہزادۂ عرب و عجمؐ پر اپنے دلائل دُونگا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سچے پیغمبر تھے۔

دلیل اول: آپ نے فطری ارتقاء کے اصولوں کو پڑھا ہو گا۔ فطری ارتقاء کا مطلب یہ ہے کہ کوئی بھی شخص یا کاروبار، یا ادارہ، یا تحریک اچانک ترقی نہیں کرتا۔ بلکہ آہستہ آہستہ چل کے عروج تک پہنچتا ہے۔ ہم میں سے اگر کسی نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے تو اسکا مطلب ہے کہ ہم کبھی پرائمری میں بھی تھے۔ پھر درجہ بدرجہ مڈل اور ہائی میں گئے اور بالآخر یہاں تک پہنچ گئے۔ اس پورے سفر میں کوئی ایک کڑی بھی غیر موجود نہیں ہونی چاہیئے۔ اس عمل کو فطری ارتقاء کا عمل کہتے ہیں یا آسان الفاظ میں ترقی کا تسلسل کہہ سکتے ہیں۔ کوئی بھی شخص تیسری جماعت کے بعد انجنیئرنگ یونیورسٹی میں داخلہ نہیں لے سکتا۔ اس طرح کوئی کاروبار راتوں رات بُہتات کی چوٹی پر نہیں پہنچ سکتا۔ اِن سب کو زینہ بہ زینہ تدریجی عمل سے گزرنا ہو گا۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے۔ اگر کسی طالب علم کو تیسری کلاس سے اُٹھا کر پانچویں کلاس میں بٹھایا جائے تو چوتھی کلاس کے اس پھلانگنے میں ہیڈماسٹر صاحب کا عمل دخل ضرور ہے جو کہ فطری ارتقائی اصولوں سے متصادم ہے اِسی طرح اگر کوئی تحریک راتوں رات زبان زدعام ہو جائے اور مرجع خلائق بنے تو اس میں ضرور باہر سے کسی طاقتور کی شعبدہ گری ہو گی کہ اس نے ہاتھ پکڑ کر تحریک کو بلندی کی چوٹیوں پر پہنچایا ہو گا۔

اب اِسی ارتقائی قانون کا اطلاق رسول اللہ ﷺ کی زندگی پر کرتے ہیں۔ حضور نبی کریمؐ کو نبوت چالیس سال کی عمر میں عطا کی گئی۔ یہ چالیس سال آپؐ اِسی مکہ معظمہ میں قریش کے ساتھ گزر بسر کرتے رہے۔ جو کہ آپؐ کے تمام عمر میں آدھے سے زیادے کا دورانیہ

ہے۔اِن چالیس سالوں کے دوران آپؐ نے نہ کسی مکتب میں بیٹھ کر تعلیم پائی، نہ کسی اُستاد کے سامنے زانوئے تلمذ ہوئے اور نہ کہیں سے لکھنا پڑھنا سیکھا۔ اِس پر مستزاد یہ کہ پرورش بھی ایک ایسے معاشرے وماحول میں پائی جہاں کسی کے جُھوٹا دعویٰ کرنے کا یہ امکان بھی نہیں کہ حضورؐ کو سکھانے میں کسی اور انسان کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ اِن سب کے باوجود اچانک چالیس سال کی عمر میں آپؐ کی زبان اقدس سے ایسے لازوال کلام کا جاری ہونا فطری ارتقائی اصولوں کے خلاف ہے جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ آپؐ جو کچھ فرمارہے ہیں وہ آپؐ کی اپنی گھڑی ہوئی باتیں نہیں بلکہ اس میں کسی اور کا ہاتھ ہے۔ اور وہ کون ہے؟ وہ قرآن کا معیار اور رسول اللہؐ کے دعوے سے بخوبی جانا جاسکتا ہے کہ وہ آسمانی ہاتھ ہے۔ کیونکہ ایسا معیاری کلام انسان کا نہیں ہو سکتا۔ آپؐ نے آدھی سے زیادہ زندگی اِن لوگوں کے درمیان گزاری تھی۔ اس کلامِ الٰہی کے جاری ہونے سے پیشتر لوگوں کے درمیان آپؐ کی گفتگو میں ایسے کسی ارتقائی عمل کا ہلکا سا شائبہ بھی نظر نہیں آتا جس کی منزل اس عظیم کلام تک ہو۔ یہ عظیم کلام اچانک منزلت پیغمبری ملنے کے بعد شروع ہوا جو کہ آج تک قائم و دائم ہے۔ کیا اس دلیل سے بڑی کوئی دلیل ہو سکتی ہے اور اس انکار کی کوئی وجہ بیان کی جاسکتی ہے کہ آپؐ پیغمبر خدا نہیں ہے؟ یقیناً آپؐ سچے پیغمبر خدا تھے۔ جس کو خالق کائنات نے اپنے مخلوق کی رہنمائی کیلئے منتخب کیا تھا۔

دلیل دوئم: آپ لوگوں نے غور کیا ہو گا کہ بڑے سے بڑے ادیب کے ہاں بعض بہت بلند اور بعض بہت گرے ہوئے جملے ملتے ہیں۔ کلام میں پختگی اور نکھار وقت کے ساتھ ساتھ آتا رہتا ہے۔ تبھی تو بڑے شعراء و ادباء کلام کو شائع کرنے سے پہلے اس کی چھان پرکھ کر لیتے ہیں اور ضعیف الاثر کلام کو ترک کر دیتے ہیں جو کہ متروکہ کلام کا حصہ بن جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود پھر بھی معیاری اور غیر معیاری کلام پر مشتمل مجموعہ تیار ہو جاتا ہے۔ کلام میں یہ پختگی اور نکھار علم، تجربے اور وقت کے ساتھ ساتھ تدریجی عمل سے بڑھتا جاتا ہے۔

یہ وہی فطری ارتقائی عمل ہے جس پر ابھی ہم نے گفتگو کی۔ یہ ارتقائی عمل انسانی کلام و گفتگو کا خاصہ ہے۔ لیکن اسکے برعکس آپ قرآن مجید کو پڑھ کر دیکھ لیں۔ یہ اپنا معیار شروع سے لیکر آخر تک برقرار رکھے ہوئے ہے۔ رسول اللہؐ کے 23 سالہ دورانیے میں یہ کلام کسی ارتقائی عمل سے نہیں گزرا بلکہ جو اقدار، پیغام و گفتگو ابتداء میں تھی وہی انتہا میں بھی قائم رہی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپؐ جو مُدعا پیش کر رہے ہیں وہ خالق کائنات کی طرف سے ہے۔

دلیل سوئم: آپ ﷺ نے تن تنہا پورے عرب کے مذہب کو چیلنج کیا تھا جو کہ اُن کے تہذیب و تمدن کا حصہ بن چکا تھا۔ اِس تن تنہا یتیم شخص (ﷺ) کے سامنے انتہائی رکاوٹیں و تکالیف آئیں لیکن آپؐ ایک انچ بھی اپنے راستے سے نہیں ہٹے۔ جو خاصیت آپؐ کے حق ہونے پر دلالت کرتی ہے وہ آپؐ کی اپنے مشن میں غیر لچکداری کا مظاہرہ کرنا ہے اور کسی قسم کے سمجھوتے و مفاہمت پر آمادہ نہیں ہونا ہے۔ قریش مکہ نے آپؐ کو طرح طرح کی پیشکشیں کیں لیکن آپؐ نے سب کچھ ٹھکرا دیا اور اپنے مشن پر تاوصال برقرار رہے۔ صبر و استقلال کا ایک چٹان بنے رہے۔

دلیل چہارم: آغازِ نبوت سے پہلے آپؐ کے راست باز اور آمین ہونے پر پورے معاشرے کا اتفاق تھا۔ جھوٹ آپؐ کے منہ سے کبھی مذاق میں بھی نہیں نکلا تھا۔ اِسی طرح لوگ آپؐ کے پاس اپنی امانتیں رکھا کرتے تھے۔ آپؐ انتہائی سنجیدہ شخصیت کے حامل تھے۔ خود رائی اور خود نمائی سے کوسوں دور تھے۔ ایسے سنجیدہ راست باز اور امین شخصیت سے کون صاحب عقل ایسی توقع کر سکتا ہے کہ وہ خالق کے بارے میں تاریخ کا سب سے بڑا جھوٹ منظر عام پر لے آئے (نعوذ باللہ) اور آخری دم تک اُسے سچ ماننے پر نہ صرف اصرار کرتا رہے بلکہ اس کی ترویج و تبلیغ کے لئے اپنی تمام توانائیاں صرف کرتا رہے۔ یقیناً آپ ﷺ جو کچھ پیش کرتے رہے، کفار ضد پر اَڑ گئے تھے ورنہ وہ ہستی جس کے سچائی کی مثالیں خود کفار دے رہے تھے، وہ جھوٹ کیسے بولے گا۔ یقیناً وہ کائنات کا سب سے بڑا سچ

ہے جو آپؐ فرما گئے ہیں۔ حیران کن حقیقت یہ کہ کفار جو آپ ﷺ کی بات ماننے کے لیے تیار تک نہیں، دعویٰ پیغمبری کرنے کے بعد پھر بھی اپنی امانتیں آپؐ کے سپرد کرنے میں اطمینان محسوس کرتے تھے اور آپؐ پر آمین ہونے کا تکیہ لگائے ہوئے تھے۔

آپ حضرات کی گفتگو میں ہم اتنے مگن تھے کہ پتہ ہی نہ چلا اور پروگرام کا وقت اپنے اختتام کو پہنچ گیا۔ امید ہے سامعین نے پروگرام سے قابلِ غور نکات اپنے ساتھ مزید تدبر کے لیے محفوظ کئے ہونگے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی وناصر ہو۔ اگلے پروگرام میں پھر ملتے ہیں۔

میزبان جو ڈائس پر کھڑا تھا، نے پروگرام ختم کرنے کی گھنٹی بجادی جو کہ عُویم کو ناگوار بھی گزری لیکن وقت کے ساتھ کوئی کیسے مقابلہ کرے۔ لہٰذا اسے اب وقت کا انتظار ہی کرنا پڑے گا۔

باب بیست و چہار

اِعتراف

ارے ! یہ تو پی ٹی سی ایل(PTCL) کا نمبر ہے کون ہو سکتا ہے؟

فردان کا موبائل بجا۔

ہیلو جی !

فردان بیٹا! میں عُویم کی ماں بول رہی ہوں۔

السلام علیکم !ماں جی۔

وعلیکم السلام بیٹا! کیسے ہو، گھر بھر میں سب ٹھیک ہے۔

امی ابو، بہن بھائی۔۔۔۔۔سب خیریت سے ہیں۔

جی !اللہ تعالیٰ کا خاص کرم ہے، سب اچھا ہے۔

حکم کریں اماں جی۔۔۔۔کیسے یاد کیا۔

بیٹا! پچھلے دو تین دنوں سے عُویم کی طبیعت بوجھل ہے۔ بس اپنے کمرے تک خود کو محدود کیا ہوا ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ اسکے چہرے سے پریشانی ٹپک رہی ہے۔ میں بار بار اسکے ہاں جاتی ہوں پوچھتی رہتی ہوں لیکن وہ "کچھ نہیں ہے""کچھ نہیں ہے" کہہ کے بات ٹال دیتا ہے۔ میں ایک ماں ہوں اپنے بیٹے کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ صرف سامنے سے گزرے بھی، تب بھی بتا سکتی ہوں کہ اسکی طبیعت کیسی ہے۔ وہ جب نارمل ہوتا ہے تو میرے ساتھ ٹی وی لاونج میں بغیر کسی وجہ اور بغیر کسی گپ شب کے بیٹھا رہتا ہے لیکن جب کبھی وہ

پریشان ہوتا ہے تو خاموشی سے اپنے کمرے میں خود کو گوشہ نشین کر دیتا ہے۔ اس کے ساتھ اکثر یہ ہوتا رہتا ہے لیکن اس دفعہ اس گوشہ نشینی اور پریشانی میں شدت آئی ہے۔ ایک ماں کیسے اپنے بیٹے کی پریشانی برداشت کر سکتی ہے اور پھر عُویم جیسے بیٹے کی۔ اسی لئے آپ کو فون پر زحمت دی کہ اگر فارغ ہو تو کیف اور آکاش کو ساتھ لیکر آجاؤ اور عُویم کو کہیں گھومنے پھرنے لے چلو۔

ٹھیک ہے اماں جی! وہ جمعہ کو کلاس سے غیر حاضر بھی تھا۔

بالکل بیٹا!۔۔۔وہ گھر پر ہی تھا۔ اس دوران کہیں نہیں گیا ہے۔

بس اماں جی! ہم تینوں ابھی کچھ وقت پہلے گھروں سے پہنچے ہیں ہاسٹل میں ہلکا سا ستانے کے بعد نکلتے ہیں۔

جیتے رہو بیٹا! اللہ تعالیٰ آپکو خوش رکھیں۔

احساس و محبت کا رشتہ الفاظ کا محتاج نہیں ہوتا۔ ایک اَن دیکھی طاقت اپنے بیٹے کی طبیعت سے ہمیشہ ماں کو آگاہ کرتی رہتی ہے۔

ایک عجیب قسم کی اپنائیت اور سُکھ ساکھ کا احساس ہوتا ہے جب دوست کے گھر والے آپکو اپنا سمجھ کر برتاؤ کریں۔

فردان نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔

فردان نے آکاش اور کیف کو صورتحال سے آگاہ کیا دونوں نے یک زبان ہو کر کہا چلو جلدی کرو، نکلتے ہیں۔

جب بھی گھر کی گھنٹی بجتی ماں لپک جاتی۔ بیٹا! پتہ کرو کون ہے۔ مجھے جلدی اطلاع دو۔ وہ ٹی وی لاؤنج سے ہل نہیں رہی تھی۔ شدت سے عُویم کے دوستوں کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ ان کے آنے سے پہلے ہی ان کیلئے چائے کا بندوبست کیا ہوا تھا اور عُویم کے کپڑے اور

جوتے بھی تیار کئے ہوئے تھے۔ ساتھ ساتھ عُویم کے لئے پیسے بھی اُسکے دراز میں رکھ لئے تھے۔

جیسے ہی نوکر نے باہر سے اطلاع بھیجی کہ عُویم کے دوست آئے ہیں۔ ماں جی نے فوراً نوکرانی سے چائے بنانے کا کہا اور خود سیڑھیاں چڑھنے لگی تاکہ بذات خود عُویم کو اطلاع دی جائے۔ تینوں دوست سورج ڈھلنے سے پہلے پہلے پہنچ گئے۔

بیٹا! آپ کے دوست آئے ہیں بلا رہے ہیں آپکو۔

ماں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی عُویم کو اطلاع کر دی۔

عُویم جو غیر سنجیدگی سے پڑھائی میں مصروف تھا اور یوں لگ رہا تھا جیسے پڑھائی میں صرف زبان ساتھ دے رہی ہے دل و دماغ نہیں، الفاظ اُن کے سر کے اوپر سے گزر رہے تھے، ماں کی اطلاع پر پُر حذر ہوا۔

اس وقت۔۔۔اِس وقت کیسے آ گئے فون کئے بغیر۔۔

عُویم نے حیرانگی سے ماں سے استفہام کیا۔

چلو اُٹھو۔۔۔مل لو دوستوں سے۔

عُویم کتاب ہاتھ میں لئے ڈرائنگ روم چلا گیا۔

کیوں بھائی خیریت تو ہے یوں اچانک میری یاد نے کیسے تڑپا دیا اور یہاں کھینچ لے آئی۔

عُویم گلے ملتے ہوئے سوال کرنے لگا۔

بس یار کیا کریں۔۔۔ آپ سے محبت جو ہے۔ ابھی ابھی گھروں سے پہنچے ہیں سوچا فوراً آپ ہی کا دیدار کریں اور آپ کے ساتھ کہیں گھومنے چلیں۔

آکاش نے جواب دیا۔

اس وقت۔۔۔ ابھی تو شام ہونے میں آدھا گھنٹہ رہتا ہے، آج پروگرام نہیں بناتے، کل کہیں چلے جائینگے۔

عُویم نے مسکرا کر خیال ظاہر کیا۔

کوئی بات نہیں۔۔۔ جانا ہے اور ابھی جانا ہے۔

کیف نے فیصلہ کن انداز میں آنکھیں اُٹھا کر بحث ختم کر دی۔

عُویم نے بھی دوستوں کے ضد کے سامنے نہ چاہتے ہوئے ہار مان لی۔ اسی دوران چائے آگئی۔

آپ لوگ چائے پی لیں۔ میں تب تک تیار ہو کے نکلتا ہوں۔

عُویم نے اُٹھ کر اجازت مانگ لی۔

یار یہ عُویم کو کیا ہو گیا ہے۔ کیا مسئلہ لاحق ہو گیا ہے۔ کونسی ایسی پریشانی ہے جو اسے کھائے جارہی ہے کچھ بولتا بھی تو نہیں۔

آکاش نے چائے کے دوران مشکوک لہجے میں استفسار کیا جس پر باقی دوست بھی خاموش رہے کیونکہ انکے پاس بھی اسکا کوئی جواب نہیں تھا۔

کچھ وقت بعد چاروں دوست شہر کے ایک ریسٹورنٹ کے چھت پر موجود رُوف ٹاپ باربی کیو(Roof Top Bar B Q)سے محظُوظ ہو رہے تھے۔ جب عُویم کی طبیعت سنبھلنے لگی تو آکاش اسکے اضطراب کی وجہ کُرید نے لگا۔

اچھا تو عُویم! جمعے کو کہاں غائب تھے۔

یار طبیعت ٹھیک نہیں تھی گھر پر ہی تھا لہٰذا پڑھائی میں خود کو مشغول رکھا۔

عُویم سوچتے سوچتے اور رُک رُک کر گفتگو کر رہا تھا۔ ہلکی سی خاموشی کے ساتھ دوبارہ گویا ہوا۔

کبھی کبھار تو جی چاہتا ہے کہ کہیں دنیا سے دور جا کے خوب رولوں اور دل کا بوجھ ہلکا کر سکوں۔ ایسی جگہ جہاں تنہائی میں ہوا کی سرسراہٹ بھی مخل نہ ہو۔ لیکن جب اسکے برعکس سوچتا ہوں تو میں جس تنہائی اور خلوت کا دلدادہ ہوں اسکا وجود بھی مستقل نہیں ہے۔ انسانی

نفسیات نے اُسے زوال بخشا ہے۔ انسان چاہے یا نہ چاہے وہ کسی نہ کسی طرح سے کائنات سے جُڑا ہوا ہے وہ اپنی ذات میں کائنات کا ایک جُز ہے کُل نہیں۔ تبھی تو جب میں ماضی میں جھانکتا ہوں تو یادیں مجھے اپنے گرفت میں لے لیتی ہیں اور یہی انسانیت کا رشتہ آنکھوں کے سامنے ایک دلبرانہ تصویر کشی کرنے لگتا ہے جسکا دل شیدائی ہے۔ ان لمحات واشخاص کو یاد کر کے آنکھیں بھر آتی ہیں۔ اب سمجھ میں نہیں آرہا کہ جلوت پیاری ہے یا خلوت۔ اسی کشمکش میں اپنی سانسیں گن رہا تھا اور آجکل تو مجھے ایک اور معمے نے آگھیرا ہے۔ مجھے "عُویم، عُویم" کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ کہیں دور سے کوئی مجھے پکار رہا ہوتا ہے اور آوازیں دے رہا ہوتا ہے۔ لیکن جب میں لپک کے دیکھتا ہوں تو نگاہ مایوس لوٹ آتی ہے۔

عُویم ہلکی سی مصنوعی مُسکراہٹ کے ساتھ آکاش کی طرف دیکھ کر خاموش ہو گیا۔

کچھ نہیں ہے آپ نے بے جا خود کو اتنے بُجھ بجھولوں میں ڈال رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ سب خیر کرے گا۔ ہم آپ کیلئے دُعا کرینگے بلکہ کسی پاک سیرت وپرہیز گار شخص سے آپ کے لئے دُعا کروائیں گے۔

فردان جو عُویم کے قریب بیٹھا تھا، نے شانے دباتے ہوئے اور حوصلہ وامید دیتے ہوئے کہا۔

آپ دُعا کو مانتے ہیں ایک وقت میں تو آپ دُعا کے منکر تھے۔

آکاش نے شرارتاً سوال پُوچھ لیا۔

یہ وقت اِن بحثوں کا نہیں۔ ابھی انجوائے کرو۔

فردان نے سوال پُورا ہونے سے پہلے پہلے بحث کا خاتمہ کر دیا کیونکہ ایک طرف ایسی بحثوں سے ماحول کے سنجیدہ ہونے کا خدشہ تھا اور دوسری طرف فردان دل ہی دل میں ڈر رہا تھا کہ کہیں عُویم کے منہ سے ویسی باتیں پھر سے سُننی نہ پڑ جائیں جو وہ پہلے اس کے ساتھ مذہب کے بارے میں کر چُکا تھا۔ اسی لئے فردان نے آکاش کو خاموش کرانا چاہا۔

فردان کے جواب کے بعد محفل پر خاموشی نے پر پھیلا دیے جس میں عُویم مخل ہوا اور سر نیچے کئے ہوئے گویا ہوا۔

میرے خیال میں اُس وقت میں غلط تھا اب میں دُعا کو مانتا ہوں۔

عُویم کا یہ فقرہ فردان کیلئے حیران کن بھی تھا اور خوش کن بھی۔ اس کی نظریں پلک جھپکائے بغیر عُویم پر ٹک گئیں پھر اچانک مسکرا کر ایک ہی لفظ میں سوال پوچھ لیا۔

کیسے؟

عُویم چہرے پر سنجیدگی اور گہرے تفکرات کے اثرات لئے ہوئے شروع ہو گیا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ دُعا مدد کے لئے دُہائی ہے جو کہ ایک حقیقت ہے اور مدد ہمیشہ بے بس اور عاجز ہستیوں کی پکار ہوتی ہے۔ انسان ہمیشہ سے بے بس واقع ہوا ہے لہٰذا دُعا کے ذریعے مدد مانگنا انسان کی مجبوری ہے۔ عرصہ پہلے دُعا کے بارے میں میرا جو اعتراض تھا وہ دُعا کے وجود پر نہیں تھا بلکہ دُعا کے قبول نہ ہونے پر تھا مگر اب یہ عُقدہ مجھ پر کھل گیا ہے۔ اس سے پہلے مجھے یہ غلط فہمی لاحق تھی کہ اس دنیا کو عدل و انصاف اور جزا و سزا کے اصول پر بنایا گیا ہے۔ جب عدل و انصاف اور جزا و سزا دنیا کے اصول ہیں تو یہ ناپید کیوں ہیں۔ یہ معمہ لئے میں شکایتیں کیا کرتا تھا۔ اعتراضات اُٹھاتا تھا۔ ہر ظلم و عدوان کا سزاوار خُدا کو ٹھہراتا تھا کہ اگر وہ طاقتور ہے تو کیوں ان مظالم کو بند نہیں کرتا۔ کیوں مظلوموں کی آہ نہیں سُنتا۔ کیوں ظالم پر زمین تنگ نہیں کرتا۔ اس طرح زلزلے، طوفان، سیلاب، قحط، بیماریاں، وبا اور بھوک و افلاس وغیرہ سب میری نظر میں خُدائی طاقت سے ماورا حقیقتیں تھیں۔ لیکن اب مجھ پر اس کی حقیقت کھل گئی ہے۔ میری غلطی بنیادی اکائی میں تھی تبھی تو اس کے سارے اِطلاقات غلط تھے۔ وہ غلطی اس دنیا کی تخلیق کے اصول کی نشاندہی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا کو عدل و انصاف اور جزا و سزا کے اصول پر بنایا ہی نہیں گیا ہے۔ بلکہ اس کو ایک عارضی امتحان کے اصول پر بنایا گیا ہے۔ جب سے میرے عقل و فہم کو اس اصول کی

صحیح پہچان ہو گئی ہے تب سے یہ سارے واقعات اپنی جگہ پر مناسب لگنے لگے ہیں۔ یہ عارضی امتحان ہر انسان کا لیا جا رہا ہے۔ لہٰذا اگر امتحان کی نظر سے دیکھا جائے تو کسی بھی حادثے یا واقعے میں کوئی عیب نظر نہیں آتا۔ دعا قبول ہو یا نہ ہو، انسانی صورتحال امتحان کی کسوٹی پر پوری اترتی ہے۔ انسان کا سامنا اگر مصیبت، پریشانی یا بھوک افلاس سے ہو تو صبر کا امتحان درپیش ہوتا ہے اور اگر سامنا خوشحالی، اَمن اور فرط نعمت سے ہو تو شکر کے امتحان سے گزرنا پڑتا ہے۔ غرضیکہ ہر لمحہ امتحان ہی امتحان۔ اس عارضی دنیا کے گزرنے کے بعد ہی عدل وانصاف اور جزا و سزا کا مکمل انعقاد ممکن ہو سکتا ہے اور یہی ہونے والا ہے۔ عقل بھی یہی کہتی ہے اور قرآن کریم بھی۔

آپ قرآن پڑھتے ہیں کیا؟

امتحان۔۔۔۔۔ کیا مطلب۔۔۔۔۔ امتحان کس لئے؟

فردان اور آکاش نے بیک وقت مبہوت ہو کے سوال پُوچھ لیا۔

جی فردان۔۔۔۔۔ میں نے قرآن پڑھنا شروع کیا ہے اور یہ فہم وہی سے پیش کر رہا ہوں۔

عُویم نے فردان کی طرف منہ کر کے اثبات میں سَر ہلا دیا اور پھر آکاش کی طرف متوجہ ہوا۔

جی آکاش۔۔۔۔ امتحان۔۔۔۔ بالکل امتحان۔ یہ دنیا عارضی ہے۔ روزانہ کی بنیاد پر ہونے والے اموات اس دنیا کے عارضی ہونے کی تصدیق کرتی ہیں اور اس عارضی دنیا میں برپا یہ امتحان خدا کی بنائی ہوئی اگلی دنیا کیلئے ان کے بندوں کے انتخاب کیلئے ہے تا کہ خالق اپنی نئی بنائی ہوئی دنیا کیلئے موزوں ترین لوگوں کا چُناؤ انکے اپنے اعمال کی بنیاد پر کریں اور ان پر اپنی نعمتوں کا اتمام کر دیں۔ اُنکو اپنی ابدیت میں شامل کر دیں۔ وہاں موت کو بھی موت آجائیگی۔ اُس دنیا کا عیش عیشِ دوام ہو گا جہاں نہ کوئی غم ہو گا اور نہ کوئی اندیشہ۔

کیا آپ کو نہیں لگ رہا کہ یہ امتحان بڑا اکڑا اور سخت ہے۔

کیف جو بالکل خاموش بنا بیٹھا تھا اچانک گویا ہوا۔

ہماری یونیورسٹی میں جب بھی کوئی پرچہ مشکل آتا ہے یا آوٹ آف کورس (out of course) ہوتا ہے تو اسکی چیکنگ اُتنی ہی ڈھیلی ہوتی ہے۔

عُویم نے مسکرا کر کیف کے کندھے کو دباتے ہوئے جواب دیا پھر دوبارہ گویا ہوا۔

اسطرح معیاری اساتذہ ہمیشہ اپنے طُلباء کی مختلف معذرتیں قبول کرتے رہتے ہیں اور پرچوں کی جانچ پڑتال کے دوران ان معذرتوں کی بنیاد پر زیادہ نمبر مہیا کرتے ہیں۔ جیسا کہ کسی بھی طالب علم کا یہ عُذر قابل توجہ ہوتا ہے کہ اسے امتحان سے پہلے سخت بیماری نے آگھیرا اور وہ بیماری سے لڑنے کی وجہ سے مکمل تیاری نہ کر سکا۔ کِسی بھی طالب علم کو پرچے میں اضافی وقت دیا جاتا ہے اگر وہ حقیقی معنوں میں کوشش کے باوجود ٹرانسپورٹ یا کسی اور وجہ سے امتحانی ہال میں تاخیر سے پہنچا ہو۔ بلکہ ہم نے اپنے ہی کلاس میں ایسے واقعات کا مشاہدہ بھی کیا ہے کہ بعض طلباء اگر ٹیسٹ سے رہ جاتے ہیں تو ان کیلئے الگ سے ٹیسٹ کا انتظام کیا جاتا ہے اگر ان کے پاس بروقت ٹیسٹ نہ دینے کی معقول وجہ موجود ہو۔ یہ رعایت اور نرمی اس لئے دی جاتی ہے تا کہ تمام طلباء سسٹم کا مکمل اور جاندار حصہ رہیں اور کسی بھی طالب علم سے ناانصافی نہ ہو۔ اب اگر کوئی طالب علم بالکل سسٹم کا حصہ نہ رہنے پر اَڑ گیا ہو اور علیحدہ ہونے پر تُل گیا ہو تو اسکی نوعیت استاد کیلئے مختلف ہو جاتی ہے۔

عُویم نے دھیرے دھیرے بولتے ہوئے خاموشی اختیار کی اور آکاش کو پانی کا گلاس دینے کا اشارہ کیا۔ ایک گھُونٹ پانی پینے کے بعد پھر سے گفتگو جاری رکھی کیونکہ باقی تینوں دوستوں کی طرف سے مکمل سناٹا تھا۔

میرے بھائیو! یہ تو ایک عام استاد کی بات ہو رہی ہے جو کہ ایک انسان ہے اور اس کی رسائی انصاف کے ہر پہلو تک ہے بھی نہیں لیکن پھر بھی اپنی دانست میں کوشش کر رہا ہے

کہ انصاف کے تمام تقاضے پورے کر دیے جائیں جبکہ دوسری طرف خدا ہے۔کیا آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اسکی رسائی کہاں کہاں تک ہے؟ کم از کم انسانی عقل اسکی باریک بینی و ژرف نگاہی اور انصاف کا ادراک نہیں کر سکتی۔ اعمال کیا دل میں پیدا ہونے والے خیال کی ایک چھوٹی سی لہر بھی اسکے ترازو میں تولی جاتی ہے اور حساب لگایا جاتا ہے۔ کسی سیانے نے بالکل ہی سچ کہا ہے۔ کہ "خدا سب سے بڑا ریاضی دان ہے"۔ اُس کے انصاف کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ قیامت کے دن اسکا بدترین دشمن ابلیس بھی یہ بول اُٹھے گا کہ انصاف اسی ہی کا نام ہے اور اسی ہی کو انصاف کہتے ہیں۔

تو کیوں میں اپنے امتحان سے ناامید ہو جاؤں۔ جب آنے والی دُنیا میں عیشِ دوام بھی ہے، ابدیت بھی ہے، وصال بھی ہے، علم بھی ہے اور اعمال کا انصاف بھی اور اس انصاف پر رحم کی ملمع کاری بھی جو اس امید کو روشن ترین کر دیتی ہے۔

آج کل میرے سوچ کا محور انسان کی یہی بزدلی ہے کہ وہ کیوں اس امتحان سے جی چرا رہا ہے۔ میرے خیال میں خود کو اس بزدلی سے نکالنا چاہیئے اور امتحان کو گلے لگانا چاہیئے تا کہ رزلٹ کے دن اچھے نمبر آجائیں اور سرخرو ہو سکیں۔ یہ تو بالکل سیدھی سادی بات ہے کہ اس ساٹھ، ستر سالہ عارضی زندگی میں بھی ہم اپنے مستقبل کے لئے اچھی ساز و سامان کرتے ہیں۔ چیونٹی جیسی حقیر مخلوق جاڑے کے لئے اپنا سامان اکٹھا کرتی ہے۔ تو کیوں نہ ہم انسان اِس کَل کو آخرت تک ایکسٹنڈ (Extend) کر دیں۔

فردان احساس تفاخر و تشکر سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔ اس نے جذبات میں آکر عُویم کے ماتھے کو بوسہ دیا اور گلے لگایا۔ اس دوران دونوں دوستوں کی آنکھیں نم تھیں۔ محفل جاری تھی کہ ویٹر نے سُوپ(Soup) کو بطور اپی ٹائزر(Appetizer) پیش کیا۔

عُویم! آپ کا آخرت پر بڑا پختہ یقین پیدا ہو گیا ہے۔

آکاش نے نسبتاً شرارتی انداز میں سوپ پینے کے دوران مسکرا کر تبصرہ کیا۔

مجھے نہیں پتہ کہ میرے یقین میں پختگی کتنی ہے اور گمان کتنا ہے۔ لیکن میں نے روزانہ کی بنیاد پر ہونے والے ایک امرِ واقعہ پر بڑا غور وخوض کیا ہے اور اس سے مجھے آخرت کی زندگی کا ایک اور جواز مل گیا ہے۔ یہ امرِ واقعہ ہے فنا کی حقیقت کا۔ ہم پر ہماری آنکھوں کے سامنے روزانہ فنا کی حقیقت کھلتی رہتی ہے۔ اگر ذرا سا ادراک ہو تو اس حقیقت کو جانا جاسکتا ہے۔ جب ہم سوتے ہیں تو ہم پر موت طاری ہو جاتی ہے اور فنا کے ایک چھوٹے سے تجربے سے ہمیں گزارا جاتا ہے۔ اس دوران دنیا و مافیھا سے بے خبر و بے اختیار ایک الگ اور انجان دنیا کی سیر کا مشاہدہ کرایا جاتا ہے۔ نیند پوری ہونے کے بعد دوبارہ ایک نئی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ مطلب روزانہ کی بنیاد پر فنا اور بقا کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ اس میں بہت بڑی نشانی ہے۔ بقا کے بعد فنا اور فنا کے بعد بقا۔ اب اس تجربے کا تھوڑا بڑے پیمانے پر مشاہدہ کرتے ہیں۔ ہماری آنکھوں کے سامنے ہمارے اعزاء و اقرباء وفات پاتے ہیں۔ ہمارے ایسے رشتے ہم سے بچھڑ جاتے ہیں جو ہم کو اپنی جانوں سے زیادہ عزیز ہوتے ہیں۔ یعنی بقا پر فنا ہماری آنکھوں کے سامنے ایک کاری ضرب لگا دیتا ہے اور ہم بے دست و پا دیکھتے ہوئے پتی تک نہیں ہلا سکتے۔ اسکے بعد ایک وقت آجاتا ہے جب ہم خود اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کر دیتے ہیں۔ یعنی فنا ہماری گردن تک آ پہنچتی ہے اور بقا کو فنا کی طرف سے ایک اور دھچکا لگتا ہے۔ اب تھوڑا اور آگے بڑھ کر دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بڑی بڑی سلطنتوں کو فنا اپنی لپیٹ میں لیتا رہتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ بہت بڑی بڑی ریاستوں اور اقوامِ عالم کو حقیقت سے قرطاس تک منتقلی میں دیر نہیں لگی۔ تختِ سلیمانؑ کی شان و شوکت صفحات کا حصہ ہے۔ فرعون و نمرُود کی سرکشی تاریخ میں درج ہے۔ سائرس اور بخت نصر کی سرگزشت سب کے سامنے ہے۔ آشوکا اور مسلمانوں کے عروج کی داستانیں ہمارے زیرِ مطالعہ ہیں۔ یہ تمام فنا کی داستانیں اور انسانیت پر اسکی کاری ضربیں بہت پُرانی اور پائیدار ہیں۔ اب ذرا اس سے بھی آگے بڑھتے ہیں۔ اور وہ ہے اس پورے کائنات کی فنا اور ایک نئی دُنیا کی بقا۔ ازل سے لیکر آج تک فنا کی یہ سرگزشت اگر ایک تسلسل کے ساتھ رواں دواں ہے تو پوری دنیا کے فنا ہونے میں کیا شائبہ اور نئی دنیا کی بقا میں کیا تردّد۔

عُویم کی ہلکی سی خاموشی سے فردان نے فائدہ اُٹھاتے ہوئے بآواز بلند پورے جوش کے ساتھ رُک رُک کر کہا۔

بالکل بھی نہیں ہے، کوئی تردد اور شائبہ نہیں ہے۔ وہ ہونی ہے، وہ ہو کر رہے گی۔۔ وہ ہونی شُدنی ہے۔

فردان کے اس تبصرے پر عُویم نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا اور دل ہی دل میں تھپکی دے دی۔

اس مضمون کو بیدل دہلویؒ نے بڑے خوبصورت انداز میں باندھا ہے جو کہ قابل داد ہے۔

آتشی نیست کہ آخر نشود خاکستر
پی انجام نمی گیری از آغاز چرا*

لہٰذا جب آغاز ہے تو انجام کیوں نہیں ہو گا۔ میں، آپ، ہمارے رشتہ دار، یہ سلطنتیں، یہ دنیا، یہ کائنات، ان سب کا آغاز ہی ان کے انجام کا پتہ دیتی ہے جو کہ آخرت کے لیے ایک بہت بڑی دلیل ہے۔

عُویم نے حالتِ وجد میں شعر کہا اور سَر جھکا لیا۔

آپ کے بقول وہ اتنا بڑا خدا ہے تو اسکو میری چھوٹی سی سرکشی اور غلطی اتنی ناگوار کیوں گزرتی ہے کہ قیامت کی ہولناکیاں بیان کرنا شروع کر دیتا ہے اور کَھری کَھری سناتا ہے۔ وہ اتنا بڑا خدا ہے اور اسکے سامنے انسان کی کوئی حیثیت نہیں اور انسان اسکا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تو یہ ڈانٹ ڈپٹ کیوں؟

کیف میدان میں کوُد پڑا۔

---

*ترجمہ: کوئی آگ ایسی نہیں ہے جو آخر راکھ نہ ہو جائے —— آغاز سے انجام کا پتہ کیوں نہیں لگا لیتے۔

عُویم نے مسکرا کر سوپ کی پیالی سے سر اوپر کر دیا اور بولنا شروع کر دیا۔

اس معاملے کو ذرا اُلٹا کر کے دیکھ لیں۔ جب وہ اتنا بڑا اور عظیم ہے اور اسکے سامنے انسان کی کوئی حیثیت نہیں تو انسان اسکے مقابل میں سرکشی کرتا کیوں ہے؟ اور ہاں یہ غلط فہمی دل سے نکال دو۔ وہ چھوٹی غلطی پر ہولناکیاں بیان نہیں کرتا بلکہ سرکشی پر بیان کرتا ہے۔ چھوٹی غلطی پر وہ درگزر فرما دیتا ہے اگر انسان پلٹ جائے تو۔ اور یہی اُسکے عظیم ہونے کی نشانی ہے۔ رحم، کرم اور درگزر ہمیشہ چھوٹوں پر کیا جاتا ہے اگر وہ سرکش نہ ہو اور مقابلے پر نہ اُتر آیا ہو، تب۔ تو کیونکر ایک کمزور اور بے بس انسان اسکے مقابلے میں سرکشی اختیار کرتا ہے۔ کیا یہ اسکے تعظیم کے خلاف نہیں کہ کوئی اس سے مقابلہ کرے۔ تعظیم کے بارے میں یہ حقیقت محورِ توجہ ہونی چاہیئے کہ تعظیم ہمیشہ مرتبے کے مطابق ہوتی ہے اور ہونی بھی چاہیئے۔ ہم وائس چانسلر (VC) کے ہدایات کو زیادہ اہمیت و توجہ دیتے ہیں بمقابلہ گیٹ کیپر کی ہدایات کے۔ ہم ایک قابل اور عالم استاد کو زیادہ غور سے سنتے ہیں بمقابلہ ایک عام استاد کے۔ یہ درجہ بندی ایک فطری اَمر ہے۔ کائنات میں اس درجہ بندی کی چوٹی پر جو سب سے اعلیٰ وارفع ذات براجمان ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات اقدس ہے۔ یہ عروج اسی ہی کو حاصل ہے۔ اسی لئے ہونا بھی یہ چاہیئے کہ مرتبے میں سب سے اعلیٰ ذات ہی کو یہ حق حاصل ہو کہ اس کی تعظیم سب سے بڑھ کر ہو۔ اس کی ہدایات کو درجہ اول میں رکھا جائے، سمجھا جائے اور سر تسلیم خم کیا جائے۔ اس کے بعد سرکشی کا تو میرے خیال میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

رہی بات ڈانٹ ڈپٹ کی۔ تو جہاں سے آجکل میں دیکھ رہا ہوں یہ ڈانٹ ڈپٹ نہیں اپنائیت ہے، پیار ہے، میرے لئے درد ہے، ترس ہے، میرے مستقبل کی فکر ہے، انعام واکرام ہے۔ آپ لوگوں نے غور کیا ہو گا کہ جب محلے میں بچے لڑ جاتے ہیں اور ان میں سے اچانک اگر ایک بچے کے والد صاحب تشریف لاتے ہیں تو وہ اپنے ہی بچے کو بُرا بھلا کہتا ہے تاکہ اس کا بیٹا مہذب بنے اور نزاع و نفاق اور نفرتوں سے نفرت کرنے والا بنے۔ یہی وہ ڈانٹ ڈپٹ

ہے جو محبت کے لبادے میں آتی ہے اور آدمی کو انسان بنا دیتی ہے۔ اس ڈانٹ ڈپٹ کے پیچھے نفرت کا ہلکا سا شائبہ بھی نہیں ہوتا بلکہ صرف محبت ہی محبت ہے۔ جو ستر ماؤں سے زیادہ محبت کریں اس کے ہاں نفرتیں گھر نہیں کرتیں بلکہ وہ سراپا رحم ہوتا ہے۔

عُویم خاموش ہو گیا۔

اب آپ نے گفتگو چھیڑی ہی ہے تو میں آپ سے آپ ہی کا سوال پوچھ لیتا ہوں جس میں آپ اٹکے ہوئے تھے اور آپ کی پریشانی کا سبب بنا تھا۔ آپ نے مجھ سے پوچھا تھا کہ بُرائی زیادہ طاقتور ہے اچھائی کے مقابلے میں اور اہرمنی طاقت زیادہ کھل کر پرفارم کر رہا ہے بمقابلہ یزدانی طاقت کے۔ تبھی تو ہر طرف پریشانی ہی پریشانی ہے۔ کیا اس سوال کا جواب مل گیا؟

فردان نے عُویم کو پُرانی باتیں یاد دلا دیں جب اسے پہلی بار عُویم کی مذہب بیزاری کا علم ہوا تھا۔ آج فردان مکمل مطمئن تھا کہ عُویم نے تلاش حق میں گلی گلی کی خاک چھان کر مذہب اور خدا کی حقیقت کو پالیا ہے۔ اسکا لہجہ محبتوں اور شفقتوں سے لبریز تھا۔

جب فردان خاموش ہو گیا تو عُویم نے مسکرا کر کہا۔

آپ کو ابھی تک وہ باتیں یاد ہیں۔۔ بہت خوب۔ کمال کرتے ہو یار!

تو سنئیے میرے بھائی! مجھے میرے اشکالات کا تسلی بخش جواب مل گیا ہے۔ بُرائی بالکل بھی طاقتور نہیں ہے اچھائی کے مقابلے میں کیونکہ اچھائی کو انسان کے ضمیر کی تائید حاصل ہوتی ہے۔ یہ تائید کل بھی حاصل تھی، آج بھی ہے اور آنے والے کل بھی ہو گی۔ جبکہ اسکے برعکس بُرائی سے نفرت و کراہت آج بھی انسانیت کا خاصہ ہے، کل بھی تھا اور آنے والے کل بھی ہو گا۔ لہٰذا کسی مظہر کے طاقت وَر ہونے کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ انسانیت کا اجتماعی ضمیر اس کی حمایت کر رہا ہوتا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ اچھائی کرنے کے بعد ہم سب ایک غیبی تھپکی محسوس کرتے ہیں اور اندر سے کوئی شاباش دے رہا ہوتا ہے۔

جبکہ بُرائی پر اندر سے کوئی ہماری سرزنش کر رہا ہوتا ہے اور بُرا بھلا کہہ رہا ہوتا ہے۔ قابیل نے ہابیل کو قتل کرنے کے بعد لاش چُھپانے کی جو کوشش کی تھی وہ اسی احساسِ شرمندگی کی وجہ سے تھا جو اُسے اس کے ضمیر نے ملامت کرنے کے بعد چھُپانے پر مجبور کیا تھا۔ کسی انسان کو یہ بتانے کی کوئی ضرورت نہیں کہ قتل بُری فعل ہے، ہر کوئی یہ جانتا ہے۔ اس طرح ہر کوئی جانتا ہے کہ جھوٹ، خیانت، وعدہ خلافی بُرائیاں ہیں جبکہ اسکے برعکس ہمدری، سچ، امانت، انسان دوستی، پاسداریٔ عہد سب اچھائیاں ہیں۔ اول الذکر اعمال سے نفرت اور آخر الذکر اعمال سے محبت پر پوری انسانیت کا اجماع ہے۔ یہی اچھائی کی طاقت ہے اور بُرائی کی کمزوری۔ کوئی مجھ سے محبت کرے اس سے بڑی اور کیا طاقت چاہیئے مجھے۔ اور خدانہ کرے کوئی مجھ سے نفرت کرے اس سے بڑی میری کمزوری اور کیا ہوگی۔

عُویم نے سر ہلا ہلا کر مسکرا کر آخری فقرہ آہستہ آہستہ کہہ دیا۔

اب آتے ہیں اسی سوال سے متصل ایک اور کڑی یعنی تخمینے اور مقدار کی طرف کہ معاشرے میں اچھائی بڑھ رہی ہے یا بُرائی۔ میرے خیال میں ایسے تخمینے لگانا وقتی فعل ہے کیونکہ کہیں پر وقتی طور پر بُرائی جڑ پکڑ رہی ہوتی ہے تو کہیں اچھائی۔ تاریخ میں کہیں اچھائی زِیادہ ہو جاتی ہے تو کہیں بُرائی۔ پہلے میرا خیال تھا کہ صرف بُرائی بڑھ رہی ہے اور اچھائی گھٹ رہی ہے لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ اگر ہم تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہمیں نظر آجاتا ہے کہ پچھلے زمانوں میں جن دہشت ناک طریقوں سے انسانی نسل کشی کی گئی اس کا آج ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ جن مظالم اور بربریت کا مظاہرہ کیا گیا وہ آج کے انسان کے بس کی بات نہیں۔ لاشوں کے ڈھیر لگائے جاتے تھے۔ بلکہ یہاں تک واقعات تاریخ میں درج ہیں کہ سسکتی، زخم خوردہ، آدھ مرے انسانوں پر دستر خوانیں بچھا کر بادشاہوں کی ضیافتیں کیں گئیں ہیں اور کھانے کے لطف اُٹھا کر جشن منائے گئے ہیں۔ خون کی ندیاں بہائی گئ ہیں۔ جنگوں پر جنگیں انسانوں اور معاشروں کو تہہ تیغ کرتے رہے ہیں۔ زندہ انسان تو درکنار،

مُردوں کو بھی نہیں بخشا گیا اور قبریں اُکھاڑیں گئیں، ہڈیاں جلائیں گئیں۔ بخت نصر، چنگیز خان اور سفاح کی بربریت سب کے سامنے ہے۔ کیا آج کا انسان اسکا تصور کر سکتا ہے ہر گز نہیں۔ تو کس بنیاد پر ہم کہتے ہیں کہ بُرائی غالب آ رہی ہے۔ اسی طرح تاریخ میں جھوٹ و فریب کی ایسی لازوال داستانیں موجود ہیں کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آج کا انسان ایسا سوچ بھی نہیں سکتا کر گزرنا تو در کنار۔

آج اگر ایک طرف امریکہ جاپان پر ایٹم بم گرا کر بُرائی کو غلبہ دے رہا ہے تو دوسری طرف اسی ایٹم بم پر تمام اقوام عالم کی طرف سے پابندی اچھائی کے غلبے کا ثبوت بھی ہے۔ اسی طرح اگر معاشرے میں ایسی ایٹم بم والی ذہنیت یا ہٹلر جیسے لوگ پیدا ہو رہے ہیں تو عبد الستار ایدھی، ڈاکٹر رُتھ فاؤ، مادر ٹریسا، ڈاکٹر محمد فاروق خان اور طاہرہ قاضی بھی اپنے جلوے دکھا رہے ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہم یہ تجزیہ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ اچھائی اور بُرائی ایک مخصوص تناسب کے ساتھ معاشرے میں موجود رہتی ہے۔

اچھائی اور بُرائی کا ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے وہ یہ کہ بُرائی بہت جلد منظر عام پر آ جاتی ہے اور ہر ایک کو دکھائی دینے لگتی ہے۔ اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ بُرائی پنپ رہی ہے جبکہ حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ اچھائی اس سے کہیں زیادہ پنپ رہی ہوتی ہے۔ ہم میں سے بہت لوگ ایسے ہیں جو غرباء و فقراء کی ہر ممکن مدد کرتے رہتے ہیں لیکن اتنی خاموشی کے ساتھ کہ دوسرے ہاتھ تک کو بھی علم نہیں ہو پاتا۔ لہٰذا یہ نظریہ سرے سے غلط ہے کہ اہرمنی طاقت زیادہ طاقتور ہے یزدانی طاقت کے مقابلے میں۔

ان دونوں کا ہونا اور پنپنا کوئی بعید از عقل نہیں کیونکہ یہ انسان کے اختیار کی مرہون منت ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اختیار دے کر اس دُنیا میں بھیجا ہے کہ وہ جونسا راستہ اختیار کرنا چاہے وہ اپنے اس فیصلے میں آزاد ہے اور دونوں راستے بالکل کھل کر بتا بھی دیئے ہیں، ڈھکے چُھپے نہیں ہیں۔ آزادانہ فیصلے اور اختیار کے ساتھ اچھائی اور بُرائی دونوں کا وجود انتہائی

ممکن ہو جاتا ہے۔ یزدان اگر چاہے تو صرف "کُن" کہہ کر بُرائی کا قلع قمع کر سکتا ہے لیکن اس سے امتحان کی وقعت ختم ہو جاتی ہے جبکہ اس جہاں کا مقصد امتحان ہے۔ اس امتحان ہی میں ہم جی رہے ہیں جس پر ابھی کچھ دیر پہلے ہم نے بات کی۔ اس امتحان کیلئے انسان کا یہ اختیار از حد ضروری ہے۔

عُویم نے اپنے پرانے سوال کا خود ہی جواب دے دیا۔

ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسا کہ وہ یہ جواب کئی دفعہ اپنے آپکو دے چکا ہے اور آج اس کی ریہرسل کر رہا ہے۔ دوسری طرف تینوں دوست متجسسانہ نظروں سے اسکی طرف دیکھ رہے تھے کیونکہ آج عُویم انتہائی الگ اور منفرد لگ رہا تھا۔

آپ نے اختیار کی بات کی کہ انسان کو آزاد پیدا کیا گیا ہے اور وہ جو راستہ چاہے اختیار کر سکتا ہے۔ تو اس کہانی کی کیا بنیاد ہے کہ سب کچھ اوپر ایک رجسٹر میں درج ہے اور انسان جو کچھ کرتا ہے اس کو پہلے ہی سے متعین کیا گیا ہے۔

آکاش نے قدرے بے توجہی کے ساتھ سوال پوچھ لیا۔ وہ ویسے بھی اس گفتگو میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ بس کبھی کبھار بیچ میں آ ٹپکتا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اوپر ایک رجسٹر میں سب کچھ لکھا جا چکا ہے اور خدا کو مستقبل کے پل پل کی خبر ہے اور وہ ہمارے تمام اعمال وافعال سے خوب واقف ہے لیکن یہ پیشگوئی انسانی اختیارات میں حائل ہو، یہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ اصل میں یہ انسانی اختیارات و معاملات میں دخل اندازی نہیں ہے بلکہ کائنات اور انسان کے بارے میں علم و تجربے کی بنیاد پر کی گئی ایک پیشن گوئی ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ ہم روزمرہ زندگی میں ایک اچھا اور بہتر تجزیہ نگار اسے کہتے ہیں جو مستقبل کی صحیح تر پیشن گوئی کر سکتا ہو۔ پیشن گوئی کے اس دوڑ میں وہی تجزیہ نگار حقیقت کے قریب تر پہنچتا ہے جس کے پاس حالات حاضرہ و ماضی کا مستند علم ہو، تجربہ ہو اور اپنے تجزیے میں کڑیوں کو ملانے کا فن

ہو۔ تب جا کے اس کی پیشن گوئی ٹھیک ثابت ہو سکتی ہے۔ کیا اس تجزیہ نگار کی یہ پیشن گوئی مستقبل میں ہونے والے واقعات یا ملکی حالات یا اختیارات میں مخل ہو سکتی ہے اور کسی واقعے کے ہونے یا روکنے کا سدّ ذریعہ ہو سکتی ہے؟ ہر گز نہیں۔ پیشن گوئی جیسے بھی ہو حالات اپنے ہی نہج پر گامزن ہوتے ہیں۔ اب ذرا خُدا کے علم و تجربے و تجزیے کی طرف متوجہ ہو۔ علم کی دنیا میں وہ کائنات کے ذرے ذرے سے باخبر ہے۔ وہ انسان کے ہر ایک جین (gene) کو بخوبی جانتا ہے۔ ڈی این اے کی کڑیوں کی ترتیب تک اس کی رسائی ہے جہاں سے انسان کی خصوصیات اُبھرتی ہیں اس پر اس کو دسترس حاصل ہے اور ازل سے ہے۔ رہی بات تجربے کی۔ تو تجربے میں پوری کائنات اس کے سامنے ہیچ ہے۔ پوری کائنات اس نے بنائی اور خود ہی چلائی اور چلا رہا ہے۔ سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے ہو تا رہا ہے جس کا علم بھی مکمل اور تجربہ بھی مکمل۔ اب ایسی ہستی اگر پیشن گوئی کریں تو کیا اس میں غلطی کی گنجائش ہو سکتی ہے؟ غلطی تو وہاں سے پُھوٹتی ہے جہاں علم و تجربے میں قلت یا نقص ہو۔ یعنی قلتِ علم و قلتِ تدّبر سے غلطی جنم لیتی ہے لیکن خدا کے ہاں تو ایسا کوئی تصور سرے سے موجود ہی نہیں، تو غلطی کہاں سے آئیگی۔ لہٰذا خدا کی پیشنگوئی حرف بہ حرف حق و سچ ہے اور یہ نہ انسان کے اختیارات میں مخل ہوتی اور نہ ہو سکتی ہے۔

سر! آپ لوگوں کا کھانا تیار ہے۔ لے آؤں، اسی دوران ویٹر نے آ کے اِطلاع کر دی۔

جی بالکل! انتظار اور بُھوک کے اس تال میل میں ایسی خُوش کُن اور مَن موہنی اطلاع پر ہم آپ کے بڑے ممنون ہیں۔

آکاش نے مسکرا کر ویٹر کو جواب دیا جس سے ویٹر کے چہرے پر بھی مسکراہٹ بکھر گئی۔

عُویم! آپ تو الحاد کے بڑے قریب سے ہو گزرے ہیں کیا آپکو نہیں لگ رہا کہ ہمارے ہاں الحاد کی ایک اہم وجہ مغرب سے مرعوبیت بھی ہے۔ معاشی لحاظ سے غیر مستحکم اور

ٹیکنالوجی کی دوڑ میں شکست خوردہ قوم بہت آسانی سے فاتح قوموں کی پیروی شروع کر دیتی ہیں اور بدقسمتی سے اس پر فخر بھی محسوس کرتی ہیں۔

کیف نے کھانے کے دوران توجہ الحاد کی طرف مبذول کرادی۔

عُویم نے سر اُٹھا کر صرف "بالکل" ہی کہا تھا کہ آکاش نے بولنا شروع کیا۔

اس کے ساتھ مولوی حضرات کی غاصبانہ اجارہ داری بھی ہے۔ ان لوگوں نے دین کو عام آدمی کی پہنچ سے دور کر دیا ہے۔ عوام الناس دین کی صحیح روح سمجھنے سے قاصر ہے۔ دین کو مشکل تر بنا دیا گیا ہے۔ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور یہ لوگ وہیں قدامت پرستی میں اٹکے ہوئے ہیں۔ بدقسمتی سے علم سے بھی یہی لوگ کوسوں دور ہیں جبکہ علم دُشمنی میں سالارانِ صفِ اول اور شمشیر بکف ہے۔ میں تو جب بھی ان کو دیکھتا یا سوچتا ہوں مجھے یورپ کی سولہویں صدی عیسوی میں ری نے ساں اور ریفارمیشن تحاریک سے پہلے کے حالات یاد آجاتے ہیں۔ وہاں کا پوپ اور آج کا مولوی ایک ہی سکے کے دورُخ ہیں۔ ترش لہجہ، فخر و غرور اور اخلاقی اقدار کا انحطاط اکثر و بیشتر ہمارے مذہبی حضرات کا خاصہ بن چکا ہے۔

عُویم میٹھی میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ بڑی سنجیدگی سے آکاش کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ آکاش کی باتوں میں اتنا گم تھا کہ ہاتھ میں لئے ہوئے نوالے سے بھی بے خبر تھا۔

بہت خوب! آکاش تو آج بڑے سنجیدہ تجزیے پر اُتر آیا ہے۔

عُویم کے اس تبصرے پر باقی تینوں دوست ہنس پڑے۔

آپ کی باتیں بالکل ٹھیک ہیں آکاش! اور میں بالکل متفق ہوں لیکن ان تمام امور میں قدامت پرستی کا ایک فائدہ ضرور ہے کہ اس نے دین میں بے جا فلسفے وانسانی اختراع کے داخلہ کیلئے بند باندھا ہے۔ اس کے برعکس آپ دوسری صدی ہجری میں پیدا ہونے والے فرقے معتزلہ کے احوال تاریخ میں دیکھ سکتے ہیں جس نے بے جا عقل پرستی اور غیر متعلقہ فلسفیانہ مباحث کو دین کے ساتھ گڈمڈ کرنے کی کوشش کی۔ اس تحریک کا طلسم عباسیہ

حکمرانوں پر بھی چل گیا تھا۔ جس کے نتیجے میں سرکاری سطح پر مظالم بھی ڈھائے گئے۔ بلکہ یہاں یہ تجزیہ کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ قدامت پرستی اور بدرجۂ اتم تقلید کی ابتداء اسی معتزلہ کے جوابی ردعمل کا نتیجہ ہے۔ تبھی تو امام احمد ابن حنبلؒ کے بعد امت میں مسلک کے اعتبار سے قابل اتباع فقیہہ نہیں اُبھرا۔ یوں اجتہاد کا دروازہ آہستہ آہستہ بند ہونے لگا۔ اِس ضمن میں مجھے بچپن میں دادا مرحوم و مغفور کی بات یاد آتی ہے کہ "بیٹا! موجودہ دور کے اِن پیچیدہ اور اَن گنت فلسفوں میں پُرانا کلمہ نہ چھوڑنا اور اُسکے ساتھ چمٹے رہنا"۔

اس پر کیف نے آنکھیں بڑی کرتے ہوئے حیرانگی کا اظہار کیا اور مُسکراہٹ کے ساتھ عُویم کو مزید گفتگو کرنے کی دعوت دی۔

خیر! اس تمام گفتگو کا مدعا یہ ہے کہ بیشک قدامت پرستی نے بے جا فلسفیانہ تصورات کو دین کا حصہ بننے سے روکے رکھا لیکن مولوی حضرات قدامت پرستی میں مخالف انتہا کو چُھو گئے۔ یعنی معتزلہ ایک کنارے پر تھے تو مولوی حضرات دوسرے کنارے پر منجمد ہو گئے۔ جبکہ قرآن سواء السبیل کی تلقین کرتا ہے اور اعتدال و توسط کی راہ دکھاتا ہے۔ لہٰذا الحاد کی لہر کا مقابلہ کرنے کیلئے مذہبی لوگوں کو اس انجماد کو توڑنا ہوگا۔ قرآن کو براہ راست عام آدمی کے ہاتھ میں دینا ہوگا تاکہ اسے براہ راست سمجھا جائے۔ اطاعت کے قلادے اُتار پھینکنے ہونگے جس میں خود کو کس دیا ہے کیونکہ پہلے الہامی مذاہب کا مقابلہ شرک سے تھا اور آج الحاد سے ہے۔ یہ مقابلہ مذہبی حضرات کو لچک کا مظاہرہ کرکے ہی لڑنا پڑے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ مذہبی علماء کو جدید تعلیم سے بھی ہم آہنگ ہونا پڑے گا۔ اگر زیادہ نہ ہو تو کم از کم جدید عصری علوم میں فلسفہ، علمِ نفسیات اور جدید سائنس پر قابلِ قدر دسترس حاصل کرنی ہوگی۔

عُویم خاموش ہوگیا۔

الحاد کے ان وجوہات میں ایک وجہ سائنس اور مذہب کا بے جا اور خود ساختہ تصادم بھی ہے۔ یہ حقیقت مجھ پر عبد الاحد صاحب کے ساتھ ملاقاتوں میں کھل گئی۔ وہاں پر مہمان سکالروں کی گفتگو اس ضمن میں بڑی معنی خیز تھی کہ مذہب اور سائنس کا آپس میں کوئی تصادم نہیں بلکہ حقیقتاً سائنس مذہب کا ساتھی ہے، اگر ہلکا سا تدبر کیا جائے۔ لیکن یہاں یہ عقدہ حل کرنا ضروری ہے کہ یہ تصادم آخر کار معاشرے میں پھیلا کیوں ہے؟ جہاں تک میں نے اس مسئلے پر عقل دوڑائی ہے تو میرے خیال میں اس تصادم کی اصل وجہ مذہب نہیں بلکہ کلچر ہے۔ کلچر کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ وہ تبدیلی کا خواہاں نہیں ہوتا۔ وہ روایت پرست اور قدامت پسند ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ ہر نئی چیز سے ڈرتا ہے اور اس سے خطرہ محسوس کرتا ہے۔ جبکہ دوسری طرف سائنس کا کام نئی ایجادات کے لیے راہ ہموار کرنا ہے۔ لہٰذا دورِ جدید میں سائنس کا یوں اچانک پل پڑنا کلچر کے لیے موزوں ثابت نہیں ہوا جس کی وجہ سے کلچر کا سائنس کی مخالفت یقینی بن گئی۔ اور یہ تو پوری دنیا پر عیاں ہے کہ مذہب کلچر کا اہم حصہ بن چکا ہے بلکہ سب سے بنیادی جز کی حیثیت اختیار کر چکا ہے لہٰذا یہ محاذ اصلاً مذہب اور سائنس دونوں کے درمیان تیار ہوا۔

کیف نے متفکرانہ تجزیہ پیش کیا۔

عُویم! مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ آپ نے الحاد کا راستہ یکسر مسترد کر دیا ہے اور مکمل طور پر خود کو ان تاریکیوں سے نکالنے کا عہد کر لیا ہے۔

فردان جو کافی وقت سے گفتگو میں محو تھا، نے براہ راست عُویم کا دوٹوک فیصلہ جاننے کیلئے سوال کیا۔

فردان کے سوال پر عُویم نے مُسکرا کر صرف "شاید" ہی کہہ دیا جس سے فردان ششدر رہو گیا کیونکہ اس جواب میں اقرار اور انکار دونوں شامل تھے۔ ہلکی سی خاموشی کے بعد عُویم دوبارہ گویا ہوا۔

مجھے بھی ایسا لگ رہا ہے کیونکہ الحاد کی عقل سے بیر ہے۔ یہ کوئی نظام نہیں بالکل اعتراضات کا ایک بے ربط مجموعہ ہے۔ موجودہ دور کا سب سے ترقی یافتہ خطہ یورپ ہے جہاں سولہویں صدی عیسوی سے عقلیت پرستی چھائی رہی۔ اس دوران انہوں نے عقل کے بل بوتے انسان کی اخلاقی اور معاشرتی اقدار وحیثیت قائم وبرقرار رکھنے کیلئے مختلف وقتوں میں مختلف نظریات پیش کئے۔ اسی کی بنیاد پر معاشرے تشکیل دیے اور ادارے بنائے جس کی زندہ مثالیں روسو کا معاہدۂ عمرانی اور اقوام متحدہ کا چارٹر ہیں۔ ان میں انسان کے ذاتی اور معاشرتی حقوق و فرائض کی ضمانتیں دی گئی۔ آج اِن معاہدوں پر پوری دنیا متفق ہے۔ لیکن یہی باتیں صدیوں پہلے اگر مذہب اس سے بہتر انداز میں پیش کریں تو اس پر اعتراض کیوں سامنے آجاتا ہے۔ انسان کو مخلوقات میں اس کی برتر حیثیت اور اسکے حقوق و فرائض جس بہتر انداز میں مذہب نے فراہم کئے ہیں آج تک کسی نے نہیں کئے۔ انسانی جان، مال و آبرو کی تحفظ اور اسکی قدر و قیمت پر جتنا زور آج سے صدیاں پہلے مذہب نے دیا ہے ماڈرن دور پر اسکی حقیقت کھلنا تو کل پرسوں کی بات ہے۔ لہٰذا کسی ایک ہی نظریے کو جدیدیت کے لبادے میں ماننا اور مذہب کے ذیل میں ٹکرانا الحادی ذہن کی توہم پرستی اور عقل دشمنی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ حقیقت سے اختلاف کی صورت میں نکلتا ہے۔

اسکے باوجود کسی برتر ہستی کو ماننے کے سوا انسان کے پاس کوئی چارہ نہیں۔ انسان انتہائی بے بس اور کمزور ہے۔ اسکو ہمیشہ رونے کیلئے مضبوط کندھے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہمیشہ دلاسے کی تلاش میں رہتا ہے۔ مدد مانگنا اسکی ضرورت ہے۔ کسی کے سامنے گڑگڑانا اور دل کا

بوجھ ہلکا کرنا اس کی سرشت میں شامل ہے۔ یہ سب کچھ کسی قادر مطلق ہستی کے سامنے اپنی ساری انا قربان کرکے اور سارے ہتھیار اسکے پاؤں میں رکھ کے حاصل کی جاسکتی ہیں۔ انسان اگر سچے دل سے تلاش کرے تو اس ہستی کا ملنا کوئی مشکل کام نہیں۔ ہر انسان کی فطرت میں حق کی تلاش کا داعیہ موجود ہے۔ اسی داعیے کو صحیح سمت میں استعمال کرکے انسان اپنے اصلی گھر آسانی سے پہنچ سکتا ہے۔

انسان ایک بہت بڑا شاہکار ہے ۔اس کے جذبات ،احساسات ، رغبات، تجسس، تخیّل، تصور، تفکر اور تلاشِ حق اسے آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیتا ہے۔ فرانس کے بڑے فلاسفر رینے ڈیکارٹ نے کہا تھا کہ "میں سوچتا ہوں اسلئے میں ہوں"۔ رینے ڈیکارٹ کے اسی مشہور مقولے کو میں آگے بڑھانے کی جُرات کرتا ہوں کہ "میں ہوں، اسلئے خدا ہے"۔

کیف جس کی فلاسفی پر بڑی گہری نظر تھی نے ڈیکارٹ کا نام سنتے ہی چوکنا ہو گیا۔ عُویم نے جب ڈیکارٹ کے مشہور مقولے میں اپنا اضافہ کیا تو کیف کے حیرانگی کی انتہا نہ رہی ۔وہ بار بار سر کو جنبش دیتا رہا۔

اتنے زیادہ احساسات، خواہشات، جذبات، رغبات جو دل میں رچی بسی ہیں ان کے لئے یہ دنیا بہت چھوٹی ہے۔ یہ بحریں کہاں اس چھوٹی اور محدود دنیا میں سموئی جاسکتی ہیں۔ ان کو ٹھکانہ دینے کیلئے کسی بڑی اور لا محدود دنیا کی ضرورت ہے اور اسکے ساتھ لازم ہے ایک قادرِ مطلق اور سخی ذات جو ان تڑپتی تمناؤں کا مداوا بنے اور اس دل کو قرار بخشے۔ تبھی تو میں جب بھی سر جھکا کر دل کے اندر جھانک کر دیکھتا ہوں اور دل کے ساتھ تھوڑی سی گفتگو کرتا ہوں تو اسے ہی پاتا ہوں۔

در موجِ صبا پنہاں ، دُزدیدہ بباغ آئی
دَر بوئے گُل آمیزی ، باغنچہ دَر آویزی

من بندۂ بے قیدم ، شاید کہ گریزم باز
این طرۂ پیچاں را ، دَرگردنم آویزی*

*ترجمہ: بادِ صبا کے دوش پر تو چھپ کر باغ میں آتا ہے اور پھولوں کی بکھری ہوئی خوشبو اور بند کلیوں میں گھل مل جاتا ہے۔ پھولوں کے حُسن اور کلیوں کی خوشبو میں تیرے ہی جلوے نمایاں ہیں—— اے خدا! میں تیرا ایسا غلام ہوں جو کسی قسم کی زنجیروں میں نہیں جکڑا ہوا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ زمانے کے اطوار مجھے تجھ سے باغی کر دیں۔ ایسے میں اپنے اس بَل کھاتے ہوئے گیسوؤں کو میری گردن کے گرد لپیٹ دے تا کہ میں کسی بھی وقت تیری غلامی سے دُور نہ جاسکوں۔

باب بیست و پنج

حُسن و محبت

آج عصر کے بعد ہم دونوں امی کے ساتھ آئیں گے آپ کو لینے۔ شاپنگ کے لیے جانا ہے، تیار رہنا۔

زنیرہ نے سروش کو پہلے سے اطلاع کر دی۔

لیکن مجھے تو کوئی شاپنگ نہیں کرنی اور بازار میں میرا دم گھُٹتا ہے، آپ کو تو پتہ ہے کہ میں ساری شاپنگ آن لائن کرتی ہوں اور وہ میں کر چکی ہوں یا امی خرید لاتی ہے۔

سروش نے قدرے بے توجہی اور جی چُراتے ہوئے جواب دیا۔

ہاں یار! اس بیچاری کی بھی کیا شاپنگ ہو گی۔ ایک ہی کلر کی ڈریس پہنتی رہتی ہے اور وہ بھی سفید۔ یہ تو ہر کوئی پسند کر سکتا ہے۔ اس کے شاپنگ میں اتنی جھنجھٹ کہاں۔

عریشہ نے سروش کی ڈریسنگ چوائس (Dressing Choice) کو طنزاً تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہا کیونکہ سروش صرف اور صرف سفید لباس پہنا کرتی تھی۔ اسے رنگین لباس پسند نہیں تھا، وہ مزاجاً سادہ پسند تھی۔

یار عریشہ! آپ پسند و ناپسند کو کس بنیاد پر تنقید کا نشانہ بناتے ہو یہ تو دلیل سے ماوراء حقیقتیں ہیں۔

سروش نے پیار کے ساتھ ہنستے ہوئے دھیمے لہجے میں سمجھاتے ہوئے جواباً کہا۔

کیا محبت بھی اسی زُمرے میں آتی ہے؟

سروش کے بیان پر عریشہ تو خاموش رہی لیکن زنیرہ جو ہمیشہ اِسی تاک میں بیٹھی رہتی تھی کہ سروش کے دل کا حال جان سکیں انہوں نے فوراً سوال داغ دیا۔ یہ سروش اور زنیرہ کے درمیان لے دے کا کوئی پہلا موقع نہیں تھا بلکہ اکثر یہی ہوتا رہا تھا لیکن سروش نے کبھی بھی واضح جواب نہیں دیا تھا بلکہ یا تو ایہام و ابہام سے کام لیا اور یا موضوع کا رخ پھیر لیا۔

بے شک! محبت پسند کا ماحصلِ مرغوب ہے۔ لیلیٰ کے بارے میں عام تاثر یہی ہے کہ وہ حسن کے عمومی معیار کے مطابق نہیں تھی لیکن اس کے باوجود وہ مجنون کی آنکھ کا تارا تھی اور مجنون کی اسی پسند نے اسے دنیا کے لیے لیلیٰ بنا دیا۔ یہ کوئی سائنس کی دنیا تھوڑی ہے کہ آپ اسے ریاضی کے قوانین سے ثابت کر دیں بلکہ یہ انسانی تسکین پر منحصر ہے۔ شاید ایک چیز میرے لیے تسکین کا سبب ہو اور وہ آپ کے لیے کوئی معنی ہی نہیں رکھتا ہو، اسی طرح کوئی چیز آپ کے لیے تسکین کا سبب ہو سکتی ہے اور میرے لیے نہیں۔ یہیں سے حسن اور تسکین میں اختلاف پھُوٹتا ہے۔ خیر وہ جو بھی ہے انسان جس راستے سے بھی اس کی طرف سفر کرے اس کا وجود ایک حقیقت ہے۔ ہر کوئی اس سفر میں تنِ تنہا بھٹک رہا ہے اور اپنے دُھن پر گھوڑے دوڑا رہا ہے۔ ابدی مسرت اس کی انتہا ہے وہاں تک پہنچنا لازم ہے ورنہ شعور کی کھڑکی بند ہونے کا خدشہ ہے انسان اسی تسکین اور اطمینان کی تلاش میں ہے اور تب تک یہ روح تڑپتی رہے گی جب تک یہ توازن (Equilibrium) کی دہلیز پر جان جانِ افریں کے سپرد نہیں کرے گا۔

محبت کے اس سفر کے دوران کچھ ایسے مقامات سے سامنا بھی پیش آتا ہے جس کو سمجھنا انسان کے لیے ناممکن ہوتا ہے۔ روح انسان کو بعض دفعہ ایسے مقام پر لے جاتی ہے جہاں عقل اور انسانی قوانین سے بالاتر ہو کر صرف محبت کی حکومت کار فرما ہوتی ہے۔ اس دوران ان رازوں کو جاننا انسان کے بس کی بات نہیں اور انسان کیوں سب کچھ سیکھنے اور جاننے

کی تمنا کرتا ہے؟ اور اس کے لیے سر کھپاتا ہے؟ محبت کی دنیا میں انسان کو عقل سمیت اپنے حدود کی پاسداری از حد ضروری ہے، ورنہ بگاڑ کا خطرہ ہے۔

اس کے بعد سروش ہلکی سی خاموش ہوگئی پھر ایک وقفے کے بعد دوبارہ آہستہ سے گویا ہوئی۔

رہی بات اس حُسن اور اس سے جُڑی محبت کی! میرے خیال میں انسانی عقل کی سرکشی کو روکنے کے لیے حُسن کا وجود ضروری تھا۔ کیونکہ حسن کے سامنے سارے دلائل ہیچ ہو جاتے ہیں۔ حُسن فاتح عالم ہے۔ اس کے سامنے عقل سرِ تسلیم خم کر جاتی ہے۔ زبان پر تالا لگ جاتا ہے۔ خاموشی سب سے بڑی طاقت و گویائی بن جاتی ہے۔ بڑے بڑے جنگجو بادشاہوں کو کنیزوں کی پاؤں میں روتے دیکھا گیا ہے۔

مصلحت سرنگوں ، خردِ خاموش
عشق کے آگے کس کی دال گلے

لٰہذا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہے کہ وہ انسان ہی نہیں جو خوبصورتی سے متاثر نہ ہو۔ صرف متاثر ہی نہیں بلکہ اس کے سامنے سر جھکانے پر مجبور نہ ہو۔ یہ خوبصورتی کسی بھی صورت میں ہو سکتی ہے۔ خوبصورت انسان بھی ہو سکتا ہے، خوبصورت لمحہ بھی، خوبصورت نظارہ بھی اور خوبصورت خیال و نظریہ بھی۔ یہ انسانی فطرت کا اٹل داعیہ ہے کہ وہ خوبصورتی کی طرف لپکے گا اور موقع ملتے ہی اس پر جان نچھاور کرے گا۔

سروش بڑے آرام سے اور آہستہ آہستہ جواب دے رہی تھی جیسا کہ کوئی اس کو بتا رہا ہو اور وہ سنا رہی ہو، اس کا خیال کہیں اور تھا۔

ایک دن میم سلمٰی کلاس میں حُسن کی مختلف تعریفیں بیان کر رہی تھی کہ ابھی تک اہل علم اس کے تعریف پر متفق نہ ہو سکے۔ افلاطون کے نزدیک ہئیت میں حسن ہے اور ہئیت ہی حسن کا سرچشمہ ہے۔ ارسطو اپنے استاد افلاطون کے استدلال کے آگے بڑھا کر مزید وضاحت

کر کے کہتا ہے کہ ہر وہ چیز خوبصورت ہے جس میں توازن، ہم آہنگی اور نظم و ضبط ہو۔ مشہور صوفی فلسفی فلاطینوس عقل کی کرشمہ سازی کو حسن کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ ولیم ہوگارتھ کسی شے میں ڈیزائن کی موجودگی کو حُسن کا نام دیتا ہے۔ کوئی لطیف کو کثیف پر اور اعلیٰ کو ادنیٰ پر حاوی ہونے کو حُسن کے زمرے میں لاتا ہے یعنی جب تصور مادہ پر، روح جسم پر، لطیف کثیف پر، اعلیٰ ادنیٰ پر اور خیر شر پر غالب ہو جائے تو اسے حسن سمجھو۔

زنیرہ نے میم سلمیٰ کی بیان کردہ تعریفات سامنے رکھ دیں جس کو باقی سہیلیوں نے بڑے غور سے سنا۔ زنیرہ کی خاموشی پر سروش نے یوں گفتگو شروع کی جیسا کہ وہ زنیرہ کی بیان کردہ تعریفوں پر حرف آخر ثبت کر رہی ہو۔

خیر! جو بھی ہو یہ تمام تعریفیں اہمِ علم کے عقل و معیار و حالات کوائف کے مطابق بالکل ٹھیک ہیں لیکن منتہائے مقصود یہی ہے کہ حُسن وہ ہے جو ہمارے دل و دماغ پر قبضہ کر دیں، ہماری توجہ اپنی جانب مبذول کرا دیں، ہمارے اندر ستائش کا احساس پیدا کر دیں اور بس۔

ایک ہلکی سی اور پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سروش خاموش ہو گئی۔ تھوڑی دیر خاموشی کے بعد دوبارہ بولنا شروع کیا اسی دوران دونوں سہیلیاں ٹکٹکی باندھے سروش پر نظریں گاڑے ہوئیں تھیں۔

مجھے بہتے پانی میں حسن نظر آتا ہے، چنبیلی کا پھول مجھے اپنی طرف کھینچتا ہے، ندی کنارے سرسبز و شاداب وادی میں اپنے وجدان اور کسی اچھے دیوان کا تنہائی میں مقابلہ کرنے میں میرے لیے جہان بھر کی مسرت ہے۔ کسی مظلوم کی مدد کرنے سے تسکین و آسودگی کا جو احساس میرے اندر سے ابھرتا ہے وہ دنیا جہان کے تخت پر بیٹھنے والوں کے پاس بھی نہیں۔ اس دوران جو غیبی تھپکی محسوس ہوتی ہے وہ مسکرا کے چھوڑ دیتی ہے ایسا لگتا ہے جیسے فرشتوں

کی محفل میں بیٹھے ہوئے کوئی خوش مزاج فرشتہ اپنی بذلہ سنجی سے آپ کو محظوظ کر رہا ہو۔ اس کے علاوہ حسن کی اور بھی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔

سروش نے اپنی گفتگو پر اچانک فل سٹاپ لگا دیا جس سے دونوں سہیلیاں چوکنا ہو گئیں ۔ گفتگو کا آخری فقرہ انہوں نے بہت آہستہ سے کہا کہ مشکل سے سنائی دیا۔

یار سروش! آپ کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ آدھی بات کہہ کر ٹال دیتے ہو یا گفتگو کا رخ پھیر دیتے ہو۔

عریشہ نے تیز نظروں سے گھورتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

یار غصہ نہ ہو ورنہ ناراض ہو جاؤں گی۔

سروش نے لاڈ جتاتے ہوئے منہ بنا کر جواب دیا۔

اس پر زنیرہ نے ایک قہقہہ لگایا اور ساتھ ہی سوال بھی داغ دیا۔

حسن پر گفتگو جاری ہے کیا علم کی دنیا میں کبھی حُسن کو یہ شرف حاصل ہوا ہے کہ وہ باقاعدہ موضوع بحث بنا ہو؟

جی بالکل! کیوں نہیں۔۔۔ معلوم اور چھپی ہوئی تاریخ سے یہ ثابت ہے کہ افلاطون سے لیکر آج تک مختلف ہائے فلاسفرز اس پر خیال آرائیاں کرتے رہے ہیں لیکن اس کو باقاعدہ ایک مستقل موضوع کا درجہ جرمن فلاسفر الیگزنڈر بام گارٹن نے اٹھارویں صدی عیسوی میں دیا جس کو جمالیات (Aesthetics) کا نام دیا گیا اور "حُسن کا تنقیدی اور فلسفیانہ جائزہ" اس کی تعریف مقرر کی گئی۔ بام گارٹن سے پہلے احساسات سے جُڑی تمام ادراکات علم وحکمت کے ابتدائی مدارج سمجھے جاتے تھے جبکہ بعض اس کو فکر و تعقل کی ناقص صورتیں بتاتے تھے۔ بام گارٹن نے تعقل اور احساس کا پہلو بہ پہلو جائزہ لیا، موازنہ کیا اور نتیجتاً دونوں کو ہم پلہ قرار دیا اور دونوں کو علم و عرفان کی صورتیں قرار دیں۔

انسان جب کسی مظہر کا مشاہدہ کرتا ہے جس کے نتیجے میں اس کے اندر جو احساسات و جذبات ابھرتے ہیں وہ حُسن کے زمرے میں شمار کیے جاتے ہیں لیکن یہی مظہر جب انسان کے تعقل سے گُزرتا ہے تو اس کو حقیقت کہا جاتا ہے یعنی حسن اور حقیقت بالترتیب احساس اور تعقل کے ثمرات ہیں۔ اول الذکر کے ترتیب و آہنگ سے فنونِ لطیفہ کا تحفہ انسان کو ملتا ہے جب کہ ثانی الذکر کے ترتیب و آہنگ سے حکمت و فلسفہ وجود میں آتا ہے۔ دوسری طرف ایمانوئیل کانٹ اس سے اختلاف کرتا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ حسن کا تنقیدی مطالعہ عقلی اصول و ضوابط کو بروئے کار لاتے ہوئے ممکن ہی نہیں اور حسن و ذوق کی فلسفیانہ توضیح ہو ہی نہیں سکتی۔ اسی وجہ سے جمالیات کو سائنس کے درجہ پر فائز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا استدلال یہ تھا کہ جمالیاتی تجربہ بنیادی طور پر حسی اور ذوقی واردات ہیں، عقلی نہیں۔ چنانچہ کانٹ نے فیصلہ کن انداز میں کہہ دیا کہ جمالیات کو فلسفے کی شاخ قرار دینا درست نہیں۔ اس احساس و تعقل کی رسہ کشی میں مجھے مولانا روم کا ایک شعر یاد آتا ہے جس میں اصلاً تقابل عقل اور عشق کا کیا گیا ہے۔ عشق حسن ہی کا استنتاج ہے کیونکہ حُسن ماخذ ہے محبت کا اور محبت کی اعلیٰ منزل عشق ہے۔ ویسے تو میں مولانا روم کا شعر پیش کر رہی ہوں لیکن ہمارا پورا مشرقی ادب تقریباً اسی رنگ میں رنگا ہوا ہے اور اسی ایک لڑی میں پرویا ہوا ہے۔

عقل گوید شش جہت حدست و بیرون راہ نیست
عشق گوید راہ است و رفتہ ام من بارھا*

اس شعر پر زنیرہ عَش عَش کر اُٹھی جس سے سروش کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

---

* ترجمہ: عقل کہتی ہے کہ چھ اطراف ہیں۔ (دائیں، بائیں، آگے، پیچھے، اوپر، نیچے) اور اس سے باہر کوئی راستہ نہیں ہے ـــــ عشق کہتا ہے کہ راستہ موجود ہے اور میں کئی بار جا بھی چکا ہوں۔

انت میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کانٹ کے مطابق خواہ جمالیات فلسفے کی شاخ نہ ہو لیکن یہ قطعی طور پر ادبیات اور فلسفے کے درمیان پُل کا کام ضرور سرانجام دیتی ہے۔

سروش نے اختتامی الفاظ بیان کر دیئے۔

آج کی شاپنگ میں سروش کے ساتھ اظہار یکجہتی کے طور پر ایک سفید سوٹ ضرور لوں گی کیونکہ اس نے اتنی زیادہ علمی باتیں بتائیں۔زنیرہ نے اعلانیہ انداز میں کہا جس پر تینوں سہیلیاں ہنس پڑیں۔

بابِ بیست و شش

سرِ تسلیم خم و دُعا

آدھی رات تھی عُویم اپنے کمرے میں اپنے رب کے سامنے سر بسجود تھا اور اپنے رب سے راز و نیاز کی باتیں کر رہا تھا۔

اے میرے اللہ! میں تیرا بندہ ہوں، تیرے بندے کا بیٹا ہوں اور تیری بندی کا بیٹا ہوں، میری پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے، میرے بارے میں تیرا حکم جاری ہے اور میرے بارے میں تیرا فیصلہ عدل والا ہے۔ میں تجھ سے تیرے ہر اس خاص نام کے ساتھ سوال کرتا ہوں جو تو نے خود اپنا نام رکھا ہے یا اسے اپنی کتاب میں نازل کیا ہے یا اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھلایا ہے یا علم الغیب میں اسے اپنے پاس رکھنے کو ترجیح دی ہے کہ تو قرآن کو میرے دل کی بہار اور میرے سینے کا نُور اور میرے غم کو دُور کرنے والا اور میرے فکر کو لے جانے والا بنا دے۔

اے میرے مہربان رب! آپ نے مجھے تاریکیوں میں بھٹکنے نہ دیا۔ یہ تیرا ہی احسان ہے کہ میں آج آپ کے سامنے سر بسجود ہوں۔ میں تو آپ ہی کی تلاش میں بوریا بستر باندھ کے نکلا تھا۔ مجھے آپ مل گئے ہیں میری تلاش مکمل ہو گئی ہے۔ اب مجھے کسی اور کے حوالے نہ کر دینا۔

اے شہنشاہوں کے شہنشاہ! میں کم علمی و کم فہمی سے آپ کی ذات کے بارے میں تردد میں پڑ گیا تھا۔ آپ سے زیادہ بہتر کون مجھے جانے گا۔ آپ کو پتہ ہے کہ یہ ناچیز کوئی ضد پر

نہیں اُڑ گیا تھا بلکہ اس سے تو میری روح کانپ اٹھتی ہے۔ اس دوران جو بھی غلط فہمیاں مجھے لاحق تھیں، وہ صرف اور صرف نادان شکوے تھے اور کچھ نہیں۔ ان نادان شکوؤں سے آپ ہی درگزر فرمانے والے ہیں، آپ ہی درگزر فرمادیں۔

اے عرش و فرش کے مالک! یہ عاجز انسان آپ کی دربار میں صُلح کے لیے آیا ہے۔ میرے پاس جرگے میں اپنے ساتھ لانے کے لیے آنسوؤں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ میری تیری جناب میں فریاد لے کر آیا ہوں، اپنے وسائل و طاقت کی کمی کا۔ خالی ہاتھ لوٹانا تو آپ کے شایانِ شان نہیں۔ آپ کے در کے سوا کوئی اور دَر نہیں جہاں جاؤں اور فریاد کروں۔ میں اپنے دُکھڑے آپ ہی کی دہلیز پر رکھنے آیا ہوں۔

اے ربِّ کائنات! تجھے تیری جاہ و جلال کا واسطہ، تجھے تیرے اچھے ناموں کا واسطہ، تجھے تیرے قوتِ تخلیق کا واسطہ، تجھے تیرے علم کا واسطہ، ان کمزور ہاتھوں کو مایوس نہ لوٹا۔ آپ کے دربار سے کوئی خالی ہاتھ جائے یہ آپ کو زیب نہیں دیتا۔ تیرا رحم تو ہر ایک چیز پر حاوی ہے مجھے اس رحم کی درخواست ہے۔ تیرا دستِ کرم ہمیشہ دینے پر آمادہ ہوتا ہے میں اس سخاوت کی طلب لے کر آیا ہوں۔ مجھے بس آپ کی آغوش میں جینا بھی ہے اور مرنا بھی ہے اور کچھ نہیں چاہیئے۔

اس دوران وہ اچانک خاموش ہو گیا لیکن غیر ارادی طور پر آنسُو آنکھوں سے نکل رہے تھے کافی عرصہ خاموش رہا پھر یک لخت جسم کو ایک جھٹکا سا لگا جیسے کوئی اچانک نیند سے بیدار ہو گیا ہو اس نے آنسو پونچھ لئے اور دوبارہ شروع ہو گیا۔ پہلے تو صرف ہونٹ ہل رہے تھے لیکن آواز خاموش تھی پھر آواز بھی آنی شروع ہو گئی۔

آپ ہی نے دینا ہے مجھے۔ آپ ہی دوگے مجھے۔ کہیں اور نہیں جانا مجھے۔ اسی ہی دَر پر رہوں گا۔ کوئی بھی مجھے اس در سے نہیں نکال سکتا۔ یہی میرے مالک کا گھر ہے کسی غیر کا

نہیں ہے۔ مجھے یہاں پر ضد کرنے، ناز کرنے اور مانگنے میں کوئی جھجھک نہیں ہے۔ میں یہاں سے اپنی معافی حاصل کر کے ہی رہوں گا۔ میں اپنی استدعا حاصل کیے بغیر اٹھنے والا نہیں۔

اُس کے لہجے میں لاڈ اور فخر کا حسین امتزاج شامل تھا۔ وہ ایسے باتیں کر رہا تھا جیسا کہ اپنا حق جتا رہا ہو۔ اور وہ اپنے سامنے دیکھ رہا ہو کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے وہ بالکل سامنے ہی پڑا ہے اور اسے حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہیں۔

اے دل و دماغ کے راز جاننے والے آقا! آپ سے بہتر مجھے کوئی نہیں جانتا۔ تھکا ہارا آپ کے دَر پر آیا ہُوں۔ آپ آقا، میں غلام۔ میں اپنی انا، اپنا دل و دماغ، اپنی عزت اور اپنا سارا ہتھیار آپ کے سپُرد کرنے آیا ہوں۔ اس کے بعد مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔

اس کے ساتھ ساتھ وہ پھُوٹ پھُوٹ کے رونے لگا اور یکدم زمین پر گر گیا۔

باب بیست و ہفت

وصالِ خویش کہ وصالِ اُو

اے بوی آشنایی ، دانستم از کجایی
پیغام وصل جاناں ، پیوندِ روح دارد*

ویسے سروش! بڑی حیرانگی کی بات ہے کہ آج آپ کا دل لگا اور ہمارے ساتھ یونیورسٹی ون ڈے ٹرپ(One Day Trip) پہ نکل گئی وگرنہ آپ نے تو خود کو قید کر رکھا ہے اور کہیں جانے کا دل ہی نہیں کرتا۔

عریشہ نے مسکراتے ہوئے سروش کے کندھے سے کندھا مارتے ہوئے کہا۔

سروش نے ہلکی سی تبسم کے ساتھ اثبات میں جواب دیا۔

عریشہ کے لہجے میں التفات اور تجسّس کی آمیزش تھی۔

پورا کلاس یونیورسٹی انتظامیہ کے زیر نگرانی ٹیچنگ سٹاف کے ہمراہ دریا کنارے تفریح کی غرض سے نکلا تھا۔ چونکہ یہ ایک مطالعاتی دورہ تھا اس لیے کلاس کے لیے ایک ویزٹینگ سکالر(Visiting Scholar) کا بندوبست کیا گیا تھا تاکہ وہ سٹوڈنٹس کو لیکچر دیں، سوال و جواب کا سیشن بھی کرائیں اور آخر میں مکالمہ بھی ہو جائیں۔ علمی نشست گزرنے کے بعد اہلِ خدمت کھانے کی تیاری میں لگ گئے اور طلباء و طالبات سیر سپاٹے کے لیے ٹولیوں کی شکل میں چہل قدمی کرتے ہوئے نکل گئے۔ سروش پہلی دفعہ اس قسم کے دورے سے محظوظ ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے اگر کہیں ٹور(Tour) کا موقع آجاتا تو وہ کوئی نہ کوئی بہانہ بنا لیتی تھی یا سیدھا سادہ دل باختگی کا کہہ دیتی تھی۔

---

* ترجمہ: اے میرے محبوب کی خوشبو! مجھے پتہ ہے کہ تو کہاں سے آئی ہے کیونکہ جانان کے وصل کا پیغام روح سے جوڑ رکھتا ہے۔

یار! مجھے مردم بیزاری نے آگھیرا ہے۔ تنہائی اور خلوت میرا اوڑھنا بچھونا بنتا جارہا ہے۔ لوگوں سے مجھے ڈر محسوس ہونے لگا ہے۔ ایک عجیب قسم کے خوف نے میرے اندر بسیرا کر رکھا ہے۔ ملاقاتوں میں باہمی خفگان کا خطرہ ہمیشہ سَر پر منڈلاتا رہتا ہے۔ یہی فکر کھائے جارہی ہوتی ہے کہ کہیں کوئی خفا نہ ہو جائے یا کوئی خفا نہ کر جائے۔۔۔۔۔ کیا میرا دل نہیں کرتا کہ میں بھی آپ لوگوں کی طرح اپنے حدود میں زندگی انجوائے کروں۔ لیکن کیا کروں اپنے اس مزاج کا۔

سروش نے مختصراً اپنی کیفیات بیان کیں اور عریشہ کی حیرانگی پر تبصرہ کیا۔

میں نے سنا ہے کہ جب عشق کامل ہونے لگتا ہے تو ڈر کا پیدا ہونا ایک یقینی امر بن جاتا ہے جس کا لازمی نتیجہ انتہائی خوش اخلاقی، خاموشی اور تنہائی کی صورت میں نکلتا ہے۔

زنیرہ نے لاپرواہی کے ساتھ سروش کے دل کو کُریدنے کی کوشش کی جس نے سروش کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ اس کا دل بیٹھ گیا لیکن اس ثابت قدم و محکم لڑکی نے راز نہ بتانے کی ٹھانی تھی اور اس راز کو چھپانے کے لیے پوری زندگی دکھاوے و اداکاری میں گزار دی تھی تو زنیرہ کو کیا خاک بتاتی۔ لہٰذا فی الحال اس نے خاموشی کا سہارا لیا اور اپنی خیالی دنیا میں ایک بڑی سکرین پر اپنی زندگی ریوائنڈ (Rewind) کرکے پلے (Play) کر گئی۔ آہ بھری سانسوں اور ضبط شدہ سسکیوں کو ساتھ لیے اپنی زندگی کی فلم دیکھ رہی تھی کہ عریشہ نے اسے بیدار کر دیا۔

ہاں جی! کہاں گم ہو؟

یہ تو زُنیرہ کا خیال ہے۔ مجھے کیا پتہ، ایسا ہے کہ نہیں۔

سروش نے پہلوُ تہی کرتے ہوئے گفتگو کا یکدم خاتمہ کر دیا۔ کچھ وقت کے لیے خاموشی چھا گئی اور تینوں سہیلیاں موسم و ماحول سے محظوظ ہوتی رہیں۔ اس دوران راستے میں میم

سلمیٰ بھی اپنے گروپ کے ساتھ نمودار ہوئی۔ تینوں سہیلیوں نے دُور سے اسے سلام کیا لیکن خاموشی مٹائے نہیں مٹ رہی تھی۔

منہ سے کچھ پھوٹو تو سہی، آتو گئے اب ہنسی مذاق و خوش گپیاں تو ہونے دو۔

زنیرہ نے شکایتاً ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں پیار بھری تلخی و اپنائیت شامل تھی۔ جس کا دونوں سہیلیوں نے مسکراتے ہوئے شانے دبا کر اعترافاً کہا۔

حکم کیجئے سرکار! ہم آپ ہی کے لیے تو ہیں۔

سہیلیوں کے درمیان پھر سے خُوش گفتاری و چُہل بازی شروع ہو گئی اور مسکراہٹیں بکھیرنے لگ گئیں۔ لیکن سروش صرف دکھاوے اور سہیلیوں کے دل رکھنے کے لیے پھیکی سی ہنسی سے جان چھڑاتی۔ بے شک اس کا مادی جسم سہیلیوں کے ساتھ تھا، بلکہ ساتھ تھا کیا— لایا گیا تھا، کھینچا گیا تھا جبکہ دماغ و روح کہیں اور بھٹک رہے تھے جیسے اسی پر کسی آسیب کا چڑھاوا ہو اور اس بات کا بخوبی اندازہ عریشہ کو ہو رہا تھا۔

سروش کیا بات ہے، کہاں گم ہو یار!

عریش نے آخر کار پوچھ ہی لیا۔

تم آج کچھ بھی نہ پوچھو کہ دل اُداس بہت ہے۔

سروش نے بوجھل لہجے میں جواب دیا جس میں بے پناہ اداسی اور اشک فشانی گھلی ہوئی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اکیلے کمرے میں بیٹھی خود سے محو گفتگو ہے۔ وہ اپنی دنیا میں گم اور باقی دنیا سے بے خبر تھی لیکن جیسے ہی اسے احساس ہوا کہ اس کے ارد گرد سہیلیاں ہیں اس نے خود کو سنبھالا اور تجاہل عارفانہ کا ڈھونگ رچاتے ہوئے اپنے کپڑے ہلکے سے جھاڑنے شروع کیے اور گویا ہوئی۔

نہیں نہیں۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں عریشہ۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بس ماحول اور موسم سے محظوظ ہو رہی تھی۔ میرے خیال میں یہی ماحول اور موسم ہوتا ہے جب انسان

کو موقع ملتا ہے کہ وہ خود سے باتیں کرے، خود کو وقت دے، خود کو کھوجے، خود کو دریافت کرے۔ کیونکہ انسان کا اپنے آپ پر بھی حق ہے اور یہ حق مناسب وقت دے کر ہی ادا کیا جا سکتا ہے۔ جب مجھ سے میرا خود بیگانہ ہو تو میں کسی اور کی کیا ہو سکتی ہوں۔

سروش مسکراتے ہوئے خاموش ہو گئی۔

آخری فقرے میں اس نے ابہام کے پہاڑ کھڑے کر دیے۔

لیکن اس وقت آپ پر سارا حق ہمارا ہے۔ آپ ہمارے ساتھ آئی ہیں اس لیے صرف ہمیں ہی وقت دیں۔

زُنیرہ نے فوراً ہی جواب دیا۔

مجھے ابھی تک یہ سمجھ نہیں آئی کہ میں یہاں کیسے آئی، کیوں آئی، کون لے آیا مجھے۔ کیوں میرا دل لگا یہاں آنے میں۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی مجھے اُڑا کر لے آیا ہو اور بار بار تاکید کر رہا ہو کہ اپنی متاعِ گمشدہ کی تلاش میں سر کھپاؤ۔

یہ گفتگو جاری تھی کہ تینوں سہیلیوں کو قریب کی جھاڑیوں سے کسی کے سسکنے اور ہچکیوں کی دھیمی سی آواز سنائی دی۔ آواز سنتے ہی تینوں سہیلیاں سہم گئیں۔ ان کے پاؤں خود بخود رک گئے۔ وہ ایک دوسرے کو تکنے لگیں۔ زنیرہ نے آہستہ سے کہا کہ چلو چلتے ہیں اور میم کو بلاتے ہیں۔ عریشہ تذبذب کا شکار تھی کہ کیا کیا جائے کیونکہ اُس فریاد میں انتہائی درد تھا۔ سروش نے کچھ بولے بغیر جھاڑیوں کی طرف آگے بڑھنا شروع کیا بلکہ اس کے پیر خود بخود چلنے شروع ہوئے۔ باقی سہیلیاں بھی ڈرتے ڈرتے پیچھے روانہ ہو گئیں۔ جیسے ہی جھاڑی کے دوسری طرف دیکھا۔ ایک نوجوان پڑا اپنی زندگی کے آخری سانسیں گن رہا تھا۔ سروش جو سہیلیوں میں آگے تھی، گھوم کے جیسے ہی اس کی نظر نوجوان کے چہرے پر پڑی۔ اس کے منہ سے بے ساختہ ایک کراہتی ہوئی چیخ نکل گئی۔

عُووووییم م م م۔۔۔۔۔۔

اور فوراً گر کر عویم کے چہرے سے لپٹ گئی اور اسے اپنی گود میں لے لیا۔ سروش کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا جو عرصۂ دراز سے اسی ہی دن کے لیے رُکا ہوا تھا، جاری ہو گیا اور عویم کے چہرے کو سیراب کرنے لگا۔ وہ یک بہ یک گونگی ہو گئی۔ اس کے منہ سے کچھ نہیں نکل رہا تھا۔ باقی سہیلیاں بھی کچھ وقت کے لیے ششدر رہ گئیں لیکن پھر وہ بھی آگے بڑھ گئیں تا کہ جان بلب نوجوان کی مدد کی جائے۔ زنیرہ نے صدائیں بلند کر کے باقی لوگوں کو مدد کے لیے بلایا تا کہ نوجوان کو ہسپتال لے جایا جا سکے۔ عویم کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا اور الفاظ اس کے حلق سے آگے نہیں آ رہے تھے۔ سروش اس کے چہرے اور ماتھے پر ہاتھ مَل رہی تھی اور اسے بولنے پر آمادہ کر رہی تھی لیکن لفظ "عویم" کے سوا خود اس کے منہ سے بھی کچھ نہیں نکل رہا تھا۔ دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے پر ٹِک گئیں تھیں۔ دونوں طرف سے آنسو اپنی داستان رقم کر رہی تھی جو کہ گویائی کا واحد ذریعہ تھا۔ عویم نے ہاتھ میں پین اور کاغذ کا ایک ٹکڑا پکڑے رکھا تھا اور مٹھی سختی سے بند کی تھی۔ اچانک عویم نے اسی ہاتھ کو دھیرے سے اٹھا کر سروش کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ لیکن جیسے ہی سروش کی نظر عویم کے ہاتھ اور اس میں پین و کاغذ پر پڑی عویم نے جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔ سروش کو اس عظیم حادثے کا بروقت احساس ہو گیا لیکن وہ ہیبت کے مارے خاموش رہی۔ اس کا حلق خشک ہو گیا تھا۔ کلیجہ پھٹ گیا تھا۔ صرف آنسوؤں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے سروش کو آج کے واقعے کی کسی نے پہلے سے خبر دی ہو اور وہ اس کے لیے پہلے سے ذہنی طور پر تیار ہو اور وہ مستقبل کے لیے لکھی ہوئی سکرپٹ کی عملی تعمیر کر رہی ہو۔ اس دوران ان چند منٹوں میں دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اپنی زندگیوں کا خلاصہ بیان کیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں ٹرپ پہ آئے ہوئے تمام لوگ جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔ یونیورسٹی بس کے ذریعے عویم کو اٹھا کر ہسپتال لے جایا گیا۔ سروش بھی ساتھ چلی گئی جس کا ساتھ عریشہ اور زنیرہ نے بھی

ہو لیا۔ سروش کو پتہ تھا کہ اس کے جسم میں دم نہیں ہے لیکن وہ کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھی اور چلتی بنی۔ عویم کو اپریشن تھیٹر لے جایا گیا۔

اپریشن تھیٹر کے دروازے کے ساتھ فرش پر بیٹھی سروش درد وحسرت کی تصویر بنی بیٹھی تھی کہ اچانک اپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا۔ سب ڈاکٹر صاحب کی طرف لپک گئے لیکن دروازے کے قریب ترین بیٹھی ہوئی معصوم اور پیاری سروش پر کوئی اثر نہیں ہوا اور نہ ہی اس نے ڈاکٹر صاحب کی طرف کوئی توجہ کی۔ڈاکٹر صاحب نے لٹکائے ہوئے چہرے کے ساتھ دھیرے سے بولا۔

"I am sorry, he is no more"

(معذرت کے ساتھ، وہ زندہ نہیں رہے)

ڈاکٹر صاحب کے یہ الفاظ یونیورسٹی سٹاف پر کوہِ گراں کی طرح گرے۔ کہیں آنسو ٹپکے تو کہیں آہ وفغاں ہوا، کہیں افسوس ہوا تو کہیں آہیں اُٹھیں۔ تھوڑی دیر بعد سٹاف ادھر اُدھر انتظامات کی غرض سے تِتر بِتر ہو گئیں لیکن وہ جو بیٹھی تھی وہ وہیں کی وہیں بیٹھی رہی۔

میم سلمیٰ نے کہا۔ شاید سروش نے یہ حادثہ سب سے پہلے اور زیادہ قریب سے دیکھا ہے اس لئے اسے زیادہ دکھ پہنچا ہے اور اسی پر زیادہ اثر ہوا ہے۔ عریشہ نے سر کو جنبش دے کر میم سلمیٰ کی بات کا اثبات میں جواب دیا۔

اس دوران اپریشن تھیٹر سے ایک چاچا جان کچھ سامان ہاتھ میں لیے باہر آ گیا اور آتے ہی سروش کے ساتھ بیٹھ گیا۔ زنیرہ اور عریشہ بھی سروش کے پہلو میں موجود تھیں۔ چچا جان کو یوں لگا جیسا کہ سروش ہی عویم کی وارث ہے اور حقیقت بھی یہی تھی۔ اب انسانوں میں سے کسی کو خبر ہو یا نہ ہو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس لئے چاچا جان نے سروش کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اسے دلاسا دیا۔ اس کے آنسو پونچھے اور عویم کا سارا سامان اس کے سپرد کر

دیا۔ سامان میں ایک موبائل فون، والٹ، تسبیح، گھڑی اور وہی پین و کاغذ جو عویم کی مٹھی میں بند تھی، شامل تھا۔

دوسری طرف عویم کے خاندان والے ہسپتال پہنچ گئے۔ اس کی ماں فوراً اپریشن تھیٹر داخل ہو گئی۔ آہ و فغاں اور درد و حسرت کا جو منظر اس وقت آسمان نے دیکھا، الفاظ اس کی عکاسی نہیں کرسکتے ۔ جب حالات تھم گئے اور کسی حد تک قرارآ گیا۔ قرار کیا آنا تھا حقیقتاً درد و حُزن کی انتہا سے جب آنسو خشک ہو گئے تو سروش اور عویم کی ماں اتنے بڑے ہجوم میں ایک دوسرے کی طرف ایسے آگے بڑھے جیسے کہ برسوں کی پہچان ہو اور ایک دوسرے کو جانتے ہو۔ قریب آتے ہی دونوں بغل گیر ہوئیں اور خوب پھوٹ پھوٹ کر روئیں۔ جب آنسو ختم ہو گئے تو سروش نے عویم کا سارا سامان ماں جی کے سپرد کر دیا سوائے اس پین اور کاغذ کے۔

ماں! اجازت کے ساتھ یہ میرا ہے اور یہ میرے لیے ہی ہے۔ یہ میرے پاس نشانی ہے۔

سروش نے روتے روتے پین اور کاغذ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

بالکل آپ کا ہے بیٹا! لیکن ایک شرط پر۔ صرف یہ بتاؤ کہ اس کاغذ پر عویم بیٹے نے کیا درج کیا ہے جس کی حفاظت کے لیے اس نے مٹھی اتنی سخت بند کی تھی۔ مجھے یہ تحریر سناؤ۔

ماں نے جواب دیا۔

سروش جو دل ہی دل میں ڈر رہی تھی کہ پتہ نہیں تقدیر کیا فیصلہ سنائے گی، نے دھیرے دھیرے کاغذ کھولی۔ کاغذ کے ایک صفحے پر ایک غزل درج تھی جو شاید عویم نے پہلے لکھی تھی کیونکہ لکھائی صاف ستھری اور دوسرے پین کی تھی سروش نے غزل پڑھنی شروع کی۔

عقل سے جو ماورا تھی ، دل کی تھی جو جستجو
ہاتھ میرے لگ گیا ، ذات تیری ہو بہو

تیری دانست کے بغیر ، زیست مثلِ برگ ریز
آگئی ابر و بہار ، آپ جب سے رُو بُرو

ڈھونڈتا رہتا گیا ، مطلقیّت و یقین
فلسفوں میں تِشنگی ، پر قرآن نے کی رفو

تیرے دَر پہ آنے سے ، زندگی اِرم اِرم
اِس سکوں کے نذرانے ، بیچ ڈالی ہے لہُو

ہوتی رہتی ہے مُجھ کو ، چوری چُپکے سرگوشی
اَن گِنت رموز لیکر ، ہے سروش کی خوشبُو

آپ میری ابتداء ، آپ میری انتہا
آپ ہی مقصود ہیں ، آپ میری آرزو

مَن مُرید فارسی* ، بَر تلاشِ حق عُویم
دَر اُپاسِ عقل و دل ، خاک چھانی کُو بکُو

* حضرت سلمان فارسیؓ

سروش سسکیوں کے ساتھ ہچکتے ہوئے غزل سنا رہی تھی جب کہ ماں جی اپنے آنسوؤں سے اپنے جگر گوشے کے کلام کو داد دے رہی تھی۔ جب غزل ختم ہوئی تو سروش نے کاغذ پلٹ کر دیکھا تو اس حیرانگی کی کوئی انتہا نہ رہی اور یکدم خاموش ہو گئی۔

بولیں بیٹا! دوسری طرف کیا لکھا ہے۔

ماں نے دھیرے سے کہا۔

سروش جس کے آنسو کاغذ پر ٹپک رہے تھے وہ سن ہو گئی تھی اور منہ سے صرف "عُویم ، عُویم" کا لفظ نکل رہا تھا۔ ماں نے کاغذ لیا۔ وہاں گھسی پٹی اور ٹیڑھی ترچھی لکھائی میں صرف دو فقرے درج تھے جو کہ عویم نے دورانِ نزع تحریر کئے تھے اور ان پر عویم کے آنسوؤں کے نشانات بھی موجود تھے۔

ماں! اپنے لخت جگر کو سنبھال لے۔

سروش! اب تو آجا----

سروش کے نام پر عُویم کا آنسو ٹپکا تھا جس سے نام دُھندلا گیا تھا اور یوں دُھندلا عشق ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دُھندلا ہو گیا تھا اور اَمر ہو گیا تھا۔ خدا کے سوا کوئی راز داں نہ مل سکا تھا۔ ایسے نہ دیکھنے والے اور نہ سمجھنے والے دُھندلے عشق کا انجام یہی ہوتا ہے۔

تحریر کے اختتام پر دونوں کے درمیان گریہ وزاری کا ایک اور دَور چلا۔ اس دوران ماں کا خیال بدلتے ہی سروش نے اس کے ہاتھ سے کاغذ لیا اور خاموشی سے رفوچکر ہو گئی اور نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

لیکن آپ نے بتایا کیوں نہیں۔

عُویم نے تھوڑی سی تیز آواز میں بیزاری سے کہا۔

سروش منہ لٹکائے بیٹھی تھی اور عویم اس کو منانے کی کوشش کر رہا تھا اور تسلّیاں دے رہا تھا۔

اب میں کیسے بتاتی۔ آپ کو خود احساس کیوں نہیں ہوا۔

سروش کے لہجے میں غصہ شامل تھا۔

اس احساس نے تو آج مجھے یہاں تک پہنچا دیا ہے۔

عویم نے سروش کے گھٹنے سے سر اٹھاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

وہ اٹھ کے بیٹھ گیا اور سروش جو منہ لٹکائے پہلو میں دیکھ رہی تھی اس کا چہرہ اپنی طرف کر کے گویا ہوا۔

میں پوری زندگی آپ کی محبت میں بھٹکتا رہا۔ بس آپ کا نام و پتہ نہیں جانتا تھا۔ جب آخیر میں جان گیا سو آپ کو کھینچ کے لے لایا۔ اب زندگی آپ کی گود میں گزارنا نصیب نہ ہوئی لیکن کم از کم زندگی آپ ہی کی گود میں نچھاور تو ضرور کر گیا۔ زندگی نہ سہی موت تو آپ ہی کی گود میں ڈال کے دی۔

"نہیں عویم نہیں" یہ کہتے ہوئے سروش حواس باختہ ہو کے نیند سے اٹھی۔ اٹھتے ہی ہاتھ مار رہی تھی جیسا کہ عُویم کو پکڑنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کی سانسیں پھول رہی تھیں اور پسینے سے شرابور تھی۔ اوسان سنبھلتے ہی فوراً بستر سے اٹھی اور الماری سے وہی کاغذ و پین نکال لیا اور بوسہ دے کر سینے سے لگا لیا۔

----ختم شد----

یادداشت